زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

# چہارسو

راولپنڈی

زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

# چہارسو

راولپنڈی

زندگی کے ساتھ ساتھ

# چہار سُو

جلد ۷ شمارہ نومبر، دسمبر ۲۰۰۸ء

مجلسِ مشاورت
قارئینِ چہار سُو

زرِ سالانہ
دلِ مضطرب کی نگہبانی

چہار سُو کا زیرِ نظر شمارہ !
عالمی مالیاتی طوفان کی زد میں
روٹی، روزگار کیلئے اور حج جیسے
محروم ہوتی خلقِ خدا
سے منسوب ہے!!!

بانی مدیرِ اعلیٰ
## سید ضمیر جعفری

مدیرِ مسؤل
## گلزار جاوید

مدیرِ معاون
## بینا جاوید

رابطہ: 537، ویسٹریج-III، راولپنڈی۔ فون: 92-51-5462495 فیکس: 5467235 ای میل: waqars_oma@yahoo.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، ٹرنک بازار، راولپنڈی

# متاعِ چہار سو


سرورق، پس ورق ــــــ شعیب حیدر زبیری

کمپوزنگ ــــــ حافظ انعام الحق

قرطاسِ اعزاز ــــــ ہاشمی، آنند، سدید 3

حرفِ روشن کا امین ــــــ نیتا پال 4

سردارِ ہر کارہ ــــــ بلراج کومل 6

براہِ راست ــــــ گلزار جاوید 9

چھوٹی خوشی بڑا آدمی ــــــ فکر تونسوی 15

متحرک لمحے کی مثال ــــــ ڈاکٹر وزیر آغا 18

بلراج کومل کے افسانے ــــــ شمس الرحمٰن فاروقی 22

امروز میں لپٹے ہوئے کچھ چہرے ــــــ شمیم حنفی 25

ادب کی تلاش ــــــ ڈاکٹر خلیق انجم 31

نقش گریزاں ــــــ قاری شاہ 32

لمحۂ برگ کا تخلیقی لمحہ ــــــ بلراج کومل 40

کنویں ــــــ بلراج کومل 42

**زہے عز و شرف**

محمود شام، عبدالعزیز خالد 46

**افسانے**

شکاری پرندے ــــــ حمیدہ معین رضوی 47

مکھیاں اور چوہے ــــــ شمشاد احمد 59

جشنِ زندگی ــــــ فیروز عالم 61

دوسری سوچ ــــــ آنند لہر 64

**گل و گلزارِ کوئے بادیہ** 65

محمود الحسن، منظور حسین یاد، محمود شام، شمیم شکیل، عبدالعزیز خالد، نقاش کاظمی، مامون ایمن، مناظر عاشق، خالد حمید، انوار فیروز، ولی عالم شاہین، خیال آفاقی،

غلام مرتضیٰ راہی، ضیا شبنمی، محبوب ظفر، شگفتہ نازلی، حمیر نوری، حنیف نجمی، جواز جعفری، صفوت علی۔

**افسانے**

بوڑھی گنگا ــــــ طاہرہ اقبال 75

بے باق ــــــ یٰسین احمد 81

بادۂ سنگ ــــــ دیپک کنول 83

یوسف بے کارواں ــــــ گلزار جاوید 88

**اجالوں سے مکالمہ** 91

ملک زادہ جاوید، صابر عظیم آبادی، شباب للت، رب نواز مائل، خالد علیم، نوید سروش، عاشق داوری، طالب انصاری، جاوید شیخ، حمیرا راحت، تصور اقبال، عرش صہبائی

**آئینۂ فن**

غزل فہمی کی پہچان ــــــ ڈاکٹر سید تقی عابدی 95

جمیل الدین عالی کی کالم نگاری ــــــ ثمین راحت چغتائی 101

**اے شہرِ صبا** 104

شمیم روحانی، ستیہ پال آنند، شہریار، یونس صابر، نقاش کاظمی، سرور انبالوی، کمل کشت، ثمین راحت چغتائی، حامد لطیف، پرویز مظفر، کاوش پرتاپ گڑھی، کرامت بخاری، سیما پیروز، پرتاپ چاند، فیصل عظیم، حمیر نوری، بہرام طارق، شگفتہ نازلی،

**تخلیقِ عصر**

نازہ تصانیف کا تعارف ــــــ عطیہ سکندر علی 114

**رمز رابطے:**

جستجو، ترتیب و تدوین ــــــ وقار جاوید 118


☆

بلراج کومل کا فن، اس وسیع کائنات کے سفر کی روداد ہے جس میں زندگی اور عصری احساس کی متحرک تصویریں اور وہ سب کچھ موجود ہے جو ہماری زندگی اور ہماری کائنات میں موجود ہے اور وہ سب کچھ موجود ہے جو کہیں ہے یا گفتہ، ناقابلِ بیان ہے۔ کومل کی نظمیں خود جذبات کے شاعروں کی طرح دل میں اُتر جانے والا تراشیدہ لہجہ نہیں رکھتیں، نہ ہمدردی طلب کرنے والے شاعروں کی طرح آہیں کراہ سناتی ہیں۔ یہ نظمیں اس عہد کے ایک ایسے فن کا وژن ہیں، جس کا فن معصومیت کی عظمت، زندگی کرنے کے انداز اور موجودہ پُرشور صنعتی دنیا میں تخریب اور امکانات کے پانیوں پر تیرتی ہوئی متحرک انسانی زندگی کے سفر کا ثمرِ جاوید سناتا ہے۔

محمود ہاشمی (برطانیہ)

بلراج کومل نظم، نثر اور تنقید کے حوالے سے اردو ادب کا بہت بڑا نام ہے۔ وہ مجھ سے عمر اور فن دونوں حوالوں سے بڑے ہیں۔ میں دل سے انھیں بڑا اور سچا فنکار مانتا ہوں۔ افسوس دلّی کی ادبی سیاست کے باعث میں ان کی شخصیت اور فن کو اس طرح سے خراجِ تحسین پیش نہ کر سکا جو ان کا حق اور میرا فرض بنتا ہے۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند (امریکہ)

بلراج کومل دھیمے لہجے میں بات کرنے والے فنکار ہیں۔ ان کے اسلوب میں خاموشی بدی جیسا بہاؤ ہے، اختلاف کو شائستگی سے پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ انھیں پڑھتے ہوئے بیانیہ کی سطح ہموار نظر آتی ہے۔ لیکن ان کی تحریریں ساختیاتی نظریات پر دوبارہ غور کرنے کی دعوت ضرور دیتی ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

# قرطاسِ
# اعزاز
# بلراج کومل
# کے
# نام

# حرفِ روشن کا امیر

انجنا پال (دہلی بھارت)

نام: بلراج کومل

پیدائش: ۲۵ ستمبر ۱۹۲۸ء سیالکوٹ (پاکستان)

پتہ: اے۔۱۳۹ کالکاجی نئی دہلی۔۱۱۰۰۱۹

فون: 2643642 موبائل: 9818466131

تعلیم: ایم اے

مشاغل/ملازمت: ۱۹۸۶ میں محکمہ تعلیم دہلی میں اعلیٰ عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد ادبی تخلیقی کام سے منسلک

ادبی سفر: آغاز ۱۹۴۸ء میں نظم بعنوان: ''کیلی'' کی اشاعت سے کیا۔ بعد ازاں شاعری کے علاوہ فکشن تنقید اور ترجمہ بھی ادبی اظہار کا حصہ بن گئے

تصانیف:

| نام کتاب | صنف/موضوع | ناشر | سن اشاعت |
|---|---|---|---|
| ۱۔ میری نظمیں | شاعری | مکتبہ شاعر دہلی | ۱۹۵۴ |
| ۲۔ رشتۂ دل | شاعری | ادارہ ادبِ دنیا لاہور | ۱۹۶۳ |
| ۳۔ [illegible] منتخب نظمیں | دیوناگری | آر ہیک دہلی | ۱۹۶۷ |
| ۴۔ میرا [illegible] ایک گھر | ناولٹ (ہندی) | [illegible] لکھنؤ | ۱۹۶۸ |
| ۵۔ سفرِ مدام سفر | شاعری | شب خون کتاب گھر الہ آباد | ۱۹۷۹ |
| ۶۔ اکائیاں (منتخب نظمیں) | شاعری | انجمن ترقی اردو علی گڑھ | ۱۹۷۱ |
| ۷۔ نژادِ سنگ | شاعری | نصرت پبلشرز لکھنؤ | ۱۹۷۵ |
| ۸۔ آنکھیں اور پاؤں | افسانے | رائٹرز گلڈ الہ آباد | ۱۹۸۱ |
| ۹۔ پرندوں بھرا آسمان | شاعری | ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی | ۱۹۸۲ |
| ۱۰۔ ادب کی تلاش | تنقید | نصرت پبلشرز لکھنؤ | ۱۹۸۵ |
| ۱۱۔ شہر میں ایک تحریر | شاعری | ماڈرن پبلشرز دہلی | ۱۹۸۷ |
| ۱۲۔ منتخب نظمیں (انگریزی ترجمہ) | شاعری | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی | ۱۹۸۹ |
| ۱۳۔ کیلی (منتخب نظمیں) | شاعری | کوہِ نور پبلشرز کراچی | ۱۹۸۹ |
| ۱۴۔ پرندوں بھرا آسمان (دیوناگری) | شاعری | ساہتیہ اکادمی دہلی | ۱۹۸۹ |
| ۱۵۔ [illegible] (انگریزی ترجمہ) | شاعری | ساہتیہ اکادمی دہلی | ۱۹۹۳ |
| ۱۶۔ تجزیہ اور تحلیل | تنقید | ویب پبلیکیشنز دہلی | ۱۹۹۵ |
| ۱۷۔ [illegible] | شاعری | سیمانت پرکاشن دہلی | ۱۹۹۶ |
| ۱۸۔ [illegible] (منتخب کلام) | شاعری | ساہتیہ اکادمی دہلی | ۲۰۰۲ |
| ۱۹۔ [illegible] (ہندی ترجمہ) | شاعری | ساہتیہ اکادمی دہلی | ۲۰۰۵ |
| ۲۰۔ [illegible] (لحظہ لحظہ منتخب کلام کا انگریزی ترجمہ) | شاعری | ساہتیہ اکادمی دہلی | ۲۰۰۷ |

| تراجم | صنف/موضوع | ناشر | سن اشاعت |
|---|---|---|---|
| ۱۔ [illegible] (ایم [illegible] کی انگریزی تصنیف [illegible] کا اردو ترجمہ) | سائنس | نیشنل بک ٹرسٹ | ۱۹۸۰ |
| ۲۔ [illegible] کی انگریزی (تصنیف کا اردو ترجمہ) | سوانح | ساہتیہ اکادمی دہلی | ۱۹۸۵ |
| ۳۔ سانپ اور رسی (راجہ راؤ کے انگریزی ناول (دی سرپنٹ اینڈ دی روپ) کا اردو ترجمہ) | ناول | ساہتیہ اکادمی دہلی | ۱۹۹۱ |
| ۴۔ اندھیرے میں سلگتے حروف (سرجیت پاتر کے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ پنجابی مجموعہ کلام کا اردو ترجمہ) | شاعری | ساہتیہ اکادمی دہلی | ۲۰۰۱ |

اعزازات:

| | |
|---|---|
| ۱۔ حکومت ہند وزارت تعلیمات کا ایوارڈ برائے ناولٹ میرا [illegible] ایک گھر | ۱۹۶۹ |
| ۲۔ اترپردیش اردو اکادمی کا ایوارڈ برائے سفرِ مدام سفر (شاعری) | ۱۹۷۱ |
| ۳۔ میر اکادمی لکھنؤ امتیازِ میر ایوارڈ برائے شاعری | ۱۹۷۷ |
| ۴۔ اترپردیش اردو اکادمی کا ایوارڈ برائے ''آنکھیں اور پاؤں'' (افسانے) | ۱۹۸۲ |
| ۵۔ دہلی اردو اکادمی کا ایوارڈ برائے شاعری | ۱۹۸۲ |
| ۶۔ ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ برائے پرندوں بھرا آسمان (شاعری) | ۱۹۸۵ |
| ۷۔ حکومت ہند کی سینئر فیلوشپ | ۱۹۸۹ |
| ۸۔ فراق فاؤنڈیشن ایوارڈ | ۱۹۹۵ |
| ۹۔ انٹرنیشنل ساحر فاؤنڈیشن ایوارڈ | ۲۰۰۰ |
| ۱۰۔ بھارتیہ بھاشا پریشد ایوارڈ | ۲۰۰۳ |
| ۱۱۔ [illegible] ایوارڈ | ۲۰۰۴ |
| ۱۲۔ پنجاب سرکار کا شرومنی ایوارڈ | ۲۰۰۴ |
| ۱۳۔ غالب ایوارڈ | ۲۰۰۶ |

رکن:

۱۔ممبر اردو اکادمی، دہلی ۸۷۔۱۹۸۶، ۹۲۔۱۹۹۶، ۹۹۔۱۹۹۸، ۲۰۰۶۔۲۰۰۴

۲۔ممبر لٹریری بورڈ اردو ساہتیہ اکادمی ۱۹۹۲۔۱۹۹۷، کنوینر لٹریری بورڈ

۲۰۰۳۔۱۹۹۸، ۲۰۰۷۔۲۰۰۳

۳۔ممبر اردو اکادمی دہلی ۲۰۰۶۔۲۰۰۴

ترتیب و تالیف:

۱۔نگران ساہتیہ اکادمی ترجمہ ورکشاپ ۱۹۸۶، ۱۹۸۹، ۱۹۹۰،

۲۔ترتیب و تہذیب: کشمیری لٹریچر شارٹ سٹوریز کے اردو تراجم کی چار جلدوں کی ترتیب و تہذیب کے فرائض سرانجام دیے

۳۔ساہتیہ اکادمی کے انگریزی جریدے انڈین لٹریچر کے پہلے دو شماروں کے اردو ادب سے متعلق حصے کی ترتیب و تہذیب کے فرائض سرانجام دیے

سیمینار:

مختلف ادبی موضوعات پر علی گڑھ یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی، دہلی اردو اکادمی، کرناٹک اردو اکادمی، ساہتیہ اکادمی، انڈین کاؤنسل آف کلچرل ریلیشنز، نئی دہلی، سارک فیسٹیول ۱۹۹۶ کے سیمیناروں میں پرچے پیش کیے۔

بیرونی ممالک کے سفر:

۱۔پاکستان۔۱۹۶۰، ۱۹۸۴ ادبی سمپوزیم

۲۔عراق۔مربد پوئٹری فیسٹیول ۱۹۸۸

۳۔ماریشس، مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ عالمی اردو ادب سیمینار ۱۹۸۹

۴۔ناروے۔اوسلو۔مشاعرہ ۱۹۹۰

۵۔ڈنمارک۔ادبی سمپوزیم ۱۹۹۰

۶۔جرمنی۔ہاؤس آف کلچرز آف ورلڈ برلن خصوصی اردو پروگرام ۱۹۹۱

۷۔سویڈن۔ادبی سمپوزیم ۱۹۹۱

۸۔ڈنمارک۔ادبی سمپوزیم ۱۹۹۱

۹۔انگلستان لندن۔ادبی سمپوزیم ۱۹۹۴

۱۰۔اردن۔کلچرل ایکسچینج پروگرام ۲۰۰۲

۱۱۔اسرائیل۔سیاحت ۲۰۰۹

۱۲۔نیپال۔سارک کلچرل کانفرنس ۲۰۰۹

۱۳۔دبئی۔دوحہ (قطر) مشاعرہ ۲۰۰۸

۱۴۔چین۔کلچرل ایکسچینج پروگرام ۲۰۰۴

☆

## جہانگیر اشرف

اپنے جہانگیر مائل بہ پرواز ہیں
نظر آئیں نہ ایسے پر رکھتے ہیں

سخن فہم اور خود سخن ور بھی ہیں
اپنی ہر بات میں اک حشر رکھتے ہیں

دور حاضر پہ ان کی ہے گہری نگاہ
آج کل کیا ہے ہوا، خبر رکھتے ہیں

یہ سیماب صفت بے کل رہیں
قومی غیرت سے بھرپور جگر رکھتے ہیں

یہ شعروں میں کالم نگاری کریں
ہشت پہلو ہیں، ہردو ہنر رکھتے ہیں

اپنی آنکھوں محبت کے سورج رکھیں
لب ہیں رخشندہ، ماتھے بدر رکھتے ہیں

یار یاروں کے اوساں کے پیارے بڑے
ساتھ تقدیر رشکِ قمر رکھتے ہیں

اور شہر کے معروف لکھاری ہیں یہ
اپنے احباب کے دل میں گھر رکھتے ہیں

زندگی سے یہ خوش، وہ ہیں ان پہ نثار
تین بچوں کا گھر میں ثمر رکھتے ہیں

ہیں بڑے تیز رو اور بڑے تیز پا
اک نشاں چھوڑیں پاؤں جدھر رکھتے ہیں

یہ اک دو کے قائل ہم بھی ان کے قائل
اپنی باتوں میں جادو اثر رکھتے ہیں

محاسن ہیں ان میں اقبالؔ کیا کیا
وہی جانیں جو تر نظر رکھتے ہیں

محمد اقبال بھٹی (برطانیہ)

# سردار ہرکارہ

بلراج کومل

گوجرانوالہ کے گاؤں رام کا چھا سے آغازِ سفر کرنے کے بعد دلیپ سنگھ نے بہت سے مقامات اور ممالک کا سفر کیا۔ ہر سفر سے لوٹنے کے بعد اس نے اپنے دوستوں کو فرداً فرداً یا محفل یاراں میں انتہائی لطف و انبساط کے ساتھ اپنا سفرنامہ سنایا لیکن آخری بار وہ جس سفر پر نکلا جہاں سے اس کا لوٹنا اور اپنا تازہ ترین سفرنامہ سنانا ممکن نہیں ہے۔

میری اور دلیپ سنگھ کی دوستی کا سنہری سفر کم و بیش پچھلے پچاس برسوں پر محیط ہے۔ میں یہ سفرنامہ سب کو سنانا چاہتا ہوں لیکن نہ میرے پاس دلیپ سنگھ کا بے ساختہ پن ہے نہ اس جیسی حس مزاح، نہ ترمیم و اضافہ اور مبالغہ کا وہ فن جو معمولی کو غیر معمولی بنا کر اسے جاذب و دلکش دلچسپیوں سے بھرپور اعتبار و مرتبہ عطا کر دیتا ہے۔

دلیپ سنگھ سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ ہم دونوں پنجاب یونیورسٹی (مشرقی پنجاب) کی جانب سے مہاجرین کے لیے عارضی طور پر چلائے گئے دہلی کے کیمپ کالج کے طالب علم تھے۔ میں ایم اے (انگریزی ادبیات) کا طالب علم تھا۔ دلیپ سنگھ چونکہ عمر کے اعتبار سے مجھ سے چند برس چھوٹا تھا اس لئے ان دنوں بی اے کی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ یہ اس دوستی کا اعجاز تھا کہ ہم پہلی ہی ملاقات میں دل و جان سے ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو گئے۔ عشق کے اس سلسلے میں دیکھتے دیکھتے ہربنس سنگھ بھوا، لدا رنگوج بھی شامل ہو گئے۔ کرشن ادیب چونکہ میرے یار عشق میں پہلے سے موجود تھا اس لئے وہ بھی ناگزیر انداز میں اس سلسلے کا حصہ بن گیا۔ میں ان دنوں شاعری کی بیماری کے راہ نوردی اور ابتدائی میگساری کے مختلف مراحل سے گزر رہا تھا۔ لودھی روڈ کالونی کے ایک سرکاری کوارٹر کی برساتی میں رہتا تھا اور جویلا سنگھ کے ڈھابے میں کھانا کھاتا تھا۔ دن کا بیشتر حصہ ہم کافی ہاؤس میں گزارتے تھے۔ ایک دوسرے کو اور کچھ فوری طور جمع ہونے والے سامعین کو لطیفے اور چٹکلے سناتے تھے۔ کرشن ادیب غزلوں اور لطیفوں کا کاروبار کرتا تھا۔ شام ہوتے ہی ہم دلیپ سنگھ، ہربنس سنگھ بھوا اور میں تین سائیکل سوار کیمپ کالج (جو شام کا کالج تھا) کی جانب روانہ ہو جاتے۔ ہمارے کالج سے لوٹنے تک کافی ہاؤس میں مصروف گفتگو ہمارے یار عام طور پر کسی اگلی مہم کا منصوبہ تیار کر چکے ہوتے تھے۔ لہٰذا ہمارے پہنچتے ہی ہم سب اس اگلی مہم پر روانہ ہو جاتے۔ ہماری مہمات بڑی بے ضرر قسم کی مہمات تھیں۔ یا تو ہم کسی تیسرے درجے کے سینما گھر میں کوئی چوتھے درجے کی فلم دیکھنے کے لیے چل دیتے یا پھر ہلکی پھلکی سی میگساری سے سرشار ہونے کی کوشش کرتے یا اگر تہی دامن ہوتے تو جویلا سنگھ کے ڈھابے کی دال فرائی اور تندوری روٹیاں کھا کر لودھی کالونی کی برساتی میں فرش سے لپٹ کر سو جاتے۔ فکر تونسوی اور مخمور جالندھری کے جالندھر سے دہلی منتقل ہونے کے بعد ہم سب دوستوں کی ملاقاتوں کی سرشاری اور تواتر میں مزید سرگرمی پیدا ہو گئی اور یہ سلسلہ برسوں جاری و ساری رہا اور ہماری غیر محفوظ جگہوں پر منعقد ہونے والی محفلوں میں کبھی کبھی خود وجی الدین جیسے معتبر شاعر بھی شامل ہوتے رہے۔

دلیپ سنگھ چاہے رام کا چھا میں تھا، یا دلی میں ہر شے، ہر شخص، ہر واقعہ کو اس کے رنگین حسن کے تناظر میں دیکھتا تھا۔ ہر شے، ہر شخص، ہر واقعہ کو اعجاز لمس سے زندہ و تابندہ کر دیتا تھا۔ دوستوں کو سخت سے سخت بات اس انداز سے کہتا تھا کہ وہ بے اختیار یہ انداز میں کبھی مسکرانے لگتے، کبھی قہقہہ لگانے لگتے، کبھی دلیپ سنگھ سے رشک کرنے لگتے۔ گھر، دفتر، رہگزر، کافی ہاؤس، شراب خانہ، ڈھابہ ہر جگہ دلیپ سنگھ کے لیے تجربات کا خزانہ موجود تھا۔ گھر میں ماں باپ، بہن بھائی، بیوی اپنی مخصوص شخصیتوں کے طفیل مخصوص اور منفرد رویوں، عادتوں اور باتوں کا خزانہ لئے ہوئے تھے۔ دفتر میں آفس سپرنٹنڈنٹ ہری سنگھ تھا جو بیتو گر فرد دلیپ سنگھ کو دن میں دو تین بار ڈاک نپٹنی دینے کے لیے بلوتا اور ابتدائی جملہ ریفرنس ٹو یور لیٹر نمبر۔ آن دی سبجیکٹ معتبر ہے۔ with reference to your letter no - dated on the subject mentional above لکھوانے اور چار پانچ منٹ بے بسی کے عالم میں کمرے کی دیواروں اور چھت کا سرکاری معائنہ کرنے کے بعد یہ کہہ کر اسے رخصت کر دیتا کہ دلیپ سنگھ اپنے تجربے کی روشنی میں خود ہی پوری چٹھی ٹائپ کر لائے۔ یہ وہی ہری سنگھ تھا جو اسے دہلی سے بمبئی جانے کی آدھ مہینے کی چھٹی تو دے دیتا تھا لیکن سنٹرل سیکرٹریٹ سے تھوڑی دور واقع گول ڈاک خانہ تک جانے کی ایک گھنٹے کے لیے اجازت نہیں دیتا تھا۔ پارک میں ان سے کہتے وہاں وہ خوبصورت عورت مل جاتی جو کتے سے خوف زدہ دلیپ سنگھ کو یقین دلاتی کہ کتا کاٹے گا نہیں۔ دلیپ سنگھ بڑی خوش اخلاقی سے خاتون کی یقین دہانی کا شکریہ ادا کرتا لیکن یہ کہہ کر وہاں سے جلدی سے بھاگ کھڑا ہوتا۔ "مجھے اپنی ٹانگ سے زیادہ اپنے واحد پاجامے کی زیادہ تشویش ہے۔" کالج میں جب کوئی طالب علم اسے آ کر یہ خوش خبری سناتا کہ اس نے تو اچھے نمبروں سے ایم اے کا امتحان پاس کر لیا ہے اور ساتھ ہی جب استفسار کے طور پر یہ اضافہ بھی کرتا کیا وجہ ہے کہ دلیپ سنگھ کیوں اب تک امتحان کلیر CLEAR نہیں کر سکا تو دلیپ سنگھ اس کو یہ کہہ کر لاجواب کر دیتا "گردھاری لال تم نے اچھا کیا جو وقت پر ایم اے پاس کر لیا۔ تمہارے لیے یہی مناسب تھا۔ میرا معاملہ تم سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ میرا ایم اے کی ڈگری کے بغیر ہی سب کام بخوبی چل رہا ہے۔" پہاڑ گنج کے سینما گھر میں جب پردہ سیمیں پر چلتی ہوئی فلم پر اس کی رننگ کمنٹری RUNNING COMMENTARY سامعین و ناظرین کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی

ور سینما گھر کا کوئی ملازم یا پولیس والا یا ہال میں بیٹھا ہوا کوئی شخص اسے ٹوکنے کے لیے آتا تو دلیپ سنگھ خوش اسلوبی سے اسے یہ کہہ کر رخصت کر دیتا۔

"ہم RUNNING COMMENTARY رننگ کمنٹری کے مقصد سے ہی پہاڑ گنج کے سینما گھر میں آتے ہیں اگر ہمیں خاموش بیٹھ کر فلم دیکھنا ہوتا تو ہم کناٹ پلیس کے سینما گھر ریوالی یا پلازہ میں جاتے۔" اس جملے کی تخلیق میں ادنائی تخلیقیت کے تناظر میں برٹش سنگھ بھولا کا اور میرا بھی حصہ ہوتا۔

میری اور دلیپ سنگھ کی پہلی ملاقات اردو زبان اور اردو ادب سے دلچسپی کے طفیل پروان چڑھی تھی اور دائمی دوستی میں ڈھل گئی تھی۔ دلیپ سنگھ اردو، فارسی، پنجابی اور انگریزی پر وسیع عبور رکھتا تھا، وہ شعر اور نثر دونوں میں تخلیقی اظہار کا امکان آرزومند تھا۔ لیکن اس کا انکیوبیشن پیریڈ INCUBATION PERIOD ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا۔ لیکن جب وہ اپنے متنوع، ہمہ جہت تجربات کی بھاری بھرکم، بیش قیمت گٹھڑی اپنی پیٹھ پر اٹھا کر عملی تخلیقی سفر کی راہ پر نکل پڑا تو اس نے پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس کے ذہن اور قدموں میں بجلیاں بھر گئیں۔ وہ قلم بر داشتہ ایک مسلسل اظہار بن گیا۔ اس کے مزاحیہ مضامین ہندوستان اور پاکستان کے تمام متعدد رسائل کی زینت بن گئے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن کے ڈرامے اور سیریل لاکھوں کروڑوں سامعین اور ناظرین کی داد و تحسین سے سرفراز ہو گئے۔ اس کی مدیرانہ قابلیت اور عملی کارکردگی نے وزارت خارجہ کے ایک "بے رنگ" سرکاری ہفتہ وار جریدے کو نہ صرف رنگ و تصویر کا مرقع بنا دیا بلکہ مختلف زبانوں میں اس کی اشاعت کے ذریعے دائرۂ قارئین کو بین الملکی، عالمی نوعیت سے سرفراز کر دیا۔

دلیپ سنگھ گوناگوں مصروفیات کے باوجود غیر مصروف آدمی تھا۔ سراپا خبر، بذلہ سنج، برجستہ، شگفتہ، بے اختیارانہ سرشاری سے متصف حالاں کہ وہ تخلیقی طور پر پچھلے پچاس برسوں کا "کوٹا" چند ہی برسوں میں پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا لیکن اس ناگزیریت کے باوجود گفتار کے اس غازی نے اپنی باتوں کی تعداد و مقدار اور دلچسپی میں کمی آنے دی، نہ کسی دوست یا ملاقاتی کو مخل کار سمجھا، نہ یاروں کی ان محفلوں سے فاصلہ پیدا کیا جو ان تھک توڑ کے ساتھ شام کی سرشاریوں سے متصف تھیں۔ دلیپ سنگھ زوال عمر کی زد میں کبھی نہیں آیا۔ جب وہ دل کے عارضہ میں غیر متوقع طور پر مبتلا ہوا تو بھی کسی ناآسودگی یا احساس محرومی کا شکار نہیں ہوا۔ پہلے ہی طبی ہدایات کے مطابق جام سے اس کے لیے ممنوعات میں شامل ہو گیا لیکن نہ تو وہ محفلوں سے کنارہ کش ہوا نہ ہی اس نے اپنی شگفتگی اور بے ساختگی کو ضعف آشنا ہونے دیا۔ حق بات تو یہ ہے اس نے اپنے تخلیقی اظہار کی رفتار کو مزید تیز تر کر دیا۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوا وہ کسی بے ساختہ سرشاری کے لمحے میں طبی ہدایات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے حلقہ جام میں بھی شامل ہو گیا۔

دلیپ سنگھ کی تخلیقی ہمہ جہتی اور قوت کا سرچشمہ اس کا زمین سے گہرا رشتہ تھا اور وہ وسیع انسانی ہمدردی تھی جو صرف چند خوش قسمت لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اس کے مزاحیہ مضامین، ڈرامے، افسانے، ریڈیائی ٹی وی سیریل سب زندہ کرداروں، عام زندگی کے معمولی سے لے کر غیر معمولی ڈرامائی صورتوں سے آباد تھے۔ اس کے کردار چاہے وہ رام کے چھتا کے ہوں یا دلی کی گلیوں کے یا کافی ہاؤس یا شراب خانے کے، سب تحریروں اور بحثوں سے بھرپور ہمارے جانے پہچانے کردار تھے۔ دلیپ سنگھ نے اردو زبان کی مزاح نگاری کو محض جھگڑالو بیویوں، جابر والدین، ادھر اُدھر کی سونگھنے والے پڑوسیوں، سرکاری اور غیر سرکاری رشوت خوروں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے خاکوں اور مزاحیہ مضامین کی حدود سے نکال کر اسے بلیک ڈی ہن کی طرح افسانے کا درویست اور وقار عطا کر دیا۔ "نور دین کی لاش" اور "سردار ایمر کارہ" اعلیٰ افسانہ نگاری کی ناقابل فراموش مثالیں ہیں۔ یہ دونوں افسانے زندگی کی دو مختلف جہتوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ "نور دین کی لاش" زندگی، موت اور لاش کی خود غرضانہ کیفی "اقتصادیات" اور عصری سماجی عامیانہ پن کی تصویر ہے۔ "سردار ایمر کارہ" اس کے برعکس اس انسانی ہمدردی اور انسانی جذباتی توانائی کی طرف اشارہ ہے جو کسی بلا تفریق نسل سے ماورا ہے، جس کا سرچشمہ اگر کوئی ہے تو وہ ہے انسان کی انسان کے ساتھ قربت، ہم آہنگی، ایک دوسرے کا دکھ سمجھنے کی شخصی وسیع القلبی۔ "سردار ایمر کارہ" بطور کردار اگرچہ ایک مٹتی ہوئی نسل کی آخری مخلوق ہے لیکن اپنے انہدام میں ایک اعلیٰ وارفع قدر کی تجسیم ہے۔ اس لحاظ سے غالباً دلیپ سنگھ بھی سردار ایمر کارہ کا ہم زاد تھا۔

دلیپ سنگھ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں صرف اردو زبان اور اردو زبان و ادب کی اصناف تک محدود نہیں رہا۔ اس کی تحریریں پنجابی، ہندی اور انگریزی تراجم کے ذریعے نہ صرف ہندوستان اور پاکستان بلکہ دیگر ممالک کے وسیع حلقہ قارئین تک پہنچیں اور غیر معمولی طور پر پسند کی گئیں۔ دلیپ سنگھ کی زرخیز ذہنی کا یہ عالم تھا کہ ہر لحظہ کوئی نہ کوئی نئی بات سوجھتی رہتی تھی۔ ہر لحہ وہ کسی نئے منصوبے کے بارے میں دوستوں سے مشورہ کرتا رہتا تھا۔ وہ افسانے کا یا مضمون کا عنوان ہو یا پھر کتاب کا عنوان۔ آخری فیصلہ کرنے سے پہلے وہ دوستوں کی رائے حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا اور ان کے مشوروں کو بڑی فراخ دلی سے قبول کرتا تھا۔ اس کی معاملہ فہمی اور حاضر دماغی کا یہ عالم تھا کہ وہ مشکل سے مشکل صورت حال میں بھی نہ صرف کوئی نہ کوئی راہ نجات ڈھونڈ لیتا تھا بلکہ اس تلاش میں بھی لطف کا کوئی نادر پہلو پیدا کر دیتا تھا۔

ہم دونوں اردو زبان و ادب کے اہم تخلیق کاروں اور ان کے شاہکار کارناموں کے عاشق تھے۔ سعادت حسن منٹو ان میں سے ایک تھا۔ منٹو کی دیگر تحریروں کے علاوہ ہمیں اس کے وہ شخصی خاکے بے حد پسند تھے جو "گنجے فرشتے" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے تھے۔ چند برس پہلے ایک

ملاقات کے دوران میں نے دلیپ سنگھ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ کیوں نہ کچھ ہم عمر فرشتوں کا سر منٹو کے انداز میں مونڈ دیا جائے اور کچھ نئے گنجے فرشتوں کی صورت میں منٹو کے گنجے فرشتوں کے سلسلے کی توسیع کر دی جائے۔ ہم لوگ عام طور پر بات کو ہضم نہیں کر سکتے تھے۔ کہیں نہ کہیں یہ بات میرے یا دلیپ سنگھ کے منہ سے نکل گئی۔ اور خبر کی صورت میں دہلی کے حلقۂ احباب میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دہشت کا یہ عالم تھا کہ لوگ یا تو تشویش میں مبتلا ہو گئے یا مزید تفصیلات کی ٹوہ لگانے لگے یا خود حفاظتی تدبیر کرنے لگے یا مجھے اور دلیپ سنگھ کو اس منصوبے سے باز رہنے کی تنبیہ کرنے لگے۔ ہمارا منصوبہ عمل پیدائش سے پہلے ہی زیر زمین چلا گیا۔ ایک روز میں نے دلیپ سنگھ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ کیوں نہ ہم ایک دوسرے کا سر مونڈ دیں اور ایک دوسرے کو گنجا فرشتہ بنا کر رکھ دیں۔ دلیپ سنگھ نے چند لمحے بڑے غور سے میری جانب دیکھا اور پھر مسکرا کر یوں گویا ہوئے "یار راج تم عجیب آدمی ہو۔ ایک تو میں ویسے ہی کم و بیش گنجا ہوں مگر چوں کہ میں سکھ ہوں اس لئے مونڈنا تو دور کی بات ہے تم میرے چند بچے کھچے بالوں کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ البتہ میں تمہارا سر فوراً مونڈ سکتا ہوں۔ ویسے تمہارے سر پر بھی گنتی کے چار بال باقی رہ گئے ہیں۔" اس کے بعد دلیپ سنگھ چند لمحے خاموش رہا اور پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "سیٹھ راج میری اور تمہاری صورت حال کا فرق یہ ہے کہ تم پہلے ہی میرے بالوں تک نہ پہنچ پاؤ۔ یہ بات بہرحال طے ہے کہ تم اپنے خاکے میں مجھے وقتاً "گنجا" کر کے رکھ دو گے اس کے برعکس میں نہ چاہتے ہوئے بھی تمہارے سر پر چمکتے ہوئے بالوں کی فصل اگا دوں گا یہ امکان میرے لیے چونکہ خطرناک ہے اس لیے بہتر ہے ہم اپنے بڑے منصوبے کا یہ ضمنی منصوبہ بھی ترک کر دیں" لہٰذا یہ منصوبہ بھی ختم ہو گیا۔ لیکن دلیپ سنگھ کی حس مزاح اور عالی ظرفی کے اظہار پر ختم ہوا۔

ہم سب سائیکل کے عہد سے گزرے تھے۔ میں دلیپ سنگھ اور پرنس سنگھ بھولا۔ پرنس سنگھ بھولا امریکہ میں یونیورسٹی کا پروفیسر بن کر کار کے دور میں داخل ہو گیا۔ دلیپ سنگھ وزارت خارجہ کی بیرون ملک آخری میں اپنی تعیناتی کی مقررہ میعاد پوری کر کے جب لوٹا تو کار اپنے ساتھ امپورٹ کر کے لایا اور کار کے دور میں داخل ہو گیا۔ لیکن بیرون ملک جانے سے پہلے دلیپ سنگھ دو پہیہ اسکوٹر پر دہلی کے فاصلے طے کیا کرتا تھا۔ ایسی ہی ایک سیاحت کے دوران ایک روز وہ مجھ سے ملنے میرے گھر آ گیا۔ بھابی صاحبہ بریندر کور بھی اسکوٹر کی پچھلی سیٹ یعنی پلین پر جلوہ افروز تھیں۔ جب وہ سیٹ پر سے اتریں تو میں ان کے خیر مقدم کے لیے گھر کے باہر پہلے سے موجود تھا۔ سخت گرمی کے موسم میں انھوں نے اپنے بالوں کو اسکارف میں سمیٹ رکھا تھا۔ اسکوٹر سے اترتے ہی انھوں نے گرمی کی شکایت کی۔ میں نے کہا: "بھابی اس سخت گرمی میں آپ اپنی زلفوں کو اس عذاب میں کیوں جکڑتی ہیں۔ آپ خوبصورت ہیں اور خوبصورت عورت کی خوبصورت زلفیں اس کے خوبصورت بال ہوا میں اڑتے، ہوا میں لہراتے اچھے لگتے ہیں۔" بھابی مسکرائیں۔ "تعریف کے لیے شکریہ آپ نے صحیح کہا خوبصورت عورت کے خوبصورت بال ہوا میں لہراتے اڑتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ لیکن میں اپنے بالوں کو اس لئے اسکارف میں سمیٹ کر رکھتی ہوں تا کہ اڑنے کے عمل میں یہ بالکل ہی نہ اڑ جائیں۔ جیسے آپ کے دوست دلیپ سنگھ کے اڑ چکے ہیں۔" دلیپ سنگھ کے ہاتھ بے ساختہ یہ یقین کرنے کے لیے اپنے سر کی جانب اٹھ گئے کہ ان کی پگڑی ان کے سر پر قائم و برقرار ہے یا نہیں۔ پگڑی قائم و برقرار تھی۔ اور وہ گنجا پن بھی جو پگڑی کے نیچے بحفاظت چھپا ہوا تھا اور جس سے میں اور بھابی صاحبہ دونوں واقف تھے۔ ہم تینوں نے مل کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور مسرور ہو گئے۔

لام بیکاری کے دوران میں نے ایک بار دلیپ سنگھ کے سامنے ایک تجویز رکھی تھی "دلیپ سنگھ تم سکھ ہونے کے ناطے ایک مارشل ریس سے تعلق رکھتے ہو۔ تمہارا قد صرف پانچ فٹ دو انچ ہونے کے باوجود فوج میں بھرتی کی کم سے کم ضرورت کے مطابق ہے لہٰذا تم بیکاری کا قصہ ختم کر کے فوج میں بھرتی ہو جاؤ۔"

دلیپ سنگھ مسکرایا اور سر سے پاؤں تک میرے وجود اور قد کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "ہم دونوں کم و بیش ایک جیسے قد کے ہیں۔ تم بھی فوج میں بھرتی ہو سکتے ہو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں کوئی وکٹوریہ کراس یا تاج حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ میں سردیوں کی سنہری دھوپ میں گھر کے کھلے آنگن میں کمبل اوڑھ کر سونے اور خواب دیکھنے والا آدمی ہوں۔ میں فوجی فتوحات کی کوئی میزان تیار نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ میرا فوج میں کیا کام۔ میں تو پیدائشی سویلین CIVILIAN ہوں" ہم دونوں نے قہقہہ لگایا۔ اور سردیوں کی سنہری دھوپ کو اپنے جسم و جاں میں دیر تک جذب کرتے رہے۔

دلیپ سنگھ جب تک زندہ رہا خوبصورت چہروں، ذہین محنت مند عورتوں اور شہرت یافتہ مردوں سے اپنی وابستگیوں کی داستانیں سناتا رہا۔ باتوں کے خوش رنگ، شگفتہ، رنگ برنگ پھول کھلاتا رہا۔ سَل گفتار میں زندگی کی مکروہات سے نبرد آزما ہوتا رہا۔ پہلے ہی وہ فوجی انداز کی ذاتی فتوحات کی کوئی میزان تیار نہیں کر سکا لیکن آج وہ، جس کسی سفر میں ہے اور سفر کی جس کسی منزل پر ہے اس کے سر پر تازگی، شگفتگی، برجستگی، بے ساختگی، ہمدردی اور جذباتی تمازت کا وہ تاج فروزاں ہے جو چھوٹی چھوٹی شخصی کیفیتوں کے باوجود فوجی فتوحات کے بجائے سنہری دھوپ، نیلگوں آسمان اور بے ساختہ انسانی قربتوں اور وابستگیوں سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

میں دلیپ سنگھ کے ساتھ کم و بیش پچاس برس دوستی کے سفر میں رہا۔ یادوں کے مرغزاروں میں میرا یہ سفر آج بھی جاری ہے۔

# براہِ راست

چہارسو کی ابتدا سے آج تک ہم نے اداریے کے عنوان سے اظہارِ خیال کو اس لیے غیر ضروری جانا کہ بسا اوقات طبیعت آمادہ اور موضوع دستیاب نہ ہونے کی صورت میں قاری کو بے جا ثقاہت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مگر صاحبِ قرطاسِ اعزاز کے تعارف اور خدمات کی بابت آپ کو باخبر کرنا ہماری ذمہ داری ٹھہرتی ہے!

جناب **بلراج کومل** کا اردو زبان وادب سے چھ دہائیوں پر محیط عشق جنوں کی حدیں پار کر چکا ہے۔ یہ عشق وجنوں کسی طرح کے ہیجان اور جذباتیت کا پرچارک ہرگز نہیں بلکہ خاص طرح کے ٹھہراؤ، نظم وضبط، شائستگی اور تہذیب کا امانت دار ہے۔ جس سے آج کا قاری بہت حد تک اجنبی اور نامانوس ہے!!

اگر ہماری رائے میں سچ کا ذرا سا بھی شائبہ نظر آئے تو ہم آپ کی جانب سے ادبی ورثے کی اس اہم امانت دار کو چہارسو کے اوراق میں مقید کرنے پر داد کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ وگرنہ جو مزاجِ یار میں آئے!!!

## گلزار جاوید

☆ کومل صاحب! یہ تو ہم جانتے ہیں کہ آج سے اسی برس قبل آپ کا جنم سیالکوٹ میں ہوا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کے بچپن اور نوعمری کی یادوں کو آواز دے کر کچھ دیر کے لیے مٹھی میں مقید کر لیا جائے؟

☆☆ میرا جنم ضلع سیالکوٹ کے گاؤں اُڑوور میں ہوا جہاں میرے دادا دادی رہتے تھے میرا بچپن اور بی۔اے تک تعلیم کے دن فیروز پور میں گزرے جہاں میرے والدِ محترم میری ماں اور میرے دو بھائیوں اور دو بہنوں پر مشتمل ہمارا خاندان مقیم تھا۔ میرے والد نے مرے کالج سیالکوٹ سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا تھا۔ بعد میں انہوں نے درس وتدریس کو اپنا کیرئیر بنانے کے لیے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بی ٹی کی ڈگری حاصل کی۔ اور مختلف تعلیمی اداروں کی ملازمت سے گزرنے کے بعد بالآخر فیروز پور کے ایک ہائی سکول سے وابستہ ہوئے جہاں سے وہ بطور ہیڈ ماسٹر ریٹائر ہونے کے بعد ۱۹۵۵ء میں دہلی منتقل ہوئے جہاں میں بی۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۴۸ء میں پہنچ چکا تھا اور دو سیاسی ورثے میں ایم۔اے کا امتحان پاس کر چکا تھا۔ بی اے کی تعلیم مکمل کرنے کے وقفے میں مجھ پر اچانک یہ انکشاف ہوا کہ میں شعر کہہ سکتا ہوں ان دنوں اسکولوں میں آٹھویں درجے تک ذریعہ تعلیم اردو زبان تھی۔ لہٰذا بی اے کے دو برسوں میں لاہور کے کئی ادبی رسائل کی ورق گردانی اور مطالعے کے بعد مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں شاعر ہوں اور میں دیوانہ وار نظم ونثر میں تخلیقی اظہار کرنے لگا۔ ۱۹۴۸ء میں میں نے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی اور اسی برس ''سنگِ میل'' پشاور میں میری پہلی نظم بعنوان ''اکیلی'' شائع ہوگئی۔ اس نظم کو فوری شہرت نصیب ہوئی اور ۱۹۴۸ء کے منتخب نظموں کے کم وبیش ہر مجموعے میں اس نظم کو جگہ ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ ہمارا تعلیمی ماحول عام طور پر طلباء میں تخلیقی امکانات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ والدین اور اساتذہ تخلیقی امکان کو ''بے راہ روی'' کی علامت سمجھتے ہیں اور بچوں کو اس کی سزا بھی دیتے ہیں۔ شعر گوئی کی منزل میرے تعلق سے چونکہ کالج کے دنوں میں میرے حصے میں آئی لہٰذا اس سزا سے تو محفوظ رہا لیکن طنز وتضحیک کا ہدف بہرحال بنا رہا۔ ہم جماعت دوستوں اور اساتذہ کا ردِعمل ہمدردانہ نہیں لیکن مکمل طور پر مخاصمانہ بھی نہیں تھا۔

☆ اٹھارہ برس کی عمر میں جب فیروز پور سے لاہور اشاعت کی غرض سے آئے تو اس سے قبل کہاں کہاں آپ کا کلام شائع ہوتا رہا؟

☆☆ میں اشاعت کی غرض سے فیروز پور سے لاہور کبھی نہیں آیا البتہ یہ انکشاف ہونے کے بعد کہ میں شاعر ہوں میں کتابیں اور رسائل جمع کرنے کے مقصد سے کالج سے فرار ہو کر لاہور ضرور جاتا رہا۔ پہلی نظم ''اکیلی'' کی اشاعت کے بعد میرا کلام ادبِ لطیف اور ہندوستان اور پاکستان کے کئی ادبی رسائل میں شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۵۴ء میں مکتبہ ذکا دہلی نے میرا پہلا مجموعہ ''میری نظمیں'' شائع کیا جو عام طور پر پسند کیا گیا۔

☆ آپ کے نام سے ذہن میں فوری تاثر ہندی کوی یا لیکھک کا ابھرتا ہے۔ ہندی زبان وادب سے آپ کا شغف اور شناسائی کس طرح کی ہے؟

☆☆ جی ہاں میرے نام کی نسبت سے کچھ ایسا ہی تاثر ابھرتا ہے لیکن میں اپنے بنیادی مزاج کا اسیر ہوں اور یہ بنیادی مزاج اردو زبان وادب کا اسیر ہے ہندی زبان وادب کی میری واقفیت میرے نزدیک واجبی سی ہے البتہ ہندی رسم الخط میں بخوبی لکھ پڑھ سکتا ہوں۔

☆ آپ کی مادری زبان پنجابی ہوتے ہوئے بھی اس زبان کے تخلیقی کاموں میں آپ کا نام دور دور تک نظر نہیں آتا؟

☆☆ جی ہاں پنجابی میری مادری زبان ہے کسی حد تک گورمکھی رسم الخط بھی جانتا ہوں لیکن مزاج اور معاشرہ چونکہ اردو زبان میرے تخلیقی ذہن پر حاوی ہے اس لیے میرا بیشتر تخلیقی اظہار اردو زبان میں ہے۔ دیوناگری اور انگریزی میں بھی

کچھ طبع زاد تحریریں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ تراجم کے سلسلے میں میں نے پنجابی، ہندی، اردو اور انگریزی بھی زبانوں سے یعنی چاروں زبانوں میں تراجم کیے ہیں اور وہ منزلِ اشاعت سے بھی سرفراز ہو چکے ہیں۔

☆ کچھ لوگ متحدہ ہندوستان کی پنجابی اور آج کے ہندوستان کی پنجابی کو مختلف گردانتے ہیں۔ آپ کے خیال میں تقسیمِ ہند کی شکل میں پنجابی زبان کس طرح کے تغیر وتبدل سے گزری ہے اور تبدیلی کا یہ عمل صرف پنجابی زبان تک محدود ہے؟

☆☆ متحدہ ہندوستان کی پنجابی اور آج کے ہندوستان کی پنجابی واقعی مختلف ہو گئی ہے۔ مغربی پنجاب کی پنجابی میں اردو، فارسی اور مقامی بولیوں کے الفاظ کا نفوذ ہے اور مشرقی پنجاب میں یہاں کی زبانوں کے الفاظ اثر انداز ہو گئے ہیں۔ پنجابی پر لسانی اثر اس لیے اس نوع کا زیادہ ہے کیونکہ پنجاب جو ایک تھا دو ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے اور مختلف النوع عوامل کی زد میں آ گیا ہے بنگال کے دو حصے ہونے کے بعد ممکن ہے بنگالی پر بھی اس نوع کا اثر ہوا ہو۔

☆ آپ کے زمانے میں نظم کا شاعر اور ترقی پسندی لازم وملزوم سمجھے جاتے تھے۔ ہمارے قارئین کو اپنی ترقی پسندی کی بابت کچھ بتلائیے؟

☆☆ تقسیمِ ہند کے آس پاس کے برسوں میں ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ اہلِ ادب کی طرح مجھ پر بھی اس تحریک کا اثر ہوا ہوگا لیکن ۱۹۶۲ء میں اپنے پہلے مجموعہ کلام "میری نظمیں" کی اشاعت کی منزل تک پہنچتے پہنچتے میں اعلان نامے، فارمولے، طے شدہ پروگرام اور مینی فیسٹو سے آزاد ہو چکا تھا۔ میں نے "میری نظمیں" کے پیش لفظ میں کھلے الفاظ میں اپنی پوزیشن کو واضح کیا ہے۔ مجھے انسانی سروکار بہرحال ہمیشہ عزیز رہے ہیں اور یہ سلسلہ شروعات سے آج تک میرے یہاں جاری وساری ہے۔

☆ وقت گزرنے کے ساتھ ترقی پسندوں پر طرح طرح کے الزام، مفادات و باہمی اختلاف کے قصے بھی زبان زدِ عام تھے۔ کیا آپ اس حوالے سے اپنے تجربات اور اپنی پوزیشن کی وضاحت فرمانا پسند کریں گے؟

☆☆ یہ صحیح ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ترقی پسندوں پر طرح طرح کے الزام، مفادات و باہمی اختلاف کے قصے زبان زدِ عام رہے ہیں۔ مینی فیسٹو، اعلان نامے، طے شدہ پروگرام وغیرہ یہ سب ترقی پسند تحریک کا حصہ رہے ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ترقی پسند تحریک کا کردار بھی کافی حد تک ان عناصر سے آزاد ہو چکا ہے۔ میں چونکہ آج تک کسی سیاسی یا ادبی تنظیم کے ساتھ بطور رکن یا عملی ہمدرد کے طور پر وابستہ نہیں رہا اس لیے ان کے نظم وضبط کے قوانین سے آزاد رہا۔

☆ آج کل بڑے بڑے نظریے اور فلاحی عالمی استعمار کی ذہنی اختراع گردانے جا رہے ہیں۔ مارکسی نظریات کی بابت آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

☆☆ عالمی استعمار عام طور پر سوویت یونین اور امریکہ اور ان ملکوں کے متعلقہ نظریاتی مدرسہ ہائے فکر کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ سوویت یونین کے انتشار کے بعد عالمی استعمار کا منبع صرف امریکہ رہ گیا ہے۔ مارکسی نظریات پیداواری اور اقتصادی رشتوں کو انسانی ردِ عمل کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ مارکسی نظریات اپنے آپ میں سیاسی نوعیت کے نہیں ہیں۔ انہیں بعض اوقات ان کی موشگافیوں سمیت حصولِ استعمار اور سیاسی قوت کے استحکام کے مقصد سے استعمال کیا گیا۔ اس میں مارکسی نظریات کے بجائے استعمال کرنے والوں کا قصور تھا۔ مارکسی نظریات کی اہمیت آج بھی حسبِ سابق قائم ودائم ہے۔

☆ نظم ایک عالمی صنفِ سخن ہے اس کی جانب آپ کی توجہ کے اسباب اور آپ کے زیرِ مطالعہ کون کون سے شعراء رہے اور کن کے اثرات آپ کے ہاں تلاش کیے جا سکتے ہیں؟

☆☆ میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز نظم ونثر دونوں سے کیا لیکن نظم یعنی شعر میرا پہلا عشق تھا اس لیے تخلیقی اظہار کے تعلق سے اولیت نظم کو حاصل ہوئی۔ نظم کے علاوہ وقتاً فوقتاً میں غزل میں بھی طبع آزمائی کرتا رہا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے لیکن نظم کو بہرحال فوقیت حاصل رہی۔ اردو زبان کی باقاعدہ تعلیم میں نے صرف آٹھویں درجے تک حاصل کی ہائی اسکول اور کالج میں بی۔اے پاس کرنے میں سائنس کا طالب علم رہا ایم۔اے میں نے انگریزی ادبیات میں پاس کیا۔ اسکول کی سطح کی اردو کی ابتدائی تعلیم کے بعد جب میں نے اردو میں تخلیقی اظہار کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا تو میں نے اردو زبان کا باقاعدہ مطالعہ کیا اور اردو میں زبان وادب کی پوری روایت کو پورے وجود کا حصہ بنانے کی کوشش کی۔ ۱۹۴۸ء کے آس پاس ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء کیفی اعظمی، سردار جعفری اور کچھ دیگر شعراء کے علاوہ حلقہ اربابِ ذوق سے وابستہ شعراء اور کچھ غیر وابستہ شعراء جن میں میراجی، ن۔م۔راشد، مجید امجد، مختار صدیقی، فیض احمد فیض شامل تھے میرے زیرِ مطالعہ آئے اور میں نے اپنے منفرد مزاج کو برقرار رکھتے ہوئے ان کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں محمود جالندھری اور فکر تونسوی بھی اچھے خاصے مشہور شاعر تھے۔ ۱۹۴۸ء سے لے کر جب تک وہ حیات تھے میں ان کے قریب رہا اور ان سے شخصی اوصاف اور ادبی طریق کار سیکھنے کی کوشش کی۔ میرے یہاں اکتسابی ہوا وہ اپنی جگہ اہم ہے لیکن میں نے اخذ تو بہرحال قریبی زندگی کے تجربات اور مشاہدوں سے کیا۔ قریبی زندگی سے سرگرم تعلق میری شاعری کے بنیادی محرکات کا حصہ ہے۔

☆ کچھ لوگ آپ کو (RILKE) سے متاثر ہونے کا طعنہ بھی دیا کرتے ہیں؟

☆☆ میں نے ہندوستانی ادب اور مغربی ادب کے نظم ونثر کے اعلیٰ نمونوں اور شاہکاروں کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس مطالعہ کی روشنی میں ایک ہمہ

جہت تاثر سے روشناس ہوا ہوں میں نے RILKE کا مطالعہ ضرور کیا ہے لیکن RILKE سے متاثر ہونے کا طلسم صرف آپ کی وساطت سے مجھ تک پہنچا ہے اور پہنچ ہی رہا ہے۔

☆ ایک طبقہ آپ کو اسلوب اور مفہوم کی کلیت کا حامل یعنی (ORGANIC WHOLE) کا حامل گردانتا ہے جبکہ دوسرے طبقے کے خیال میں آپ کا کلام دل میں اترنے والا نہیں؟

☆☆ اگر میں اسلوب اور مفہوم کی کلیت یعنی (ORGANIC WHOLE) کا حامل ہوں تو یہ خیال بعید از قیاس ہے کہ میرا کلام دل میں اترنے والا نہیں۔ حال ہی میں فرانس کی ایک طالبہ نے اپنا حرفِ ستائش میری نذر کیا ہے اس اعتراف کے ساتھ کہ میرا کلام جو ترجمے کی وساطت سے اس تک پہنچا ہے وہ اس کے دل میں اترا ہے اور وہ اس سے متاثر ہوئی ہے بہت سے اجنبی مداح بھی مجھے حرفِ ستائش سے نوازتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے میرا کلام جزوی طور پر یا کلی طور ان کے دل میں اترا ہوگا۔

☆ کچھ لوگ آپ کو خنک اور جذبات سے عاری تخلیق کار بھی گردانتے ہیں؟

☆☆ اگر میں خنک اور جذبات سے عاری تخلیق کار ہوں تو میں تخلیق کار ہی نہیں ہو سکتا اگر میں تخلیق کار ہوں (جس کو پچھلے ساٹھ برسوں میں قارئین و سامعین اچھی خاصی تعداد میں قبول کر چکے ہیں) تو پھر میں جذبات سے عاری نہیں ہو سکتا کیونکہ تخلیق کاری کا سارا عمل جذبوں کا عمل ہے یہاں تک کہ الیٹ کے مطابق الفاظ کو بھی جذبوں میں ڈھالنے کا عمل ہے۔

☆ آپ کے ہاں تجربے اور مشاہدے کی طلب اور تڑپ کا بھی بہت چرچا ہے مگر دوسری طرف آپ کو سادھو سنت کی طرز کا انسان بھی گردانا جاتا ہے؟

☆☆ اس سوال سے پہلے والے سوال میں کچھ لوگوں کے حوالے سے خنک اور جذبات سے عاری جیسے الفاظ مجھ سے منسوب کیے گئے ہیں۔ اگر میرے ہاں تجربے اور مشاہدے کی طلب اور تڑپ موجود ہے تو میں خنک اور جذبات سے عاری کیسے ہو سکتا ہوں۔ ہر انسان کی طرح میں نہ فرشتہ نوری ہوں اور ناری۔ حیات اور لمس کی جادوگری سے اکثر خنک وقت کی حد پار کر جاتا ہوں اس لیے اس جنم یا اگلے جنم میں بھی میرے سادھو سنت بننے یا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

☆ بازارِ حسن کا طواف ایک تخلیق کار کے لیے تجربے کی مانند ہوا کرتا ہے مگر وہاں سے واپسی پر تکیے میں منہ چھپا کر رونا کس طرح کی آگہی کی نشان دہی کر رہا ہے؟

☆☆ میں ہر تخلیق کار کی طرح حسن کا پرستار تو ہوں کہ حسن کا خریدار ہونا یا بننا میرا شعارِ زندگی قطعی طور پر نہیں ہو سکتا۔ اگر میں تکیے میں سر چھپا کر رویا تھا تو میں ہی رونے والا تھا اور میں ہی رونے کے واقعہ کا شاہد۔ فکر تونسوی شاعر ہونے کے علاوہ طنز و مزاح کے بھی شہسوار تھے۔ کبھی کبھی کچھ الفاظ کا استعمال وہ زیبِ داستاں کے طور پر بھی کرتے تھے۔

☆ اچھے شعر پر داد دینا اعلیٰ مذاق کی دلیل ہے مگر داد دیتے ہوئے آبدیدہ ہو جانا یعنی مقابل کا منہ چوم لینا بھی عجب لگتا ہے کہیں اس کے ڈانڈے بھی آپ کی نفسیاتی کشمکش سے تو نہیں ملتے؟

☆☆ جذباتی ہونا یا جذباتی طور پر سفر کی کائنات میں شامل ہونا کوئی بری بات نہیں۔ اس کیفیت کا اظہار محتاط یا غیر محتاط دونوں صورتیں اختیار کر سکتا ہے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں کبھی جذبات کے واشگاف غیر شائستہ اظہار کا مرتکب نہیں ہوا۔ میں بہر حال کسی نفسیاتی انتشار کا شکار نہیں ہوں۔ اور نہ ہی اس سلسلے میں کسی کشمکش سے میرے کسی فعل کے ڈانڈے ملتے ہیں۔

☆ کچھ لوگ آپ کی نظموں کو ذاتی المیوں سے تعبیر کرتے ہیں مگر اکثریت آپ کی المیوں سے بے خبر ہے؟

☆☆ اگر کوئی نظم ذاتی المیوں کے ذکر تک محدود ہو جاتی ہے تو وہ شعر کے دائرے سے باہر ہو جاتی ہے۔ اگر میری کوئی المیاتی ہے بھی تو میری نظم بطور نظم اگر المیاتی کی جسمانی حدود سے ماورا نہیں جاتی تو وہ نظم نہیں ہو سکتی۔ میں الیٹ کی اس رائے کو صحیح مانتا ہوں کہ شعر کی سوانحی حدودِ ذات سے ماورا جانے کی قوت اس کی اصل یعنی شعر کی اصل معروضی قوت کی پہچان ہے اچھی شاعری معروضی انداز میں سوانحی تفصیل سے ماورا اپنا کارِ تخلیق کرواتی ہے۔

☆ آپ کو ازلی معمہ کا شاعر کیوں گردانا جاتا ہے؟

☆☆ حیات و مرگ اور کائنات ازلی اور ابدی معمہ ہے۔ اگر میں اس معمے کا شاعر ہوں تو یہ میرے لیے باعثِ افتخار ہے۔

☆ احباب نے آپ کے سر ادب کی ماہیت دریافت کرنے کا سہرا تو باندھ دیا مگر اس کی وضاحت اور صراحت بالکل نہیں کی گئی کہ آپ کس قسم کی ماہیت دریافت کرنے میں مصروف و مشغول ہیں؟

☆☆ ادب کی ماہیت دریافت کرنے کے لیے ہندوستان اور پاکستان میں اور دیگر ممالک میں بہت سے دانشور موجود ہیں۔ میں بطور شاعر بھلا کیوں یہ مصیبت اپنے سر لوں گا۔ بطور شاعر میں صرف زندگی کے جملہ امور اور حقائق اور ان کی غیر دریافت شدہ ماہیت کے ہنگام میں زندگی کی کوئی کرن تلاش کر رہا ہوں۔

☆ وقت گزرنے کے ساتھ آپ کی نظموں میں گرد و پیش سے زیادہ نامانوس اور پیچیدہ مسائل ابھارتے نظر آرہے ہیں؟

☆☆ وقت گزرنے کے ساتھ حیات و کائنات کے تمام تر مسائل پہلے سے کہیں زیادہ نامانوس اور پیچیدہ ہو گئے ہیں میں بطور شاعر چونکہ عصری زندگی اور

گروہ بندی سے منسلک ہوں اس لیے میرے ہاں وہاں سے ماخوذ اور پیچیدہ مسائل کا سر ابھارتے نظر آنا عین فطری ہے۔

☆ ایک زمانے میں آپ فرمایا کرتے تھے کہ الفاظ اور معنی عدم توازن کا شکار ہیں۔ اول وہ کون سے حالات تھے جس کے باعث آپ یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوئے دوم یہ کہ آج آپ کی سوچ صرف الفاظ معنی بلکہ مجموعی طور پر کس پیرو سوچ کی حامل ہے؟

☆☆ میں عام سمجھ میں آنے والے انداز میں بات کرتا ہوں۔ میں یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں وہ کون سا زمانہ تھا جب میں نے کہا تھا کہ الفاظ اور معنی عدم توازن کا شکار ہیں اصل بات یہ ہے کہ الفاظ اور معنی ہمیشہ عدم توازن کا شکار ہوتے ہیں۔ الفاظ اور معنی کے لیے عدم توازن کا کوئی مخصوص زمانہ نہیں ہے فی الوقت میری کوشش یہ رہتی ہے کہ عدم توازن کی صورت حال میں بے حد محدود توازن قائم کرنے کی کوشش جاری رکھی جائے۔

☆ آپ کو روایت کا امانت دار بھی شدومد سے گردانا جاتا ہے مگر ہم اس باب میں بھی تشفی کو رہے ہیں کہ آپ کس روایت کے امین ہیں؟

☆☆ انسانی معاشرے میں انسانی ہمدردیاں کہیں کہیں جزیروں کی طرح آباد ہیں اگر میں کسی روایت کا امانت دار ہوں تو انسانی ہمدردیوں کی تمازت انگیز لمس کا اور ان کی حیات فروز کیفیتوں کی روایت کا امانت دار ہوں۔

☆ آپ کے انحرافی رویوں کا ایک زمانے میں خوب چرچا رہا ہے مگر کسی نے ان چیزوں کی نشاندہی کبھی نہ کی جن سے آپ انحراف کرتے رہے ہیں؟

☆☆ میں ہمیشہ ”کہنے“ سے انحراف کرتا رہا اور کرنے کو ”کہنے“ پر ترجیح دیتا رہا۔ کچھ شاعر انسانی تجربے کو بیان اور اعلان کی صورت میں پیش کرتے ہیں جبکہ دوسرے انسانی تجربے کو ارفع تر سطح پر تجسیم، استعارے، علامت اور تخلیقی پیکر کے اعجاز سے جسمانی حدود سے ماورا وسعت بال و پر عطا کرتے ہیں۔

☆ نظم کے اکثر شعرا غزل کے بارے اچھی رائے نہیں رکھتے مگر غزل کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔ آپ کی غزل بھی نظم کی طرح الگ مقام کی حامل ہے مگر غزل کی بابت آپ کی رائے ریکارڈ پر آنا لازمی ہے؟

☆☆ میں نظم کے ایسے شعراء کی صحیح تعداد کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن نظم کے تین ایسے شعراء کو جانتا ہوں جو غزل کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے اور غزل کہتے بھی نہیں۔ یہ تین شعراء ہیں۔ اختر الایمان، منیب الرحمٰن اور ستیہ پال آنند۔ یہ تینوں شاعر کھلم کھلا اور مختلف موقعوں پر غزل کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ لیکن ان میں سے پہلے دو کی کچھ نظموں کو دیکھ کر یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ غزل کی ساخت سے زیادہ قریب ہیں بظاہر نہیں عنوان دے کر نظم کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔ ستیہ پال آنند کسی زمانے میں غزل میں طبع آزمائی کرتے تھے لیکن فی الوقت وہ صنف غزل کے سخت مخالف ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نہ تو کلیم الدین احمد کی طرح غزل کو نیم وحشی صنف سخن سمجھتا ہوں اور نہ ہی غزل کی گردن مارنے کے لیے آنند کی طرح موضوعاتی اور قافیہ پیمائی کے جبر کو غزل کے ساتھ منسوب کرتا ہوں۔ غزل سراسر تہذیبی اظہار کی صنف سخن ہے اور اس کی دلآویزی اور کشش ہمیشہ قائم و دائم رہے گی یہ الگ بات ہے کہ انفرادی امتیاز حاصل کرنے کا خواب بہت کم غزل کہنے والے شعراء کے ہاں دائرہ تعبیر کی حدود تک پہنچ سکا۔ یہ آپ کی فراخدلی ہے کہ آپ میری غزل کو بھی میری نظم کی طرح الگ مقام کی حامل سمجھتے ہیں۔ میں اپنے انکسار میں خوش ہوں۔

☆ مشاعرے اردو زبان و ادب کی روح بلکہ جان ہیں جبکہ آپ انہیں شاعری کے لیے مہلک گردانتے ہیں حالانکہ انہی مشاعروں نے تقسیم ہند کے بعد دونوں جانب کے اہل قلم کے درمیان زنجیر کا کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیا تھا؟

☆☆ اچھا اور بڑا شعر اچھی اور بڑی نظم تہہ در تہہ کیفیات اور معانی کے حامل ہوتے ہیں۔ مشاعرہ شعر کی اس نوع کی بھرپور ترسیل کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ اور جب شعراء شعر پیش کرتے وقت اپنی پیش کش میں اداکاری اور گلوکاری شامل کر دیتے ہیں تو مشاعرے کی فضا اور معیار دونوں مجروح ہو جاتے ہیں۔ یہ صورت حال مہلک ہے یا قابل داد میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ صحیح ہے مشاعرے نے تقسیم کے بعد دونوں جانب کے اہل قلم کے درمیان زنجیر کا کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ہے۔ اہل قلم میں چونکہ نثر نگار بھی ہوتے ہیں اس لیے ان کے لئے بھی ایسے اداروں یا INSTITUITIONS کی ضرورت ہے جو ان کے درمیان زنجیر کا کام خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں۔

☆ آپ کا شمار آزاد نظم کے حامیوں میں کیا جاتا ہے۔ آزاد نظم برصغیر کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہے کیا نیز آزاد نظم کا مستقبل اردو ادب میں کیا ہے؟

☆☆ میں آزاد نظم کا حامی ہی رہا ہوں کیونکہ میں نے آزاد نظم میں ہی حاوی انداز میں تخلیقی اظہار کیا ہے لیکن میں آزاد نظم اور صرف آزاد نظم کا ہو کر نہیں رہا میں نے آزاد نظم کے علاوہ پابند نظم، معرا نثری نظم اور جاپانی اصناف سخن۔ ہائیکو، تانکا، سنریو وغیرہ کے علاوہ صنف غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اگر آپ رسائل کی ورق گردانی کریں تو آپ دیکھیں گے ان دنوں بیشتر اردو شعراء آزاد نظم کے فارم میں ہی اپنا کلام پیش کر رہے ہیں۔ کچھ مکمل رکن سے مصرع شروع کرتے ہیں اور متعلقہ بحر کے زحاف پر مصرع ختم کرتے ہیں کچھ مصرع مسلسل یعنی RUNON LINE کی صورت میں نظم کی ڈرافٹنگ کرتے ہیں ستیہ پال آنند اکثر کامیاب انداز میں RUNON LINE سے استفادہ کرتے ہیں کچھ اور بھی HYBRID صورتیں ہو سکتی ہیں۔ نثری نظم مکمل طور پر آزاد نظم کی مثال ہے آزاد نظم آہستہ آہستہ شعری محفلوں اور مشاعروں میں بھی جگہ پانے لگی ہے لہٰذا آزاد نظم کے مستقبل کے بارے میں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

☆ کیا آپ ابتدا سے اب تک اچھی اور غیر فانی نظمیں کہنے والے تخلیق

کاروں کے ناموں سے باخبر کر سکے ہیں۔ نیز ان نظموں کا مستقبل برصغیر سے باہر بھی کچھ ہے یا نہیں؟

☆☆ کسی تحقیقی مشن سے گزرے بغیر فوری طور پر میں جن تخلیق کاروں کے نام لے سکتا ہوں ان میں اقبال، فیض احمد فیض، ن۔ م۔ راشد، میراجی، تصدق حسین خالد، مجید امجد، وزیر آغا، سردار جعفری، یحییٰ اعظمی، مخدوم محی الدین، شہریار، گلزار، ستیہ پال آنند شامل ہیں۔ مزید غور و خوض کے بعد کچھ اور نام بھی اس فہرست میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ اقبال، فیض، راشد، مجید امجد، وزیر آغا، سردار جعفری، یحییٰ اعظمی، مخدوم محی الدین، شہریار، گلزار، ستیہ پال آنند اپنے کلام کے ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں میں تراجم کے ذریعے ان زبانوں کے قارئین تک پہنچ چکے ہیں اور ان زبانوں کے قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ خاکسار کی منتخب نظموں کے تراجم بھی بہت سی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں جوں جوں تراجم کا دائرہ وسیع تر ہوگا اردو شعرا کا حلقہ قارئین بھی اسی تناسب سے وسیع تر ہو جائے گا۔ آپ نے غزل کے بارے میں نہیں پوچھا اقبال، حافظ (پیام میں نے انگریزی تراجم کے تحقیق سے شامل کیے ہیں) فیض کا معاملہ الگ ہے ان کو اچھے مترجمین نصیب ہوئے۔ باقی کے کامیاب غزل گو شعرا کو اچھے مترجمین کا انتظار کرنا ہوگا۔

☆ اردو افسانے سے آپ کی ملاقات کس تخلیق کار کے ذریعے ہوئی اور آپ نے پہلا افسانہ کس جذبے اور احساس کے تحت تحریر کیا؟

☆☆ میں نے ادبی سفر کا آغاز نظم و نثر دونوں سے کیا تھا شروع میں میرے دو ایک افسانے درمیانہ درجے کے رسائل میں شائع بھی ہوئے تھے لیکن صنف نظم چونکہ مجھ پر حاوی ہو گئی اس لیے ۱۹۶۲ء تک میں کلی طور پر نظم اور دیگر شعری اصناف کی تخلیق کی طرف متوجہ رہا۔ فکشن کا مطالعہ، اردو فکشن اور مغربی فکشن دونوں کا مطالعہ، شعری اظہار کے ساتھ ساتھ جاری رہا۔ اردو زبان کے جن افسانہ نگاروں کا میں نے انہماک اور بھرپور دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا ان میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، غلام عباس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میری کسی افسانہ نگار کے ساتھ ملاقات اگر ہوئی بھی تو بہت سرسری۔ یہ میرا اپنا جذبہ تخلیق تھا جس نے مجھے افسانہ لکھنے کی جانب راغب کیا۔ میں نے ایک کے بعد ایک اور اب تک چودہ افسانے لکھے جن پر مشتمل مجموعہ ۱۹۸۲ء میں آنکھیں اور پاؤں کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ میرا پہلا افسانہ اور بعد کے بیشتر افسانے قریبی زندگی کے مشاہدے اور تجربے سے منسلک ہیں۔ آنکھیں اور پاؤں کی اشاعت کے بعد میں ایک بار پھر نظموں کی جانب لوٹ گیا۔ لمبے وقفے کے بعد میں نے ''نئے جوتے اور مٹی کا بوجھ'' کے عنوان سے دو نئے افسانے لکھے۔ ممکن ہے ''آنکھیں اور پاؤں'' کے نئے ایڈیشن میں یہ افسانے بھی شامل ہوں گے۔ میرے افسانے ''کنوئیں'' کی پذیرائی وسیع پیمانے پر ہوئی ہے۔ انگریزی کے علاوہ اس افسانے کے تراجم کم و بیش تمام ہندوستانی زبانوں کے علاوہ اطالوی اور جاپانی میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

☆ آپ اپنے افسانوں میں سوالات بڑی شد و مد سے اٹھاتے ہیں مگر اُن کے جوابات اس طریقے پر نہیں دیتے جس کے باعث قاری کی تشفی ہوتی ہے یا نہیں؟

☆☆ میں سوالات نظموں اور افسانوں دونوں اصناف میں اٹھاتا ہوں۔ جوابات فراہم کرنا فنکار کا کام نہیں ہے اگرچہ پریم چند کی فکشن میں اور کچھ ترقی پسند افسانہ نگاروں کی فکشن میں سوالات کے جواب اور مسائل کے حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فنکار کا اصل کام قاری میں تجسس اور تحریک پیدا کرنا ہے تا کہ وہ سوالات اور مسائل کے ساتھ براہ راست نبرد آزما ہو سکے۔

☆ آپ نے افسانوں میں مختلف آہنگ اور پیرایے اپنائے ہیں اگر یہ عمل دانستہ ہے تو اس کے فوائد بتلایے وگرنہ اس کی وجوہات جاننا قاری کا حق بنتا ہے؟

☆☆ جی ہاں! میں نے افسانوں میں متعلقہ صورت حال کے مطابق آہنگ اور پیرایے کی صورتوں کو وضع کیا ہے تا کہ قاری پڑھتے وقت ذہنی اور جذباتی شرکت سے اپنی صوابدید کے مطابق ترسیل کے مراحل طے کر سکتا ہے اس کا سیدھا سادا بندھا ٹکا کوئی سکہ بند فارمولا نہیں ہے۔

☆ تنقید کی جانب آپ کی توجہ کب اور کیونکر ہوئی نیز آپ نے کن تنقید نگاروں کو پڑھا ہے اور آپ تنقید کے کس دبستان سے منسلک ہیں؟

☆☆ ۱۹۴۸ء میں اپنی نظم ''اکیلی'' کی اشاعت کے آس پاس کے برسوں میں میں اپنا کام کلام احمد ندیم قاسمی، فکر تونسوی اور مخمور جالندھری پر INFLICT کیا کرتا تھا ان مشاہیر کے نام میں جو خط لکھتا تھا ان میں جو کچھ میرے زیر مطالعہ آتا تھا اس پر اپنی رائے بھی دیتا تھا۔ ان کا رد عمل میرے لیے بڑا حوصلہ افزا ہوتا تھا۔ جوں جوں میرے مطالعے کا دائرہ وسیع ہوتا گیا میں نے تحریری طور پر مضامین کی صورت میں بھی اپنی رائے کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ میں کسی تنقیدی دبستان سے وابستہ نہیں ہوں۔ میری تنقیدی تحریریں اور مضامین زیادہ تر عصری ادب کے مطالعوں پر مبنی ہیں۔ میں نے تمام ملکی، غیر ملکی اہم ناقدین کو بہ حد مقدور پڑھا ہے اور سیکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

☆ کچھ لوگ اردو زبان اور اردو ادب کے زوال کا ذمہ دار ناقدین کے جانب دارانہ رویے کو ٹھہرایا کرتے ہیں۔ آپ کی رائے اور پوزیشن اس حوالے سے کیا ہے؟

☆☆ کیا اردو زبان اور اردو ادب واقعی زوال کی زد میں ہیں۔ اگر مجموعی طور پر صورت حال زوال کی صورت حال ہے تو اس زوال کو چند ناقدین کی

تحریروں کے ساتھ منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ جب معاشرہ زوال پذیر ہو جاتا ہے تو تمام ملکی ادارے اور ثقافتی عنصر بے اور عملی کام زوال کی زد میں آ جاتے ہیں۔ یہ بڑا پیچیدہ معاملہ ہے اس لیے چند فرد کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

☆ آپ کی عمر میں اکثر احباب فراق ماضی میں گرفتار ہوا کرتے ہیں جبکہ آپ ماضی کی زنجیروں سے رہائی کے خواہش مند ہیں۔ کونسا ماضی' ماضی قریب کہ ماضی بعید؟

☆☆ عملی طور پر میں لمحہ موجود میں ہی ماضی اور مستقبل کی سیاحت کرتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ میں نے کسی بھی نوعیت کے ماضی کا کوئی بھاری بھر کم گٹھڑ اسر پر نہیں اٹھا رکھا۔ بہر حال میں خوش ہوں کچھ مسائل کے باوجود مجھے کافی حد تک ذہنی اور جسمانی آزادی میسر ہے۔

☆ آپ کی نسل کے بعد اردو زبان اور اردو ادب کا مستقبل بالخصوص بھارت میں کس طرح نظر آتا ہے؟

☆☆ اردو زبان اور ادب کی گردش میں کوئی کمی نہیں آئے گی لیکن اس گردش سے براہ راست فیضیاب ہونے والے لوگ تعداد میں کم ہوتے جائیں گے لیکن بہت اہم کے ذریعے اردو زبان اور اردو ادب دوسری زبانوں میں اپنا حلقہ احباب قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ فلمی میڈیا نے ہندوستان میں اردو زبان کی ترویج و ترسیل میں بہت بڑا رول ادا کیا ہے۔ امید ہے معمولی ردوبدل کے ساتھ یہ عمل آئندہ بھی جاری رہے گا۔

☆ بھارت کے الیکٹرانک میڈیا نے اچانک اور ڈرامائی طور پر جس قدر تیزی سے اردو طرز، لب و لہجہ اور تہذیب و تمدن کو اپنایا ہے آپ کے خیال میں اس کے پیچھے کیا مقاصد پوشیدہ ہو سکتے ہیں؟

☆☆ فلمی میڈیا کا ذکر میں کر چکا ہوں ٹی وی کا دائرہ اثر فلم سے بھی وسیع تر ہے فلم اور ٹی وی سے وابستہ ادارے خالصتاً کاروباری ادارے ہیں۔ اردو طرز، لب و لہجہ اگر ناظرین اور سامعین کی تعداد بڑھانے میں مدد کرتا ہے تو وہ اس سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

☆ اہل دانش اسے بھارتی حکمرانوں کی علاقائی سیاست اور عوام کے ذہنوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش سے منسوب کرتے ہیں؟

☆☆ کون اہل دانش اور کون سے بھارتی حکمران۔ اصل دانشور وہ ہوتا ہے جو جہاں تک ممکن ہو سکے ہر قسم کے تعصب سے اوپر اٹھ کر معاملات پر نظر ڈال سکے اور معروضی انداز میں نتائج اخذ کر سکے۔ اس معیار کا دانشور اب کہاں ملے گا۔ بھارت جمہوری نظام کے باعث مستقل طور پر کسی ایک حکمران کا تاج نہیں ہے۔ حکمران بدلتے رہتے ہیں اور ان کے مقاصد بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جب طاقت ایک قسم کے حکمرانوں کے ہاتھ میں آ جاتی ہے تو تاجروں اور حکمرانوں کے درمیان باہم دگر مقاصد کی وجہ سے انتہائی پست سطح کی جنگ شروع ہو جاتی ہے یہ سلسلہ جاری ہے۔ ظاہر ہے اس عمل میں علاقائی سیاست کا بھی دخل ہے۔ عوام کے ذہنوں پر کون کس انداز سے اثر انداز ہوتا ہے یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔

☆ ہند و پاک کے اہل قلم بلکہ عوام کے درمیان پائیدار دوستی' امن اور محبت کے رشتے استوار ہونے کے امکانات کب تک اور کتنے فیصد ہیں؟

☆☆ اس تعلق سے تاریخ اور تناسب مقرر کرنا ناممکن ہے۔ کوشش بہر حال سچے دل سے جاری رہنی چاہیے۔ سسی فس (SISY PHUS) کا کرب کوئی کہانی کرب نہیں ہے اس کرب سے گزرنا مسلسل اور متواتر گزرنا سسی فس کا مقدر ہے۔ ہند و پاک کے اہل قلم کا بھی یہی مقدر ہے۔

☆ عالمگیر تہذیبی فساد اور اس کے تجربے کی کڑیاں کب کہاں اور کس طور ملائی جا سکتی ہیں اور ان کے لئے کیا کچھ ظہور میں آنے کو بیتاب ہے؟

☆☆ عالمگیر تہذیبی فساد نے انتشار اور ٹوٹنے بکھرنے کی فضا پیدا کی ہے جس میں ٹوٹنے بکھرنے کا عمل روز افزوں ترقی پر ہے۔ یہ دور ہجوم تغیرات کا دور ہے اور اس دور میں تغیرات کی رفتار پہلے سے کئی گنا تیز تر ہے۔ تمام بڑی اکائیاں چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بٹ رہی ہیں۔ ہر ذرہ مرکز سے ٹوٹ کر آزاد ہونا چاہتا ہے اپنی منفرد پہچان پر اصرار کر رہا ہے۔ ٹافلر (TOFFLER) کا خیال ہے یہ چھوٹی چھوٹی اکائیاں اپنی پہچان بنانے کے بعد باہمی روابط کے لیے نئے سرے سے ایک دوسرے کی طرف رجوع کریں گی اور باہمی رشتوں کا قربت امکان ایک بار پھر دائرہ امکان میں آ جائے گا۔

☆ آخر میں آپ ہمارے قارئین کو اپنی خواہشات' ارادے اور منصوبوں کی بابت بتلائیے جو آپ کے دماغ' قلم اور میز پر ترتیب پا رہے ہیں؟

☆☆ زوال عمر میں اشیا کو دیکھنے کا تناظر بدل جاتا ہے۔ میرے پاس لکھنے پڑھنے کی بجائے ایک مخصوص میز ہے۔ دماغ اور قلم بھی کچھ کرنے کے لیے بے قراری کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ لیکن میں لکھنے پڑھنے کے کسی مخصوص میز یا قلم کا تابع نہیں ہوں جب اندر سے آواز آتی ہے تو کسی بھی مناسب جگہ پر بیٹھ کر کسی بھی مناسب قلم سے لکھ سکتا ہوں۔ وہ جو میری مخصوص لکھنے کی میز ہے اس پر عام طور پر باہم دگر کتابوں، کاغذوں اور پرچوں کا ہجوم رہتا ہے اس میز پر فساد کی وہی صورت ہے جس کا عالمگیر فساد کے تعلق سے آپ نے اپنے آخری سوال میں ذکر کیا ہے۔ میں وقتاً فوقتاً فساد کی اس صورت حال میں ترتیب و توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں اور کسی حد تک کامیاب بھی ہو جاتا ہوں۔ میرے وجود میں بھی ایک سسی فس ہے جو متواتر اور مسلسل مجھے سعی مسلسل کے لیے آمادہ کرتا رہتا ہے۔ ہر تعمیر میں اگرچہ خرابی کی صورت مضمر ہے لیکن ہر خرابی کی صورت میں بھی امکان تعمیر موجود ہے۔ زندہ رہنے کے لیے لہو گرم رکھنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہوں۔

# چھوٹو خوشو بڑا آدمی

فکر تونسوی

بلراج کومل شریف ہے۔

بلراج کومل ذہین ہے۔

اگر یہ دونوں خاصیتیں ایک شخص میں اکٹھی ہوجائیں تو ہم اُسے استثناء کہہ کر درگزر کردیتے ہیں۔ کیا کیا جائے مستثنیات ہمارے بس کی بات تو نہیں۔

لیکن عام طور پر ان دونوں کا ملاپ ایک شخصیت کا المیہ بن جاتا ہے کیونکہ شریف آدمی آسانی سے بیوقوف بن جاتا ہے اور ذہین آدمی آسانی سے بیوقوف بنا سکتا ہے۔ اگر بیوقوف بننے اور بنانے کا یہ تضاد بلراج کومل میں موجود ہے تو بیچارہ ایک انسان بیاس کا المیہ ہے۔

کیا وہ استثناء ہے؟

کیا وہ مثالی ہے؟

اس سوال کی کھوج میں بلراج کومل کے باطن کو ذرا اور قریب ہوکر دیکھا تو یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ وہ بیک وقت شریف اور ذہین تو لگتا ہے مگر درمیان میں وہ المیہ غائب ہے یعنی پورا فارمولا ہی غلط ہوگیا۔ وہ بیوقوف بن سکتا ہے مگر اُسے بنانا کوئی نہیں ہے۔ وہ بیوقوف بنا سکتا ہے مگر کسی کو بناتا نہیں اس کی طبیعت ادھر نہیں آتی۔

البتہ یہ اس تضاد کا المیہ ضرور ہے کہ وہ بلراج کومل کی شخصیت کا حصہ بنا تو اپنی اور جنگلی سی کھوج چھوڑ کر کی شرافت میں کیا تُک! اگر کوئی بیوقوف بننا پسند ہی نہ کرے۔ اور ایسی ذہانت بھی کیا ضرور جس سے کوئی بیوقوف بن ہی نہ سکے۔ اس سے تو بہتر تھا وہ نہ شریف ہوتا نہ ذہین۔ بس پیدا ہوتا۔ کھاتا پیتا پھر بوڑھا ہوتا اور دنیا سے چلا جاتا۔

سوچا بلراج کومل کم نصیب ہے۔ اس کا خمیر اٹھانے میں نیچر سے ضرور کہیں کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ کیا یہ بات بھی ناقابلِ برداشت ہے کہ کچھ غلطیاں منصوبہ بند ہوتی ہیں۔

مگر منصوبے میں ایک تیسری چیز بھی شامل ہوگئی۔ شاعری اور شاعری بھی وہ جس کا افق ایک پھر پڑا ہوا دلدل ہے۔ شرافت، ذہانت اور شعریت کی یہ تکون؟ وہ المیہ تو غائب ہوگا اس تکون میں سے ایک بلراج کومل وجود میں آتا ہے اور ظاہر ہے کہ پھر اس کی شخصیت مثالی ہونے کے باوجود مثالی نہیں رہتی۔ اس تکون کو ہم کوئی نام نہیں دے سکتے۔ زیادہ سے زیادہ اسے بلراج کومل کہہ سکتے ہیں۔

وہ حماقت کی حد تک جذباتی ہے۔ ذہانت کے باوجود جذباتی ہے اور شعریت کے باعث تو جذباتی ہے ہی، چنانچہ جذباتیت کے اس اتحادِ ثلاثہ کے سبب اُسے سمجھنے میں اکثر کنفیوژن پیدا ہوا۔ لیکن جب بھی دو چار منٹ کے لیے ہی سہی بلراج کومل سے ملاقات کی کنفیوژن ہیٹ کافور ہوا۔ یہ کافوریت بھی کچھ میں نہ آسکی۔ مگر سمجھنے کی ضرورت بھی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ یہ کیا؟ یہ کیوں؟ یہ کیسے؟ بلراج کومل کے پاس بیٹھتے ہی مرجاتے ہیں۔ بس ایک ہی لہر آتی جاتی رہتی ہے کہ اس شخص سے پیار کیا جائے۔ پیار لیا جائے۔ پیار دیا جائے۔

یہ شاید ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے جب لاہور میں بلراج کومل سے ملاقات ہوئی اور آج ۱۹۷۹ء کا سن ہے جب بھی ہم دونوں کی بدقسمتی سے اور بلراج کومل شاعری کی خوش قسمتی سے بدستور زندہ ہیں۔ زندہ رہنے کی ہی ٹریجڈی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے بدستور ملتے رہتے ہیں اور اگر نہ بھی ملیں، مہینوں نہ ملیں تو بھی ایک دوسرے کے اندر زندہ رہتے ہیں۔ گھنٹوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش بیٹھے رہیں لیکن گفتگو جاری رہتی ہے۔ میں یہاں ایک دوسرے سے عشق کا پروپیگنڈہ نہیں کررہا کیونکہ میں ہی نہیں عشق تو اس سے بھی کرتے ہیں۔ الف سے ی تک بھی۔ پورا حروفِ تہجی اس کا متوالا ہے۔ وہ بھی جو اس کی شاعرانہ علامتوں کو اپنی گرفت سے بالا سمجھتے ہیں اور وہ بھی جو اس کی نظمیں جھوم جھوم کے سناتے ہیں۔ (بلکہ پڑھیں۔ جب بھی جھومتے ہیں)

مگر میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ چونتیس سال کا یہ عرصہ جس کے دوران ہمارے زندگی کی پچاس تہوں میں سے ایک پورا طوفان گزر گیا۔ پورا بلراج کومل گزر گیا اور فکر تونسوی تو اپنے ہی ہاتھوں سے آپ نکل کر گزر گیا۔ مگر پھر بھی ہم ایک دوسرے کی لگن سے نجات نہیں پاسکے۔ کیوں نہیں پاسکے سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ کبھی کبھی غصہ ضرور آیا ہے کہ۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ کہ یہ بھی عجیب شخص ہے لگن کی اتنی طویل استقامت! بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ کوئی تو کہے بلراج کومل تو گُس ہے یا ان سُن ہے یا گوار ہے۔ اور اگر کوئی نہیں کہتا تو مایوسی پیدا ہوتی ہے غصہ کی اٹھتا ہے۔

ان دنوں میں لاہور کے ماہنامہ "ادبِ لطیف" میں متعین تھا۔ ایڈیٹری بھی کرتا تھا، جھاڑو بھی دیتا تھا (یہ بہرحال بلند مرتبہ جس کو ہل گیا) اچانک ایک دن بلراج کومل دفتر میں داخل ہوا۔ ان دنوں یہ دفتر ادب کا قبلہ و کعبہ سمجھا جاتا تھا۔ اور میں اس کا مجاور بن کر بیٹھا تھا۔

بلراج کومل آنکھوں میں کچھ سپاپن لئے سہمے پن میں گھلا ہوا کچھ متحیر۔ مگر پیشانی پر باطنی اعتماد کی لکیر۔ بولا "تیرہ روز پہلے آیا ہوں شاعری کرتا ہوں۔"

میں نے مصنوعی عظمت سے جس کا چلن ادبی اداروں میں عام رواج تھا، کہا "شاعری کوئی بری چیز نہیں، ادبِ لطیف ہے۔ نظم بھیجے جائیے معیار پر پوری اتری تو شائع ہوجائے گی"۔

یوں لگا، یہ جواب اُسے غیر شریفانہ لگا۔ شرافت بلراج کومل کی جسم

جسارت کی کمزوری ہے۔ مجھے اس کے جسم جسارت پر رحم آ گیا۔ نظم کو فائل میں رکھنے پر وہ احتجاجاً تڑپ اٹھا۔

''حضور! آپ اسے ملاحظہ تو کر لیجئے۔''

''کوئی نیا تخیل؟ چونکا دینے والا؟''

''نظم ہی ہو لے گی۔''

بلراج کومل کے لہجے میں ایک چونکاہٹ تھی۔ وہ نرم مگر سنگم، اور پھر میں نے نظم کا پہلا مصرعہ پڑھا، دوسرا اور پھر تیسرے پر کہا ''آپ اس دوسری کرسی پر آ جایئے۔ جس کرسی پر بیٹھے ہیں، اس پر دھول جمی ہے۔''

وہ متانت سے مسکرایا۔ نظم بن کر بولنے لگا اور پھر چند منٹ بعد جیسے مدھ ملائی لہر بن کر جیسے اندر اترتا گیا۔ اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا

''کیا آپ کل بھی مجھ سے مل سکیں گے۔''

اس کی آواز میں اپنائیت کی ایک لہر ابھری، یہ وہی لہر تھی جو دوسروں کو پہلی نظر میں ہی اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ آواز، جس میں غیریت کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔

چونتیس برس بعد آج بھی بلراج کومل کی وہ سحر قائم ہے۔

اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بلکہ ایک اضافہ ہوا ہے، احترام کا۔ اب آنکھیں اس سے ملتی ہیں۔ پیغام عشق دیتی ہیں۔ مگر احترام جھک بھی جاتی ہیں۔

شاید بلراج کومل کو تخلیق کرتے وقت خمیر سے کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی۔

بلراج کومل کے احباب کا ایک حلقہ ہے (دنیا میں ہر انسان کا ہوتا ہے) جس میں خلیق کومل بھی شامل ہیں اور محلے کا چوکیدار بھی اور دونوں کی مجبوری یہ ہے کہ وہ اس کا احترام کرتے ہیں۔ جو دوست قدرے بے تکلف ہیں وہ دوستی کی سطح پر گالیاں سنانا اور سننا چاہتے ہیں۔ خود بلراج کومل چاہتا ہے کہ گالیوں کی سطح پر اتر آئے مگر بیچ میں ظالم سماج آ جاتا ہے۔ احترام اتنا مقدس ہے۔ نیا دھرو انگیز۔ گالیاں سسوس کر رہ جاتی ہیں۔ اگر کوئی بے تکلفی میں گالی نکالے گا بھی تو وہ اسے اتنا مہذب بنا دے گا کہ اس میں جان ہی نہیں رہے گی۔

اس احترام و تہذیب پر بلراج کومل کو ہمیشہ کف افسوس ملتے دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے ایک دوست سے کہا کہ ''بلراج کومل پر مختصر تبصرہ کرو۔'' وہ کم بخت ایک دم مہذب ہو گیا۔ بولا ''یار! وہ شاعر ہے، مگر آفت نہیں۔''

''کھل کے تشریح کیجئے۔''

''اس کے لباس اور رہن سہن میں تبدیلی نہیں ہے۔ صفائی نیاست توازن سے باہر ہے گا! نفاست سے گر مگا ہے گا۔ بوٹ پر اس خوبصورتی سے پالش کرتا ہے کہ بوٹ ہی اٹھتا ہے۔''

''شاید وہ چاہتا ہو کہ بوٹ کو بھی ہی اٹھنے کا حق ہے اور آگے چلے۔''

''نہ وہ غیر معمولی حد تک بال بڑھاتا ہے نہ بکھرا کر کوچۂ جاناں کے پھیرے لگاتا ہے۔ کسی لڑکی سے اشتہاری عشق نہیں کیا۔ ٹھنڈی آہیں۔ اختر شیرانی لولیٹر وغیرہ جو خاصہ تھا، فلمی عاشقوں رہا ہے۔ آوارگی تک نہیں کر سکتا۔ بڑے کھڑ کھاؤ کا آدمی ہے۔ بیا آدمی بھلا شاعر بن سکتا ہے۔''

مگر پھر ایک سرد آہ بھرتے ہوئے وہ دوست بولا ''مگر یار شاعر بڑے کینڈے کا ہے۔ کرب کی لے بڑی گھٹی اور گہری ہوتی ہے۔''

مگر اس کے غائب اور حاضر دونوں قسم کے مداحوں کو یہ بات شاید اپیل ہے۔ جوڑنے لگے کہ وہ خوب آوارگی کرتا رہا ہے۔ گھنٹوں بلاوجہ گھومتا ہے کناٹ پلیس کی ریلنگ پر کھڑے ہو کر حسیناؤں کو بھی تکتا رہا ہے۔ دوستوں کے ساتھ شکستہ و ریختہ کمروں میں دھوم مچی ہوئی دری پر بیٹھوں اور کوٹ پتلون سمیت سوتا بھی رہا ہے۔ رات کے دو دو بجے تک نشے میں سرشار، گنگناتا اور ڈیوٹی کینٹل سے ڈوٹوں میں بھی کرتا رہا ہے۔ عالم آوارگی اور بے خودی میں اس کوٹ پر کسی وانٹ کو دعوت بھی دیتا رہا ہے۔ بلکہ ایک دو دوست تو اسے ایک بار یا بار خانہ پر بھی لے گئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہاں جا کر وہ اداس ہو گیا تھا اور گھر آ کر گھنٹوں تکیے میں منہ چھپا کر روتا رہا تھا۔

اس کے باوجود وہ عام زندگی میں نفاست اور حسن کا خوگر ہے۔ وہ نہ ان شاعروں کی طرح ہے جو زندگی بھر محبوب کے بغیر عاشقانہ شاعری کرتے رہتے ہیں اور نہ ان شاعروں کی طرح جو زیر بحر کر کے اپنی ہر چیز (جسے وہ تخلیق تک کہہ دیتے ہیں) کیش کرا لیتے ہیں۔ روایت کو بھی عاشقانہ شاعری کو بھی، دریدہ لباس کو بھی شیخ کے زم زم کو بھی صوفی کے تار کو بھی، حتیٰ کہ مشاعرے میں پہنائے جانے والے ہار کو بھی۔

ہاں! ان معنوں میں وہ تقی شاعر نہیں، گو وہ اپنی کسی کوتاہی کا استحصال نہیں کرتا۔ کرنا چاہیے بھی نہیں۔ کر سکتا بھی نہیں کیونکہ وہ استحصال کے مفہوم سے ہی قطعی محروم ہے۔ ان معنوں میں اگر آپ اس کو شاعر نہیں کہنا چاہتے تو بھی وہ شاعر رہے گا۔ صفائی کی گرد نفاست سے باہر رہنے کے باوجود رہے گا۔ ایک ڈنر سے لطف اندوز ہونے والا احباب، مہمانوں، حتیٰ کہ رشتہ داروں کے سامنے سیب کی قاشیں بڑی تہذیب سے کاٹ کر پیش کرنے والا انسان۔ وہ انسان پہلے ہے یا شاعر۔ شاعر پہلے ہے یا انسان۔ یا دونوں ایک دوسرے کا تعاقب کرنے والے۔ ایک دوسرے کو شکست دینے والے۔ کوئی اگر اسے مہذب تک کہہ دے تو کسی کو کھلنے کا نہیں۔ اور بلراج کومل کو بالکل نہیں کھلتا۔ کیونکہ اسے نہ جانے یہ کیوں یقین ہے کہ اچھے انسان اور اچھے شاعروں کی سرحدوں میں تمیز کرنے والے تضیع اوقات کے شکار ہیں۔ بہر طور شاعر کو انسان ضرور ہونا چاہیے۔ چاہے وہ عمر بھر کرائے کے مکان میں رہے۔ صرف مالک مکان کو اس غیر انسانی زعم میں نہیں رہنا چاہیے کہ جو مکان بناتا ہے وہ انسان بنتا ہے۔

لیکن وہ جس طرح شاعر نہیں لگتا اسی طرح کرائے دار بھی نہیں لگتا۔ بس نفاست سے وہاں رہے جا رہا ہے حتیٰ کہ خود اس کا مالک مکان بھی بھول گیا ہے کہ یہ میرا مکان ہے۔ ایک مرتبہ بلراج کومل نے مجھے بتایا کہ میرا مالک مکان

پچھلے دنوں محلے والوں سے پوچھتا پھر رہا تھا۔ "بھائی صاحب! بلراج کومل کس مکان میں رہتا ہے؟"

میں نے فوراً کہا "تو ڈکلیئر کرو کہ میں مکان کا قانونی مالک ہوں۔"

اس پر وہ مسکرایا، ہلکی سی بے چینی۔ دونوں میں بڑی ایک انگریزی شاعری کی کتاب کا جیسے سہارا لیتے ہوئے بولا "ضمیر نہیں مانتا"

سارا قصّہ اس کے ضمیر کا ہے ضمیر کے خلاف کوئی سا بھی واقعہ اُسے بھڑکا دیتا ہے۔ بغاوت کر دیتا ہے مگر اس بھڑک اور بغاوت میں شور وغل نہیں ہوتا۔ اس کی نظموں میں بھی اقدار کے خلاف ایک بھڑک ہوتی ہے مگر ان میں بھی شور نہیں ہوتا۔ لہجے کی مہذبانہ طمانیت سے جیسے کہہ رہا ہوتا ہے

اہلِ محفل قریب آجاؤ

چند گھڑیاں تو کاٹ لیں مل کر

شاید اس لحظۂ معیت میں

جشنِ غم داستانِ زخمِ دل

ان سے ہو جائے رونقِ محفل

ہاں وہ شناسائی کی گھڑیاں اور رونقِ محفل کی پیاس لئے پھرتا ہے۔ کسی سے ملاقات کا ایک لمحہ اس کے لیے شناسائی کی گھڑی بن جاتا ہے۔ ضروری سے ضروری کام چھوڑ دیتا ہے۔ کہتا ہے دنیا کا ہر ضروری کام ایک طرح کی روشنی ہے۔ ان میں شناسائی نہیں۔ شناسائی تو اسی میں ہے کہ کسی یار کے ساتھ لڈّو کا آملیٹ کھایا جائے۔ جب بلیڈ سے شیو کی جائے تو اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیر کر بلیڈ کی کوالٹی کو داد دی جائے۔ آپ اُسے ایک خوبصورت شعر سنا دیں۔ بے ساختہ جملہ کہہ دیں۔ وہ بے اختیار آپ کو گلے سے با قاعدہ چومنا لے گا۔ ممکن ہے گلے لگ کر آپ کا بوسہ بھی لے لے۔ بوسے پر اکتفا نہ کر سکا تو رونا بھی شروع کر دے گا۔ ہاں اُسے کسی نہ کسی طرح شناسائی کا اظہار چاہیے اور آنسو بھی اس کے شناسائی کے انداز ہیں۔

وہ خوشی کے چھوٹے چھوٹے لمحوں کا بھوکا ہے ایک بار مجھے کہنے لگا "کمار صاحب! کل رات ڈھائی بجے میری نیند کھل گئی۔ لگا شدید پیاس لبوں پر ہویدا ہوئی تو آنکھ کھل گئی۔

پانی، پانی، پانی۔ پانی کے دو چار گھونٹ، اس وقت مجھے فقط مسرت مہیا کر سکتے ہیں۔ مگر پانی کہاں کہاں رکھا ہے۔ کچھ معلوم نہیں تھا۔

''گارگی (اس کی بیوی) کو جگا دیتے'' میں نے کہا۔

''ضمیر اجازت نہیں دیتا تھا کسی کی شیریں نیند کو اچاٹ کر دوں نہیں تھا۔ شناسا مجھے چاہیے تھی۔ مگر کسی کی شیریں نیند کی بربادی کی قیمت پر نہیں۔ اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر کچن تک پہنچا۔ ہاتھ لے گیا۔ بجلی آف تھی۔

''کیا کہنے مصیبت تنہا نہیں آتی''۔

''نہیں مسرت تنہا نہیں آتی۔'' چنانچہ اندھیرے میں ہی مسرت کا متلاش کرنے لگا۔ اندھیرے میں ہی جگہ جگہ صراحی ٹٹولتا پھرا اور جب صراحی سے لمس ہوا تو مت پوچھیا رہا۔ اضطراب کے کس تلذذ کے ساتھ پوری صراحی میرے حلق میں گڑگڑاتی ہوئی اتر گئی۔ کیا مترنم آواز تھی اور کیا ٹھنڈا ٹھار پانی تھا صراحی کیا تھی پہاڑ کا روں روں بھرا تھا شرا آ گیا۔

ہاں وہ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی خوشیوں کے لئے زندہ رہا ہے۔ ایک چھوٹی سی محفل، ایک چھوٹا سا گھر، ایک چھوٹا سا کنبہ، چھوٹا سا جھگڑا، چھوٹی سی طمانیت۔ یہ سب چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں اس کی زندگی کو بڑی بڑی وسعتیں دے دیتی ہیں۔ ایک بہتّر سالہ عمر رواں کے کاندھے سے بھی تمر پر گویا دیتا ہے۔ رفتارِ حیات کو تیز اور جواں کر دیتا ہے۔ انہی چھوٹی چھوٹی کیفیتوں میں زندہ رہنے کی اُمنگ ہی کا نتیجہ ہے کہ بلراج کومل کے نقوش اور خوشبو میں جو شباب آسا معصومیت اور نکھرا ستھرا پن تھا۔ چونتیس برس بعد آج بھی اس کے سراپا پر لہلہاتا ہے۔ شاید وہ کبھی بوڑھا نہیں ہو گا۔ اس کا جسم بھر گیا ہے مگر تازگی اور سپردگی کی نازک لطافت ویسے ازلی و ابدی سی لگتی ہے۔ اس کا گھٹا ہوا "سمجھ" تو اس کا بال جلا بھائی لگتا ہے۔

میرا خیال ہے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی کمی اور کوئی جانے یا نہیں بلی اور بلراج کومل کو بھی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے علاوہ اور کہیں جانے پناہ نہیں ملتی اس لئے دونوں ہر گھڑی ایک دوسرے کے تعاقب میں رہتے ہیں اور کسی نہ کسی موڑ پر ایک دوسرے کے ہمراہ ہو جاتے ہیں۔

دونوں میں ہجر و وصال کے ہر کیفیتی سحا طے ملتے ہیں۔

جب بھی بڑی خوشی کا خطرہ ہو۔ وہ ہمیشہ بھاگ جاتا ہے۔ کیونکہ جانتا ہے کہ بڑی خوشی میں تصنع ہے۔ روح غائب ہوتی ہے کیوں کہ اُسے خدشہ رہتا ہے کہ بڑی خوشی کے آتے ہی وہ بوڑھا ہو جائے گا۔ چھوٹی خوشیاں اُسے جوان رکھتی ہیں کیوں کہ ان میں لیکن دیر نہیں ہوتا۔ لیکن دیر ہی جو عمر ہیں کا سچ ہے۔

بڑا اساطر بڑا امیر وہ بڑی کرسی تک وہ پہنچ سکتا تھا نہیں پہنچا۔ پہنچنا نہیں چاہا۔ وہ ایک محفل کے لئے جدوجہد کرے گا۔ ایک ڈر کے لئے نہیں۔ ایک ڈر کے لیے جدوجہد کرے گا، کار کے لیے نہیں۔ یعنی زندگی میں جو چیز جتنی بھی ہے جتنی بھی ہے وہ اسی کو قبول کرے گا۔ اس میں فرحت پائے گا اس پر منتیں بنائے گا اپنی توہین نہیں سمجھے گا۔

وہ پہلے چھوٹی چھوٹی خوشیاں تلاش کرتا ہے پھر انہیں سب میں بانٹ دیتا ہے۔ دوستوں میں پڑوسیوں میں رشتے داروں میں آپ اس کے گھر جائیے وہاں ادبی فضا کی خوشیاں بھی ملیں گی اور گھریلو فضا کی بھی۔ دونوں فضائیں اس کی اپنی تخلیق ہیں اور انہی میں وہ مقیم ہے۔

اور انہی چھوٹی چھوٹی کیفیتوں کا ایک ہجوم پیدا کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بڑا آدمی بھی بن گیا اور بڑا شاعر بھی۔

☆

# "متحرک لمحہ" کی ایک مثال

ڈاکٹر وزیر آغا (مرحوم)

وقت کا تجزیہ کرنے کے لیے اسے تین واضح ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل، ہر چند وقت تفریق اور تقسیم سے ماورا ہے لیکن اسے گرفت میں لینے کے لیے تحلیل اور تجزیہ کا وہ طریق ضروری ہے جو اسے ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔ ان ادوار میں سے ماضی یا مکان محض بیتے ہوئے وقت کی ایک صورت ہے یہ وقت کا تشخص یا ہے۔ دوسری طرف مستقبل محض ایک فرضی میدان ہے جس میں وقت ایک میار فتار گھوڑا ہے جو نہ صرف ہر وقت متحرک رہتا ہے بلکہ ایک خاص سمت میں بڑھتا اور ایک نظر پلٹ کر دیکھنے کی کوشش تک نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وقت تحرک اور تموج کو صرف اس ایک نقطے پر ہی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے جو "حال" کا لمحہ ہے۔ اگر ہم اس طرح سوچیں کہ وہ ایک مشعل ہے جو آگے ہی آگے کو بڑھتی اور اپنے دائرہ نور کی مدد سے وجود یا مکان کو تخلیق کرتی ہے تو شاید یہ تشبیہ بات کی کچھ وضاحت کر سکے۔ مستقبل ہر لحظہ اس دائرہ نور میں آ کر مکان کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور دوسرے ہی لمحہ ماضی میں داخل کر بے جان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا ممکن ہے کہ کائنات کی تخلیق کا عمل مسلسل اور جاری ہے اور وقت ہی اس کائنات کا خالق ہے۔ نور اس کا وصف خاص ہے شاید اسی لیے خدا نے نور کو نہ صرف اپنی سب سے بڑی خصوصیت قرار دیا ہے بلکہ یہ بھی کہلوایا کہ وقت کو برا نہ کہو کیونکہ میں خود وقت ہوں

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم میں سے کتنے لوگ حال کے اس متحرک لمحے سے ہم آہنگ ہوتے ہیں؟ دوسرے لفظوں میں، کتنے لوگ ہیں جو وقت کا روپ دھار کر حال کے اس لمحے کے ساتھ خود بھی متحرک رہتے ہیں؟ بہت کم، بات یہ ہے کہ ایک عام انسان یا تو اپنے ماضی میں رہتا ہے یا مستقبل میں۔ اور یہ اس لئے کہ وہ حال کی چندھیا دینے والی روشنی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ بعض لوگ محض ماضی یا مستقبل کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انھیں اگر ہم تحجرات (FOSSILS) کا نام دیں تو بہتر ہے۔ شاعری میں بالخصوص یہ بات عام ہے اور اسی لئے اس میں حال کے متحرک لمحے کو نسبتاً کم اہمیت ملی ہے۔ بلراج کومل کو اگرچہ ابھی بہت کچھ تخلیق کرنا ہے اور اس لیے وثوق سے ابھی کچھ کہنا بہت مشکل ہے کہ عمر کے ایک خاص دور میں داخل ہونے کے بعد اس کے رد عمل کی نوعیت کیا ہو گی، تاہم جو کچھ اس نے اب تک تخلیق کیا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ اس کے ہاں حال کا لمحہ اپنی پوری شدت و توانائی کے ساتھ ابھرا ہے اور اس نے اس نقطے پر کھڑے ہو کر چاروں طرف ایک گہری نظر ڈالی ہے۔ یقیناً اگر بلراج کومل حال کے اس نقطے پر ٹکا کھڑا رہتا اگر دیا ہوتا تو وہ "بابر بعیش کوش" کے نظریے کا علم بردار بن کر رہ جاتا اور اس کے ہاں ارضی لذائذ اور جسمانی قرب کا احساس "سوچ کی تبدیلی" مکمل کر دیتا۔ بلراج کومل کی انفرادیت تو اس بات میں ہے کہ "حال" کے اس لمحے میں رہ کر بھی وہ وقت کے سیل رواں سے ہم آہنگ ہے اور اسی لیے متحرک اور زندہ ہے۔ وہ ایک تختے کی طرح وقت کی موج کے رحم و کرم پر بالکل نہیں بلکہ ایک زندہ انسان کی طرح اس تختے کے ساتھ بندھا ہوا آگے کو بڑھ رہا ہے اور اپنی اس حالت کا اسے پورا پورا گیان ہے مثلاً اس کی نظم "عالم کل" کا یہ ٹکڑا دیکھئے

آسمان صدیوں پرانی رہگذر
میں مگر اس رہگذر کے موڑ پر
سنگ خارا کی طرح
وقت کے آغاز سے انجام تک موجود ہوں
دیکھتی آنکھوں سے ہر شے دیکھتا ہوں روز و شب
مضطرب ہوں جانے والوں کیلئے
منتظر ہوں آنے والوں کیلئے

بلراج کومل کے زاویۂ نگاہ اور شعری مزاج کو سمجھنے کیلئے "عالم کل" کا یہ ٹکڑا ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ٹکڑے کے مطالعے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ شاعر وقت کے اس اہم موڑ پر کھڑا ہے جہاں وہ جانے والوں سے بھی احساسی طور پر ہم آہنگ ہے اور آنے والوں سے بھی۔ پھر اس مقام پر وہ شخص ایک پتھر کے ٹکڑے کی طرح جامد اور ساکن نہیں بلکہ اسے دیکھنے کی سکت بھی حاصل ہے۔ اور اس کی نظر میں وقت کے دونوں ادوار ماضی اور مستقبل کا احاطہ کر رہی ہیں۔ وقت کے آغاز سے انجام تک موجود ہونے کا احساس ایک روحانی تجربے کی حیثیت بھی رکھتا ہے کیونکہ جہاں "لامحدود" سے ہم آہنگ ہونے کا منفی طریق یہ ہے کہ اپنی ذات کو اس لامحدود میں ضم کر دیا جائے وہاں مثبت طریق یہ ہے کہ خود کو اتنا پھیلا دیا جائے کہ ذات اور کائنات میں کوئی فاصلہ ہی باقی نہ رہ جائے۔ بلراج کومل کی اس نظم میں مؤخر الذکر طریق نسبتاً نمایاں ہے۔

بلراج کومل نے حال کے اس لمحہ پر سوار ہو کر وقت کے ادوار پر ایک نظر ڈالی ہے تاہم اس کے ہاں وقت کے ساتھ بہتے چلے جانے کا احساس ہر وقت تازہ اور توانا رہتا ہے۔

مثلاً یہ چند ٹکڑے دیکھیے

میں آوارہ صدیوں سے
میری راہ میں یادوں کی سرمست ہوا
صبحوں کے پیڑوں پر بکھری ہریالی
شاموں کے چشموں کے کنارے سے راتوں
کے نوری غنچے
نیم شبی کے گھونگھٹ میں چہروں کی دلہن کے نخرے
نیند کی ٹھنڈی گھاس پہ خوابوں کی شبنم
میرے جامِ شکستہ میں
قطرہ قطرہ گرتی ہوئی لمحات کی مے
میرے ساز کی بھٹکی ہوئی آوازوں نے
اپنی رو میں بہتا ہوں
__________"نخلستان"

"میں وقت کے ٹکڑوں میں لپٹا ہوا
ہر شام آ نکلتا ہوں
ریگِ ساحل پہ بکھری سیپیاں جیسے
کھو گئے ہیں
ان کو چنتا ہوں
دامنِ زیست بھر رہا ہوں"
__________"سمندر"

حیات اپنی منزل پہ گو آج بھی گامزن ہے
میں خاموش
تنہا کھڑا سوچتا ہوں
کوئی دور سے مجھ کو آ کر پکارے
__________"میں شاعر میں فنکار"

جنوں کی رُت میں
بجا ہوں میں مجبور تو میں اس سے
حریفِ سود و زیاں وہی ہے
حکایتِ خونچکاں وہی ہے
یہ جذبہ اتھاہ جذبہ ہے
یہ جذبہ سر تا بہ جذبہ ہے
وہی تگ و دو وہی سفر ہے
__________"تیرگی"

بلراج کومل کی نظموں سے یہ چند ٹکڑے جو میں نے بغیر کاوش کے چن لئے ہیں نہ صرف اس مسلسل سفر کی شاعری کرتے ہیں جو دراصل وقت کی ایک صفت ہے بلکہ اس بات کا احساس بھی دلاتے ہیں کہ ان نظموں کا شاعر وقت کے چار حصوں یعنی ماضی یا مستقبل میں مقید نہیں بلکہ وقت کی یلغار میں پیش پیش ہے لیکن چونکہ وقت کے اس نقطے پر بہت کم لوگ بیداری کی حالت میں موجود ہوتے ہیں اس لئے بلراج کومل کے ہاں ایک شدید تنہائی کا احساس بہت نمایاں ہے۔ یوں بھی عرفانِ ذات کے لمحات میں انسان خود کو تنہا محسوس کرتا ہے تا آنکہ اس پر اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ اس یاترا میں کسی بھی ساتھی کا وجود ہی بے معنی ہے۔ وقت کے اس نقطے پر دوسرا احساس یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہر شے رواں دواں ہے۔ تغیر کو ثبات ہے اور اشیاء سے وابستگی بے معنی ہے۔ خود کو بے بار و بر محسوس کرنے کی وجہ جواز یہی ہے۔ وہ لوگ جو محض ماضی کے رسیا ہیں ان کے لیے ماضی سے (جو ان کے لیے ذاتی جائیداد یا اثاثے کی حیثیت رکھتا ہے) دست کش ہونا ناممکن ہے۔ اسی لئے ٹھہرا ہوا معاشرہ ہمیشہ مادہ پرستی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ جب کہ خانہ بدوش یا آوارہ قبائل میں ماضی سے منقطع ہونے زمین کو تیاگ کے اور رشتے ناطے توڑ دینے کا احساس ابھر آتا ہے۔ حال کے متحرک لمحے پر سفر کرنے والی روح بیدار چاروں طرف بکھری ہوئی اشیاء سے وابستہ ہونے کے بجائے "ذات" کی پہنائیوں میں غوطہ لگاتی اور "جاوداں" ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ بلراج کومل کی نظموں میں اس "لمحۂ بے اماں" یا "بے زماں" میں وقت کی تگ و دو سے اوپر اٹھ کر جاوداں ہونے کی خواہش بہت نمایاں ہے اور قاری کو سوچنے پر مائل کرتی ہے۔

ماضی کی زنجیروں سے آزاد رہنے کی خواہش بلراج کومل کی کئی ایک نظموں میں ابھر آئی ہے اور میرے اس خیال کی تائید کرتی ہے کہ یہ شاعر FOSSIL POETS کے قبیلے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ مثلاً "نوادر کی دکان" میں شاعر نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ماضی کے نوادر محض کانچ کے بے جان ٹکڑے ہیں۔ ان کے مقابلے میں گداز جسم، زندگی اور حرکت اور جدت کی آماجگاہ ہونے کے باعث ان سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اسی طرح "یہ نیا دیو" میں شاعر نے ان تمام اصنام کو حقارت کی نظر سے دیکھا ہے جو ماضی کا ورثہ ہیں اور جن سے ہمارے اذہان میں تمدن کی روشنی ہے اور کہا ہے کہ اے پتھروں کو پوجنے والو! اپنے چاروں طرف دیکھو۔ وہی عورت اور آنکھیں اور کمر کے بل جنھیں تم پتھروں میں دیکھ کر پوجتے ہو، زندہ جسموں کی صورت تمہارے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ نظم بھی انجماد، ٹھہراؤ اور ماضی پرستی کے مقابلے میں حرکت اور جدت کو زیادہ اہمیت بخشتی ہے۔

حال کے متحرک لمحے کے ساتھ بہتا ہوا شخص نہ صرف ماضی کے بندھنوں کو قبول نہیں کرتا بلکہ ایک خواب پرست کی طرح مستقبل سے بڑی بڑی امیدیں لگانے سے بھی گریز اختیار کرتا ہے۔

اس لئے کہ وہ ایک ایسے مقام پر کھڑا ہے جو روشنی کا نقطہ ہے اور جہاں سے وہ ماضی کی منجمد فضا اور مستقبل کی سراپائی کیفیت کو پوری طرح محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ ایسا شخص حقیقت پسند ہوتا ہے اور احمقوں کی جنت Fools Paradise میں رہنا گوارا نہیں کرتا۔ ایسا شخص اگر حقیقت پسند ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہو تو اگرچہ اس کے ہاں تخیل تو ہوتا اور احساس گہرا ہوگا تاہم حقیقت پسندی کی روش اُسے ماضی یا مستقبل کی تنگنائے میں رکنے کی اجازت نہیں دے گی۔ بلراج کومل کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ شاعر ماضی میں تجزیہ کی حیثیت سے رہنا نہیں چاہتا۔ اب اس کی نظموں سے یہ چند ٹکڑے دیکھئے جو اس بات پر دال ہیں کہ اس شاعر نے مستقبل کے بارے میں بھی حقیقت پسندانہ نظریے کو اختیار کیا ہے اور اسے اپنے خوابوں‘ ارمانوں اور تمناؤں کی آماجگاہ نہیں بنایا

گھروں کی رونق

یہ زرد بچے
یہ گھر بنائیں گے شادیانے بجائیں گے
آنے والے رنگین دنوں کی خاطر
یہ چند لمحوں کو زندگی کا مآل سمجھیں گے

حسبِ دستور
عمر بھر ان کو انگلیوں پر گنا کریں گے
یہ میرا حصہ
یہ تیرا حصہ
پھر ایک دن یہ بھی زرد بچوں کے باپ ہوں گے
اور ان کی خاطر دعا کریں گے
دراز ہوں ان کی عمریں دیکھیں یہ سو بہاریں

———— "یہ زرد بچے"

ہم مستقبل
کل کی مشعل
چھٹی ہونے پر گھر جا کر سوئیں گے
بچھے پرانے بستر سے اُگنے والے رنگین
خوابوں میں کھو جائیں گے

———— "طالب علم"

میں تم کو حسرت سے دیکھتا ہوں
یہ تختی جسم زادوں کی پناہ گہ ہے
تمہارے سر پر
جو سینگ اب تک نہ اُگ سکے تھے
پلک جھپکنے میں یوں اُگے ہیں
کہ جیسے اپنے جنم کے برسوں سے منتظر تھے
لہو کہاں ہے؟
تمہاری رگ رگ میں ایک سیال زہر کا
سحر بیکراں ہے
تمہارے سر کا یہ تاج قرنوں کی داستاں ہے

میں تم کو پہچانتا نہیں ہوں
یہ سر یہ چہرہ نہ میری آنکھیں
میں بے زباں ہوں
مگر میں شاید
تمہاری نظروں میں جاسوس ہوں

———— "سمراپا"

"یہ زرد بچے" میں بلراج کومل نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ مستقبل محض اس لیے سہانا ہے کہ یہ ابہام اور کول خوابوں میں لپٹا ہوا ہے ورنہ یہ حقیقت ہے کہ زندگی تو ایک دائرے میں گھومتی ہے۔ یہ زرد بچے جو مستقبل ہیں اور جن کے ساتھ امیدیں وابستہ کر کے ان کے والدین دراصل مستقبل سے امیدیں وابستہ کرتے اور خوابوں کی ایک نئی دنیا تخلیق کرتے ہیں خود بھی ایک روز عمر کی پامال راہوں سے گزر کر زرد بچوں کے باپ بنیں گے۔ اور اسی طرح مستقبل کی خوابناک فضا میں زندہ رہنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن شاعر خود ایک ایسے مقام پر کھڑا ہے جہاں سے مستقبل کی اس سراپائی کیفیت کو بہت اچھی طرح دیکھ سکتا ہے اسی لئے اس کا ردِ عمل حقیقت پسندانہ ہے۔ دوسری نظم "سمراپا" میں شاعر نے مستقبل کے ایک اور پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ فردوس پرستوں کے لیے ایک لمحہ فکریہ پیدا کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ مستقبل کا سہانا پن صرف اس وقت تک ہے جب تک یہ خواب و خیال میں لپٹا ہوا ہے ورنہ جب یہ حقیقت بن کر سامنے آئے گا تو اس کا وحشی پن ـــ اس کی بغاوت بالکل واضح ہو جائے گی۔ اس نظم میں شاعر نے نئی نسل کی بغاوت کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے اور ماضی اور مستقبل ـــ دادا اور پوتا کے درمیان کھڑے ہو کر ان دونوں جیتوں اور ان کے بیچ ابہام پر ایک بھرپور نظر ڈالی ہے۔

بلراج کومل وقت کے متحرک زندہ اور دھڑکتے ہوئے لمحے کا شاعر ہے اور اسی لئے وہ ماضی یا مستقبل میں رہنے کی بجائے "حال" کے لمحے میں رہنا پسند کرتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کا رجحان مادہ پرستی یا لذت کوشی کی طرف ہے اور وہ محض گزرتے ہوئے لمحے سے لذت کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کی آرزو میں سرشار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ آج اور آج سے بھی

زیادہ اس ایک لمحے کو اہمیت دیتا ہے جس کی عمر طبعی ذہن کی گرفت میں بھی نہیں آ سکتی۔ لیکن جو ایک "مسلسل انتظار" ہونے کا باعث ہے دو نظروں کے سامنے بیتا ہے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اس لمحے میں رچے ہوئے بلراج کومل کے ہاں اور لمحۂ بیکراں اور جاوداں ہو جانے کی آرزو بہت نمایاں ہے۔ یہ بات اُن نظموں میں خاص طور پر موجود ہے جو "حسن و جنس" کے رشتے سے متعلق ہیں۔ یعنی جن میں شاعر اور اس کی محبوبہ جسمانی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب آجاتے ہیں۔ جسم کے بارے میں بلراج کومل کا ردعمل تیاگ اور گریز سے ہرگز مملو نہیں۔ جسم ان کے لیے ایک زندہ حقیقت ہے اور جسم سے قربت ایک لذت نایاب کے حصول کا باعث ہے۔ لیکن ان کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ انہوں نے جسمانی قرب کو بھی رفعتِ ذات کے لیے وسیلہ بنایا ہے کہ زندگی اور اس کے مظاہر کی طرف ان کا رجحان چمٹنے اور لپٹنے اور رک جانے کا نہیں بلکہ اُن مظاہر کو خود سے لپٹا کر اوپر اُٹھ آنے کا ہے چنانچہ قرب محبوب کی لذت میں کھو کر بھی اس کی روح آسودگی اور کیف کی بلند تر سطح کی طرف جست بھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ چند مثالیں دیکھیے۔

آسماں سے زمیں تک ہستی
خواب ہے اور خواب آوارہ
جو کہلاتے ہیں نہ ہونا نہ
دونوں جسموں میں رازداری ہے
دونوں روحوں پر وجد طاری ہے

_____ "وصال"

اگر ہم اس خاکدانِ ہستی میں اپنے زرخیز
گرم جسموں
کو زندگی بھر قبول کرلیں
تو ہم خدا ہوں
ازل سے بہتر
ابد سے بہتر
خدائے ارض و سما سے بہتر
یہ شب حسیں ہے
سحر حسیں ہوگی، دوپہر شام اور پھر شب
میں آج ہوں اور کل نہ ہوں گا
میں جسم ہوں اب میں جسم ہوں اب
تو آج ہے اب تو جسم ہے اب
یہ لمحۂ بیکراں اب بڑا حسیں ہے
ہمارے جسموں کی وسعتوں میں
وہ موسم گل ہے جس کی کوئی خزاں نہیں ہے

_____ "موسم گل"

آخر میں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ میں نے ان چند سطور میں بلراج کومل کی نظم نگاری کے ان پہلوؤں سے قطعاً بحث نہیں کی جو دبستانِ تنقید کو ہمیشہ سے بہت عزیز رہے ہیں۔ مثلاً رمزیت و ایمائیت، ہیئت کے تجربے، غلاظتوں اور برائیوں کے خلاف احتجاج، سماج یا سوسائٹی کی عکاسی، شاعر کا پیغام وغیرہ۔ اور یہ اس لیے کہ تنقید کی یہ روایتیں اتنی پامال ہو چکی ہیں کہ اب پامال شاہراہوں سے کسی صورت بھی بہتر نہیں ہیں۔ اور ان کے گرد و غبار میں شاعر کی انفرادیت نظر تک نہیں آتی۔ دوسرے میرا یہ خیال ہے کہ ہمیں تنقید کے چند امتحانی سوالات کو سامنے رکھ کر کسی شاعر کے کلام سے بحث نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ شاعر کے کلام سے اس کی شخصیت اور روح کی کڑیوں کو ترتیب دینا چاہیے۔ میں نے جب اس خاص نظریے کے تحت بلراج کومل کی نظموں کا مطالعہ کیا تو مجھے ان میں ایک عجیب سی انفرادیت نظر آئی اور پھر میں نے بلراج کومل کی اس انفرادیت کے چند پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ مزید برآں مجھے یہ کہنا ہے کہ بلراج کومل کی ان نظموں کی اہم ترین خصوصیت ان کی جہت (DIRECTION) ہے۔ یہ نظمیں نہ صرف خود متحرک ہیں بلکہ ایک متحرک ذہن کی پیداوار بھی ہیں۔ جن لوگوں نے تاریخِ تہذیب کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات کی توثیق کریں گے کہ قدیم سوسائٹی ایک ازلی و ابدی دائرے میں مقید تھی اور اس لیے وقت کی جہت اور حرکت سے آشنا تک نہیں تھی۔ تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ انسان نے اس قدیم سوسائٹی کی زنجیروں کو توڑ کر اپنے سفر کا آغاز کیا اور ایک خاص سمت میں بڑھتا چلا گیا۔ اوقات اس سفر کے سنگ ہائے میل تھے۔ گویا انسان کی زندگی میں سفر کا آغاز سے مماثل تھا پھر سفر محض مادی اور جسمانی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی نوعیت ذہنی اور روحانی بھی ہوتی ہے۔ گویا جب سوچ کا آغاز ہوا اور انسان نے ہر شے کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے چند اہم سوالات اٹھائے تو وقت سے ہم آہنگ ہو کر ایک لمبے سفر پر روانہ ہو گیا۔ بلراج کومل کی نظموں کا مطالعہ کرتے وقت مجھے یہی احساس ہوا کہ اس شاعر نے سوچ کے عنصر کو جگہ دے کر اور ایک خاص سمت میں متحرک ہو کر وقت کے ازلی و ابدی تحرک سے اپنی نظموں کو آشنا کر دیا ہے۔ یہی بلراج کومل کی نظموں کی اہم ترین خصوصیت ہے کہ ان میں "جہت" یا "سمت" کا احساس ہوتا ہے اور چونکہ یہ جہت یا سمت حال کے لمحے ہی سے واضح ہوتی ہے اس لئے بلراج کومل نے اسی ایک مقام پر کھڑے ہو کر اپنی بیشتر نظمیں لکھی ہیں۔ یہ سفر بہت طویل ہے۔ راستہ بھی نیا ہے۔ اگر بلراج کومل کا جذبۂ سیاحت اور آرزوئے سفر اسی طرح جوان اور تازہ رہی تو یہ بات غیر اغلب نہیں کہ وہ آگے چل کر اردو نظم کو ایسی بہت سی منازل سے آشنا کرے گا جو ابھی تک نظروں سے اوجھل ہیں۔ لیکن جن تک رسائی اردو نظم کی توانائی کے لیے از بس ضروری ہے۔"

# بلراج کومل کے افسانے

شمس الرحمٰن فاروقی (الہ آباد، بھارت)

بلراج کومل کے افسانوں میں جو چیز سب سے پہلے متوجہ کرتی ہے وہ ان افسانوں کا تنوع ہے۔ یہ تنوع موضوع کا بھی ہے، تکنیک کا بھی اور اسلوب کا بھی۔ تنوع کی یہ کثرت اگر ایک طرف رنگا رنگی کا احساس پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف افسانہ نگار کی اس کوشش کی بھی غمازی کرتی ہے کہ زندگی کو اس کے واقعات اور مفروضات کو طرح طرح سے دیکھا جائے۔ بلراج کومل کی نظموں میں ایک شائستہ دھیما اور خوش اسلوب آہنگ ملتا ہے۔ یہ آہنگ تمام نظموں میں کم و بیش مشترک ہے۔ اس کے برخلاف افسانوں میں نثر کا آہنگ ہر جگہ ایک جیسا نہیں، کہانی کہنے کا انداز بھی ایک جیسا نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ افسانہ نگار اپنا آہنگ تلاش نہیں کر سکا ہے، بلکہ یہ ہے کہ افسانہ نگار کا نقطۂ نظر بدلتا رہا ہے۔ زندگی اس کے سامنے تجربے سے زیادہ مشاہدہ کی شکل میں آتی ہے۔ تجربے کی شکل میں حاصل ہونے والی زندگی میں تجربے سے گزرنے والا شخص اپنے تاثرات اس طرح شامل کر دیتا ہے کہ سب تجربے ایک شکل میں سے مماثل معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہ ایک فطری صورت حال ہے، اس سے گریز ممکن نہیں۔ اس کے برخلاف مشاہدے کی صورت میں حاصل ہونے والی زندگی میں مشاہدات کی بوقلمونی برقرار رہتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مشاہدہ بھی شاہد کا نتیجہ ہوتا ہے، اس معنی میں کہ دیکھنے والا جو کچھ دیکھتا ہے اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور ہر منظر میں اپنی شخصیت شامل کر دیتا ہے۔ لیکن یہ شخصیت بہرحال دیکھنے والی شخصیت ہوتی ہے، تجربے کو انگیز کرنے والی شخصیت نہیں ہوتی۔ نطشے نے اشیاء کی حقیقت کے معروضی نہ ہونے کا جو حکم لگایا تھا وہ اسی وجہ سے تھا کہ ہر حقیقت ہر دیکھنے والے کو اپنی ہی آنکھوں کے حوالے سے نظر آتی ہے۔ نطشے سے بہت پہلے غالب اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مشاہدہ کی ہوئی حقیقت تجربے کی ہوئی حقیقت سے زیادہ معروضی ہوتی ہے۔ اسی لئے زیادہ متنوع ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ جو حقیقت جتنی معروضی نظر آئے گی اتنی ہی سچی بھی ہوگی۔ لیکن یہ الگ بحث ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ مشاہدہ کرنے والا، تجربہ کرنے والے سے زیادہ دیکھتا ہے۔ اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے کہ کھیل کے بارے میں تماشائی کو کھلاڑی سے زیادہ علم ہوتا ہے۔

بلراج کومل کے افسانوں کا تنوع اسی نکتے میں مضمر ہے۔ وہ زندگی کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے بیانیہ تکنیک کے کئی طریقے استعمال کیے ہیں۔ ان کے بعض افسانے غائب اور سب کچھ جاننے والے راوی نے بیان کیے ہیں (کنواں، کرچیں، تصویر وغیرہ) تو بعض میں راوی واحد متکلم ہے (تیسرا کنارہ، دل یا توں)۔ بعض میں راوی واحد متکلم ہے لیکن وہ جن واقعات کو بیان کرتا ہے وہ خود اس پر نہیں گزرتے، بلکہ وہ دوسروں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو بیان کرتا ہے (سائے کے ناخن، ایک آدمی کا قتل)۔ کسی زمانے میں راوی غائب تو ہے مگر جو واقعات ہیں وہ محض ایک شخص کے تاثرات اور مشاہدات ہیں (آنکھیں اور پاؤں)۔ کسی میں افسانہ در افسانہ ہے اور دونوں راوی واحد متکلم ہیں (روشنی روشنی)۔ کسی میں راوی بالکل مفقود ہے، اس کی جگہ تاثرات اور حافظے میں منتشر یادوں اور گذشتہ و آئندہ واقعات کی طرف علامتی اشاروں نے لے لی ہے (جنگل، گڑیا، پری کی رات)۔ جن افسانوں میں واحد متکلم راوی کا کردار کچھ اہمیت رکھتا ہے ان میں بھی اس کی حیثیت مرکزی نہیں بلکہ مشاہدے کی ہے (تیسرا کنارہ)۔ لیکن بعض افسانوں میں مشاہدے کی شخصیت نمایاں ہونے کے باوجود خود صوفی رنگ بھی موجود ہے (قلم کے ٹکڑے، پھول)۔ یہ سب افسانے ایک پائے کے نہیں ہیں لیکن فی الحال صرف اس بات پر زور دینا مقصود ہے کہ ان افسانوں میں بیانیہ کے مختلف طریقے کم و بیش کامیابی کے ساتھ برتے گئے ہیں۔ لہٰذا ان کو پڑھتے وقت اس قسم کی تکرار کا احساس نہیں ہوتا جو ہمارے زمانے کے بعض بہت اچھے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ زیادہ تر افسانے ایک ہی کردار یا ایک ہی شخص کے تاثرات پر مبنی ہیں لیکن راوی کے تنوع کی وجہ سے اس بات کا احساس ناگواری کی حد تک نہیں پہنچتا۔

موضوع کے اعتبار سے دیکھئے تو تمام افسانوں میں معاصر دنیا بیان کی گئی ہے لیکن بعض میں انسانوں کی بے حسی، نچلے متوسط طبقے سے ترقی کر کے متوسط طبقے تک پہنچنے والی کی سطحیت اور اخلاقی دیوالیہ پن کا ذکر ہے (تیسرا کنارہ، کرچیں)۔ کسی میں جدید زندگی میں تشدد اور اس تشدد کے روبرو ہم لوگوں کی بے پروائی کا ذکر کیا گیا ہے (ایک آدمی کا قتل)۔ بعض میں دانشوروں کے اُتھلے پن اور کھوکھلے پن پر طنز ہے (قلم کے ٹکڑے، روشنی روشنی، پھول)۔ بعض میں ہمارے زمانے میں احتجاج برائے احتجاج اور ریاکاری اور تشدد پسندی اور بے حسی کی شدت پر افسوس اور برہمی اور طنز ہے (آنکھیں اور پاؤں، دل یا توں)۔ کسی میں پوری زندگی کی بے معنویت کو موضوع بنایا گیا ہے تو کسی میں زندگی کے غیر متوقع طور پر بھیانک ہو جانے کا ذکر ہے (سائے کے ناخن، کنواں اور تصویر)۔ میں اسرار کی کیفیت نمایاں ہے۔ زندگی عجیب بھی ہے اور پر اسرار بھی، بلکہ بڑی حد تک ABSURD بھی ہے، کیونکہ ''تصویر'' کے دو کرداروں میں سے ایک غریبی سے گزر کر کامیاب بزنس مین کی منزل پر پہنچ چکا ہے اور اپنے ماضی سے آزاد ہوا

چاہتا ہے۔لیکن آزاد نہیں ہوسکتا۔دوسرا بھی غریب ہے اور کامیاب بزنس مین بننا
چاہتا ہے۔لیکن دونوں اپنی شخصیت اور وجود سے بے خبر بھی ہیں اور اس کے
بارے میں عجیب وغریب تاثرات بھی رکھتے ہیں چنانچہ دونوں ایک تصویر کو اپنی
تصویر سمجھتے ہیں۔لیکن دراصل وہ کسی پرانے کیلنڈر سے کاٹی ہوئی مجہول تصویر
ہے۔اس طرح دونوں کی شخصیت اور وجود ایک طرف تو فرضی اور اشتہاری اور
مصنوعی نظر آتے ہیں تو دوسری طرف پراسرار اور ناقابل فہم معلوم ہوتے ہیں۔

اسرار کی یہ کیفیت ''کنوں'' میں اور زیادہ نمایاں ہے۔افسانہ جس
واقعے کو فریم میں رکھ کر پیش کیا ہے وہ خود ناقابل فہم ہے۔جب شہر میں جگہ جگہ پانی
کے نل لگ گئے تو کنویں بے کار ہو گئے پھر ایک شخص نے کنویں پھلانگنے کا مشغلہ
تقریباً اختیار کیا اور آہستہ آہستہ اس فن میں طاق اور شہرہ آفاق ہو گیا۔افسانہ
غائب راوی کی زبان سے بیان کیا گیا ہے اگر راوی واحد متکلم ہوتا تو ممکن ہے
ہمیں گمان گذرتا کہ واحد متکلم ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے یا کوئی طنزیہ بات کہہ رہا
ہے۔راوی کے غائب ہونے کی وجہ سے ہمیں اس بات پر یقین کرنے ہی بنتی ہے
کیونکہ بات کچھ ایسی ناقابل یقین بھی نہیں ناقابل فہم ضرور ہے۔ہم سوچتے ہیں
آگے چل کر بات صاف ہوگی لیکن تھوڑی ہی دیر میں بات اور الجھ جاتی ہے
کیونکہ کنویں پھلانگنے والا مشق اور ٹریننگ کی غرض سے (کیونکہ اسے مقابلے میں
حصہ لینا ہے) کنویں کی تلاش میں نکلتا ہے۔ایک کنواں جو اس کی مشق کیلئے بہت
مناسب ہے ایک سوکھے سڑے شخص کی آماجگاہ ہے جو تمام دنیا سے بیزار ہے'
اسے سب لوگوں نے اپنے جبر اور تشدد کا نشانہ بنایا ہے وہ اس کنویں پر خودکشی کیلئے آیا
ہے دونوں میں فلسفیانہ قسم کی بحث کافی ہوتی ہے۔آخر کار کنویں پھلانگنے والا
سوکھے سڑے شخص کو اس بات پر راضی کر لیتا ہے کہ پہلے وہ کنویں پھلانگ لے
پھر خودکشی کرنے والا خودکشی کرے۔لیکن کنویں پھلانگنے والے کی پرزور جست
ناکام رہتی ہے وہ کنویں میں گر جاتا ہے اور خودکشی کرنے والا وہاں سے بھاگ
جاتا ہے۔

افسانہ ہمارے سامنے کئی سوال کھڑے کرتا ہے۔لیکن تشفی بخش
جواب نہیں ملتے۔کنویں پھلانگنے والا زندگی کا پرستار رجائی اور مثبت فکر کا مالک
ہے۔زندگی اس کے لیے ایک مقابلہ ایک سماجی عمل ہے۔خودکشی کرنے والا ہر چیز
سے بیزار ہے اسے کسی پر اعتبار و اعتماد نہیں۔کنویں پھلانگنے والا زندگی پر اصرار
کرتا ہے تو خودکشی کرنے والا مرنے پر تلا ہے۔لیکن موت کنویں پھلانگنے والے
کی واقع ہوتی ہے خودکشی کرنے والا بھاگ لیتا ہے۔کیا زندگی اس طرح کے غیر
متوقع،طنزیہ حادثوں کا نام ہے؟ کیا وہ خودکشی کرنے والا،کنویں پھلانگنے والے
کی موت کا فرشتہ اور بہانہ تھا اور جان بوجھ کر اسی کام پر متعین ہوا تھا؟ اگر ہاں تو
اس کو متعین کرنے والا کون تھا؟ کیا خودکشی کرنے والے کا فرار اس بات کی طرف
اشارہ کرتا ہے کہ جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ان لوگوں کو بھی جو موت سے عشق
اور زندگی سے نفرت کا دعویٰ رکھتے ہیں۔کیا کنویں پھلانگنے کے عمل میں کوئی
تمثیلی اشارہ پنہاں ہے؟ اگر ہاں تو کیا وہ اشارہ یہ ہے کہ کنویں پھلانگنے سے
مراد Ambition ہے اور زندگی ایک پل صراط کی طرح ہے اور جن لوگوں میں
Ambition ضرورت سے زیادہ ہے وہ اس پل سے گر کر نیچے گہرے کنویں
میں غرق ہو جائیں گے۔

سوالات کی اس کثرت اور ممکن جوابوں کی فراوانی کی بنا پر یہ افسانہ
کافکا کی یاد دلاتا ہے۔اس اور بعض دوسرے افسانوں میں راوی کا لہجہ جذبے
سے عاری اور بڑی حد تک خشک اور غیر ڈرامائی ہے۔یہ لہجہ افسانے میں بیان
کردہ واقعات کے انوکھے پن کو نمایاں کرتا ہے۔جہاں جہاں طراح کول نے
کرداروں کے جذبات اور تاثرات کو براہ راست بیان کرنے کی کوشش کی ہے
وہاں استعجابیت کم ہو جاتی ہے۔لیکن اپنے بہترین لمحوں میں وہ اپنے خشک اور غیر
جذباتی لہجے کو واقعات کے مقابلے میں ایک CONTRAST کے طور پر پیش
کرنے اور اس طرح اسرار کے تاثر کو شدید کرنے میں پوری طرح کامیاب
رہے ہیں۔

جب میونسپل کارپوریشن کی طرف سے شہر کے بیشتر حصوں میں پانی
کے نل مہیا کر دیے گئے تو شہر کے اکثر کنویں بے مصرف ہو گئے اور کافی عرصے
تک بے مصرف رہے۔آخر ایک ذہین شہری نے ان کا ایک انوکھا مصرف
ڈھونڈ نکالا اس نے ایک جست میں کنویں پھلانگنے کا انوکھا تجربہ کیا۔یہ تجربہ
کامیاب رہا۔اس کے بعد اس ذہین شہری نے کنویں پھلانگنے کا مشغلہ باقاعدہ
اختیار کر لیا۔ (کنویں)

کمرے کی دھندلی روشنی میں اس نے آئینے کی سطح کا جائزہ
لیا۔آئینے پر بہت سی خراشیں پڑی ہوئی تھیں اور وہ کئی جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔عقب
میں لگے ہوئے ایک پرانے فلینڈ کا عکس آئینے میں دکھائی دے رہا تھا۔خراشوں
کی ایک دوسرے کو بے ربطی سے کاٹتی ہوئی لکیروں میں اسے اپنا چہرہ ایک ایسی
تصویر کی طرح نظر آیا جو کاغذ کے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی،اور جس میں ان
لکیروں کو نمایاں کر دیا گیا تھا جہاں مختلف ٹکڑے ایک دوسرے سے ملتے تھے۔
(تصویر)

اس کے برخلاف ''جھوٹی گڑیا پری کی رات'' میں سپاٹ بیانیہ کو
مسترد کر کے واقعات کی منطقی ترتیب کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ترتیب کی جگہ
حال اور ماضی کا ادغام ہے تو مستقبل کی بھی جھلک کہیں کہیں دکھائی دے جاتی
ہے۔پیکروں اور تشبیہاتی الفاظ کی کثرت ہے۔اس طرح افسانے کا آہنگ نثری
نظم کے آہنگ سے مل جاتا ہے۔افسانے کی ابتدا ہی ایک نثری نظم سے ہوتی
ہے جو پورے افسانے کی کلید معلوم ہوتی ہے۔

شبنم جھوٹی گڑیا۔پری

آج پھر اس نے رنگوں، روشنیوں، خوشبوؤں اور تتلیوں کا خواب دیکھا آج پھر وہ اس وادی میں اتری جہاں ایک روشن ستارے نے اسے کئی برس پہلے اتارا تھا آج پھر وہ اس ندی کے کنارے دیر تک بیٹھی جہاں ایک شہزادہ گھوڑے پر سوار اس سے ملنے آیا تھا۔ لیکن یہ سب صرف ایک لمحے کے لیے ہوا اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ درد و کرب سے بلبلا اٹھی تھی۔

یہ افسانہ ہمارے نام نہاد ترقی پذیر، روشن خیال سماج میں عورت کے استحصال کے خلاف زبردست احتجاج ہے۔ لیکن شعریت کی کثرت نے اسے پوری طرح افسانہ بننے نہیں دیا۔ طارق کول کا وہ اسلوب جہاں وہ شاید غیر متعلق راوی کی شخصیت میں ہمارے سامنے آتے ہیں ان کے افسانوں کیلئے زیادہ موزوں ہیں۔

لیکن یہ خاموش شاید غیر متعلق راوی بے حس نہیں ہے وہ جذبہ جو انہیں افسانہ لکھنے پر مجبور کرتا ہے ہمدردی، کرب یا بے بسی کا جذبہ ہے بے بسی کا نشانہ وہ عقل اور تہذیب سے عاری لوگ بھی ہیں جن کے دلوں سے ہمدردی کا جذبہ ختم ہو چکا ہے جو ایک پالتو کتے کے گھر سے نکالے جانے اور اسے گولی کا نشانہ بننے کا منظر تماشے کے طور پر دیکھتے ہیں اور یہ پوری زندگی بھی ہے جس میں تشدد اور غیر متوقع تصادم اور بے وجہ حادثات کی کثرت ہے جس میں گھر سے بھاگنے والا لڑکا ایک بار تو سیر سپاٹا کر کے خوش و خرم لوٹ آتا ہے لیکن دوسری بار کسی قاتل کا شکار ہو جاتا ہے۔

دہشت زدہ جانوروں میں ایک چھٹی حس بھی ہوتی ہے جو انہیں مطلع کر دیتی ہے کہ ان کی موت قریب ہے۔ ریکھو سہما ہوا جب گلی سے آخر تک پہنچ گیا تو بھیڑ نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ واپس مڑا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا گلی کے دوسرے سرے تک پہنچ گیا۔ یہاں ہجوم کی دوسری ٹکڑی نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ پھر واپس مڑا۔ اس ڈھنگ سے اس نے گلی کے چار پانچ چکر کاٹے اور پھر اس سڑک نما گلی کے وسط میں کھڑا ہو گیا۔

(تیسرا سچ)

نشانہ چوک گیا۔ گولی سنسناتی ہوئی ریکھو کے کان کے قریب سے گزر کر ملبے کے ایک ڈھیر میں گھس گئی۔ ہجوم میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔

(تیسرا سچ)

ابھی میرے ذہن سے اتر گیا۔ ہو گا کوئی گھر سے بھاگا ہوا لڑکا!
میرے بچے میرے گھر میں محفوظ تھے صبح ہوئی معمول کے مطابق بچے سکول گئے
جاتے ہوئے بیدار ہوئے معمول کے مطابق ـــــ میں نے چائے کا پیالہ اٹھایا
اور اخبار کھولا ـــــ ایک بچے کے قتل کی خبر عمر ۱۲ سال ـــــ رنگ ـــــ
میرے ذہن میں ایک انجانا سا ایک خیال کوندے کی طرح چمکا۔

(سائے کی ناخن)

ابھی جب پہلی بار بھاگا تو لوگوں نے اس کے والدین سے بے حد ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ جب وہ محفوظ و بخیریت واپس آ گیا تو لوگوں کو ایک طرح کی ناراضگی اور جھنجلاہٹ ہوئی۔ چنانچہ جب وہ دوسری بار بھاگا تو طرح طرح کی طنزیہ باتیں کی گئیں۔ فیصلہ کیا گیا اب کی بار ابھی واپس آیا تو اپنے بچوں کو اس کے ساتھ کھیلنے سے روکیں گے۔ لیکن اس بار ابھی واپس نہیں لوٹا۔ اس کی لاش بھی سالم نہیں پہنچی زندگی میں اس طرح کا تشدد Prabability کی کمی اور غیر متعلقی بے معنویت طارق کول کی بے بسی اور رنج دونوں کو متحرک کرتے ہیں۔

زمین سے آسمان تک ایک بھیانک شعلہ لپلپا رہا تھا۔ جو اپنی خونیں زبان سے عمارت کا گوشت چاٹ رہا تھا۔ اس کے ذہن کے تجزیے سے دھندلے ہوتے ہوئے افق پر ایک پل کے لئے اس کے معصوم بچوں کے معصوم چہرے نمودار ہوئے۔ ایک وحشی شور اس کے کانوں سے ٹکرایا۔ مگر اس کے بعد ایک گہری تاریکی اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں اتر گئی۔ (آنکھیں اور پاؤں)

اس طرح ستیارتھی جو اپنے بچوں کے لیے کاپی کتابیں خریدنے نکلا تھا۔ ایک جلوس کے بے ذہن وحشیانہ سیلاب میں بہہ کر اس تشدد کا شکار ہو گیا۔ جو اس جلوس نے برپا کیا تھا اور پھر جس کو ختم کرنے کیلئے پولیس نے جلوس اور تماشائیوں پر توڑا تھا۔ جو لوگ اپنے گھروں میں بند تھے وہ آگ کا شکار ہوئے اور جو لوگ سڑک پر تھے وہ گولیوں کے یا مار دھاڑ کے۔ حفاظت اور سلامتی کہیں نہیں تھی۔ اس طرح سایہ کا نزول گندگی سے نفرت کرتا ہے اور اس سے بھاگ کر پہاڑ کے خوبصورت مقام میں پناہ لیتا ہے۔ وہاں اسے اپنے ہوٹل کے پیچھے پانی کے گرنے کی آواز سنائی دیتی ہے وہ اسے آبشار سمجھتا ہے اور رات بھر اس کے تصور میں مگن ہوتا ہے کہ صبح کو آبشار کی سیر کریں گے۔ صبح کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ آبشار نہیں بلکہ ہوٹل کے گندے پانی کا نالہ ہے۔ بدصورتی ہر جگہ ہے بدصورتی سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے گناہ اور جھوٹ ہر جگہ ہے خود تمہارے اندر ہے تمہارے گردو پیش میں ہے یا شاید افسانہ اس قسم کے کسی اخلاقی سبق کا اظہار نہیں کرتا، بلکہ یہ ابوالحسن یا شاہ جیسے نازک مزاج لوگوں سے ہمدردانہ طنزیہ لہجے میں کہتا ہے کہ تمہارا دور ختم ہو گیا۔ اب جدید صنعتی دور ہے یہ عمارت اور فیکٹری سے گندہ پانی بہتا ہے یا شاید اس افسانے کا ماحصل یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ نفاست اور نازک مزاجی دراصل حقیقت سے فرار ہے۔

اس مجموعے کے بیشتر افسانے اپنے بظاہر سادہ رنگ میں اس طرح کی کئی پیچیدہ باتیں کہہ جاتے ہیں جو قاری کو زندگی اور انسان اور خود اپنے بارے میں طرح طرح کے شکوک میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ میں اسے طارق کول کی بہت بڑی کامیابی سمجھتا ہوں۔

☆

# "اسرار میں لپٹے ہوئے چہرے"

شمیم حنفی (دلی بھارت)

اسرار میں لپٹے ہوئے چہروں کی طرح حواس پر دیرپا اور دور رس اثر قائم کرنے والی حقیقت بھی وہی ہوتی ہے جس کی حد یقین سے ماورا ہیں۔ جس کے گرد ایک مسلسل پھیلا ہوا ہالہ گردش میں ہو اور جو سمجھ میں آنے کے باوجود حواس کی پیاس بجھنے نہ دے ہو سکتا ہے کہ دو اور دو چار کی لکیر کے فقیر اس شعور کو ناقص کہیں اور اس پرواز پر طنز زن ہوں جو زنجیر حروف میں اسیر نہیں ہوتی۔ انہیں جانے دیجئے کہ ان کا مرض لاعلاج ہے۔ بہر نوع کمال کی لگ بھگ اٹھائیس برس پرانی نظم "اکیلی" جو ان سے میرا پہلا تعارف تھی اور ان کے تازہ حال آخری مجموعے سترہوشک (اشاعت ۱۹۷۵ء) کی موضوعاتی نظم احمد آباد تک اسرار کی پرتوں کا دھند مجھے کبھی نظر نہیں آئی اور قاری کو اس بے بسی میں مبتلا کرتی ہے کہ وہ کمال کے سفر کا نظارہ کسی ایک زاویے سے یا کسی ایک سمت کی قیادت میں نہیں کر سکتا۔ بظاہر کمال کی شاعری ہیجان کی شدت سے عاری ہے چنانچہ اپنے پڑھنے والے کو بھی کسی مریض، شدید اور اضطراب آگیں کیفیت میں مبتلا نہیں کرتی۔ اس کے بجائے اس کے لفظ لفظ سے ایک شائستہ اضمحلال جھلکتا ہے۔ اور قاری کو بھی ایک نیم فلسفیانہ افسردگی، ایک غبار آلود حسی واردات کے تجربے تک لے جاتا ہے۔ اس تجربے کی رفتار دھیمی ہوتی ہے اور لے مدھم، اکیلی، اور احمد آباد دونوں کا تعلق ایسے اجتماعی آزار سے ہے جس کی شدت نے کتنے ہی شخص سازوں کی فنکارانہ حس کو واکر دیا ہے لیکن ان ٹکڑوں نظموں کے انبار سامنے آئے جن سے شاعر کے گداز قلب کا اظہار ہوتا ہے مگر وہ الجھا ہوا ہیجان رنگ پیدا ہوتا ہے جو آنکھیں بند کئے بغیر دریافت نہیں ہوتا۔

کمال کے سلسلے میں یہ بات یوں بھی اہم ہے کہ ان کا سفر ایک ڈھب میں نہائی ہوئی دھرتی پر ہوا ہے۔ ملک کی تقسیم کے موقع پر فرقہ وارانہ فسادات کا اعصاب شکن ماحول، زندگی سے ایک تخلیقی تعلق کے ساتھ کمال کی جان پہچان کا پہلا موڑ تھا۔ یہ فضا اس نشاط بخش جمالیاتی ذائقے سے محروم تھی، جس سے کمال کے قریبی پیش رو دوچار ہوئے تھے۔ ۱۹۴۷ء نے نشے کا طلسم توڑ دیا۔ خوابوں کے بعد شکست خواب کی یہ ساعت گریاں اور اس کی ہیرآن طویل ہوتی ہوئی پرچھائیں کمال کی شعری ادراک کی پہلی ہم سفر تھی۔ یہ آگ باہر کی دنیا میں ٹھنڈی پڑی تو دلوں میں دوسرے الاؤ روشن ہو گئے کہ تقسیم کے بعد کا ملکی ماحول ایک شدید ذہنی اور جذباتی بحران کی زد پر تھا۔ یہی صورت حال اس وسیع تر فکری اور حسی تاثر کی تھی جس نے رفتہ رفتہ دوسری ترقی پذیر زبانوں کی طرح اردو کی بساط پر بھی اپنے قدم جمائے۔ اور بالآخر ایک عالمگیر ادبی پس منظر کی حیثیت اختیار کر لی۔ اب اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کمال اور ان کے اکثر معاصرین خارجی سطح پر ایک ہی درد اور دہشت کے دائرے میں محصور نظر آتے ہیں۔ کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی الم انگیز نغمے کی تال پر ایک سحر زدہ اجتماعی رقص برپا ہے۔ تنہائی، بے بسی، خوف، نارسائی اور بے حصولی، یک رنگی اور تھکن کا ملا جلا زہر ہر زبان کا ذائقہ اور ایک کڑوی ادھوری سچائی سب کا ساجھا بن گئی۔ نتیجہ ہوا یہ کہ اس رواج پرستی کا انجام شاید یہی ہونا تھا کہ دھیرے دھیرے کی تفریق ختم ہو گئی۔ تخلیق کاری کا انداز دھیرے دھیرے ان نسخوں کی عادت بنتا گیا جو کلام سے کسی اور کا کام لینا چاہتے تھے اور مگن تھے کہ اپنی دنیا کی ترجمانی میں اگر وہ سب سے آگے نہیں تو کسی سے پیچھے بھی نہیں ہیں۔ سخن کا وقار کم ہوا اور فیضان کی راہیں دشوار طلب دکھائی دیں تو اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن، رسائل اور کتب سے ماخوذ اطلاعات کے ساتھ لوگ الفاظ پر حملہ آور ہونے لگے۔ ظاہر ہے کہ یہ ذہنیت اتنی ہی غیر تخلیقی ہے جتنا ان بزرگوں کا تھا جو موضوعات کی فہرست ساتھ رکھتے تھے یا ان پیش روؤں کا تھا جو خبر ناموں کی سرخیاں دیکھ کر جلال میں آتے تھے اور شعر میں مفید مطلب مضامین کی ہولناک ہوتے تھے۔ ایسی صورت میں تھک کر بیٹھ جانا، جانی بوجھی باتیں دہرانا اور ایک شور بے اماں سے سننے والوں کا اکتا جانا فطری تھا۔

پس میرا مسئلہ یہ ہے کہ شاعری اکثر کتابیں پڑھتے وقت تحیر کے پر اسرار چہرے کا احساس مجھ تک نہیں آتا۔ سب کچھ اتنا واضح، اتنا قطعی اور اتنا طے شدہ سا محسوس ہوتا ہے کہ شعر منظوم بیان کی پستی سے اٹھتا اور ابھرتا ہی نہیں، خیال کی ایک رفتیاں کی ایک سطح اور تجربے کی ایک ہی پرت دو چار گھڑیوں میں تاثر کو پھیکا کر دیتی ہے اور دھیان آتا ہے کہ اگر شعر پڑھنے سے مقصود محض چند بے چارے حقائق کی بازیافت یا واقعات تک رسائی ہے تو فرد کی شعری تجربے کو عام تجربے سے الگ کیوں کر کیا جائے؟ کیا شعر سے قاری کے مطالبات کوئی غیر ذہنی، جذباتی اور جمالیاتی بعد نہیں رکھتے۔ اور کیا شاعر کا طریق کار دانش کے منطقی دائروں کے عمل سے اور اس کا طرز اظہار علوم کے غیر انسانی حد تک مربوط و منضبط صیغۂ اظہار سے کلی مطابقت کا حامل ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں اور ظاہر ہے کہ نہیں تو پھر ہمارے بیشتر سخنوران کمال کسی ایسے راستے سے گزرنے اور ایسی منزلیں مارنے کا احساس کیوں نہیں دلاتے جو جدید علاوہ مفکرین کے روزمرہ کی ایک کمتر اور بگڑی ہوئی شکل سے مختلف دکھائی دے۔

حالات کی اس ابتری کا سبب یہ ہے کہ ہمارے بیشتر اصحاب فن شعری احساس اور نثری احساس میں فرق کرنے کی صلاحیت سے عاری ہیں اور نہیں جانتے یا جان کر نہیں مانتے کہ تجربات کی ڈھب کے ساتھ اسالیب اظہار کی نوعیت، ہیئت اور ماہیت میں چند ناگزیر، محسوس اور امتیازی تبدیلیوں کا در آنا

جنگی ہے، ان کے بغیر فن غیر فن سے جدا نہیں ہوتا۔ ان تبدیلیوں کے احساس سے بے نیازی اور ان کے عمل سے بے خبری نظمیہ شاعری کی روایت میں اس لیے پر پیچ ہوئی ہے کہ بعضوں نے نظم کے نام پر محض منظوم خاکے یا ESSAY لکھے ہیں۔ تمہید میں مضمون اختتامیہ۔ نظم اس طرح کے بعد دیگرے تین سے زینے پر قدم جماتی ختم ہو جاتی ہے۔ عام پڑھنے والا پہلے اور دوسرے منظر سے ہوتا ہوا جب تیسرے اور آخری منظر تک پہنچتا ہے تو اس کی کمی ایک بے روح سرگرمی کے متوقع صلے سے بھر جاتی ہے اور شاعری کی طرح وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو لیتا ہے کہ محنت حسب امید رائیگاں نہیں گئی اور ہاتھ در مقصود سے خالی نہیں رہے۔ عمل کے اس شوقیت کے بوجھ سے ان شعراء کی نظمیں نڈھال دکھائی دیتی ہیں جو نفسیات، عمرانیات، علم الانسان، فلسفے اور تاریخ کی کتابوں سے محصولہ معلومات یا ماس میڈیا کی بخشی ہوئی اطلاعات کو اپنی طرف تیسرے درجے میں منہمک اور مسرور رہتے ہیں کہ الفاظ کا ایک نظم نما مرکب تیار ہو جائے۔ یہ طریق کار صرف اسی وقت نتیجہ خیز ہو سکتا ہے جب علم و اطلاع میں چھپی ہوئی کرن شاعر کی جمالیاتی بصیرت کے احاطے میں آ سکے اور اس سے استفادے کی تحریک کوئی جذبہ انگیز باطنی جہت رکھتی ہو۔ محض محنت اور منصوبہ بندی اس نوع کی تحریک کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ بشری احساس اور شعری احساس کے مابین فاصلہ جتنا واضح ہے اتنا ہی پرپیچ اور دشوار گزار بھی ہے۔

کمال نے اس فاصلے کو عبور کرنے کی کوشش کئی سمتوں سے کی ہے اور ایک ساتھ کئی سطحوں پر۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شعری عمل اور امتیازی پہچان سے پہلے اس سوال پر توجہ ضروری ہے۔ حال کے بہت سے شعراء کی طرح کمال بھی اس زوال کے ماتمی ہیں جس کے سلسلے گھر اور گھر سے باہر کی دنیا میں دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ زوال ایک اجتماعی واقعہ ہے لیکن اس سے مفر ممکن نہیں۔ اور اس کے عرفان کے بغیر اس زندگی سے شاعر کے لگاؤ بے حقیقت ہوگا ہے حریفانہ رویے کو سمجھنا بھی محال ہے۔ جو اسے گزار رہی ہے یا جس کے آب و سراب سے وہ دوچار ہے۔ اس عام انسانی تجربے میں ایک نئی اور انفرادی جہت کی دریافت کمال نے اس طرح کی ہے کہ زوال کے اجتماعی درد کو ذاتی رشتوں کے انہدام کی ہزار شاخ جذباتی حقیقت میں منتقل کر دیا ہے۔ ایک معروضی، حقیقی اور منطقی سچائی کو ایک نفسیاتی، حسی اور تخیلی سچائی میں ڈھالنے کی جانب یہ کمال کا پہلا قدم ہے۔ گھر، بچے، دوست، رشتے ناطے دار اس بکھرتی ٹوٹتی سچائی کے مانوس ترین استعارے ہیں کہ معاشرتی زندگی کا سب سے مضبوط، معنی خیز اور گہرے روحانی انسلاکات پر مشتمل عنصر خاندان ہے۔ کمال کے اکثر قاری اس ضمن میں یہ سوال ہوتی ہے کہ کمال کی شاعری میں ذاتی رشتوں کے انہدام کی اس ہمہ جہت حقیقت کو انہوں نے بس ایک نئی محدود رابطہ اور شعری ہوئی فضا کے آئینے میں دیکھا ہے۔ تکرار و تصور کے تاثر سے بوجھل ہوئے ہیں۔ اور اس نکتے سے نا شناس گزر گئے ہیں کہ اگرچہ کمال کا ایک کلیدی شعری تجربہ گھر کی محبت کے احساس سے جنم لیتا ہے مگر یہی گھر ان کی اپنی شخصیت کا حوالہ بھی ہے۔ وہ رشتوں کی پہچان کے وسیلے سے اپنی پہچان بھی کراتے ہیں اور اس دنیا کی بھی جسے وہ برت رہے ہیں۔

(ابھی اپنے قدموں کو روکو ذرا)
جانتی ہوں تمہارے لئے غیر ہوں
پھر بھی ٹھہرو ذرا

میری امی ہو
میرے ابا ہو
میری آپا ہو
میرے ننھے سے معصوم بھیا ہو
میرے بچو تو ہو
میرے بچو تو ہو
میرے بچو تو ہو (اکیلی ۱۹۳۸ء میری نظمیں)

ایک ماں سیڑھی سے لڑھک گری
اک بہن اپنی آنکھوں میں آنسو لئے
دیکھتی رہی
ایک ننھا کھلونے کی امید میں
سر کو دہلیز پر رکھ کے سوتا رہا
ایک معصوم صورت دریچے سے سر کو لگائے ہوئے
خواب بنتی رہی
جنگ: ۱۹۳۹ء میری نظمیں

جانے پہچانے لوگ بیٹھے ہیں
پھر بھی ہم ملنے کی لذت سے
ایسے غافل ہیں جیسے ان سب نے
نوچ ڈالا ہے اپنی فطرت کو
(ہمسائیگی ۱۹ء میری نظمیں)

ہمارے ننھے کو چاہ تھی ریڈیو خرید یں
کہ اب ہمارے یہاں فراغت کی روشنی تھی
میں اپنی دیرینہ تنگ دستی کی داستاں اس کو کیا سناتا
ریڈیو: ۱۹۵۸ء بوند بوند دل

رات کو سونے سے پہلے
مجھ سے ننھا کہہ رہا تھا "چاند لاکھوں میل کی دوری پہ ہے"

کیوں چمکتے ہیں ستارے؟ ۔۔۔۔۔ دو غبارے ۔۔۔۔۔
کالی بلی کیا ہوئی
میرے ہاتھی کو پلاؤ گر مل پائی ۔۔۔۔ وہ کہانی ۔۔۔۔ مجھکو نیند آنے لگی
کاغذ کی ناؤ ۸۵ء ہوشیار دل

اس برس رنگوں کی رُت آئی تو میرے دونوں بچے
دیے بناتے تھے
سبز جنگل کا ہجوم
جھلملاتی دھوپ میں اڑتے ہوئے بھونروں کے ساتھ
میرے آنگن میں بہت دن منتظر ان کا رہا
اگلے برس کی بات ۱۱ ہوشیار دل

میں ان جگنوؤں کی یاد میں
تتلی کی پیشانی پہ اپنے ہونٹ رکھ دوں گا
بلائیں لوں گا اس مہتاب کی
جو ریزہ ریزہ ہو گیا میرے ہی آنگن میں
کہوں گا میں کسی آشفتہ سر سے
مجھ میں پل بھر کو سما جاؤ
زمستاں میں تمازت کے جزیرے میں بناؤں گا
(جزیرے ۱۹۶۷ء صفدر امام صفر)

یہ مرے جسم جو زنجیر سوچ خون ہیں
کل تلک آباد تھے
کھیتوں، گھروندوں، ساحلوں کی ریت پر
یہ مرے جسم
میرے دست و پا
میرے عزیز
میرے بچے میرے بھائی
میرے جلتے آنکھوں کے زرد پھول
یہ برہنہ جسم رسوائی کے پیراہن سے بھی آزاد ہیں
(محسوس جو ڈر اور شگ)

دل کشش و غم کا انداز نہیں
منہدم ہوتے ہوئے رشتوں کے ساحل پر کھڑا سوچتا ہے
وقت شاید دائرہ ہے
کوئی پر اسرار سا فطری عمل
اک سفر کے بعد پھر دوسرے پر گامزن
دوستوں اپنوں عزیزوں ہمدموں کی صورتیں
ہو گئی تھیں خاک و خوں میں جو نہاں
عین ممکن ہے وہ جسم و جاں کی لذت کی امیں
لالہ و گل میں نمایاں ہو گئی ہوں گی کہیں
دلِ سادہ (نزہت ہونگ)

تم ہوا سے پوچھتے ہو کون سی گلیوں سے ہو کر آئی ہے
کون سے آنگن میں روشن تھے گلاب؟
کون سی کھڑکی میں آویزاں تھی چشمِ آفتاب
کون سی آواز میں خاموشی اسرار تھی؟
کون سا آنچل چمکتے نیلگوں آکاش کا ہمراز تھا؟
ایک نظم (نزہت ہونگ)

وہ تنہا گاؤں جلتا ہے
وہ میرے سبز پتے گنگناتے پیڑ جلتے ہیں
وہ میرے لوگ جلتے ہیں
مری آواز جلتی ہے
مرا ہر گیت جلتا ہے
یہ منظر کیوں بکھر جاتا ہے چہرے پر
تماشائی کہیں ہوں میں تو منظر ہوں
تسلسل (نزہت ہونگ)

واحد متکلم کے صیغے کا یہ فورہ تو ہر تجربہ جہاں کا جس نوعیت کا بھی ہو اپنے ملک کے فرقہ وارانہ فساد کا یا جغرافیائی حدود کو توڑتے سمٹتے ہوئے عالمگیر تہذیبی فساد کا اس تجربے کی تمام کڑیاں ذاتی ہیں۔ میری آواز میرے گیت، میرے پیڑ میرا گاؤں میرے عزیز میرے بچے میرے بھائی میرے آنگن کے پھول؟ ہم آیا بھی تو اس طرح کے میں کی حد یہی بس صف بجز سے چالیس (ہمارے شعر کو چاہ تھی ریڈیو خرید لیں) یعنی اس ہم سے مختلف جو کبھی بورژوا کی مخالف، مجبور اور محنت کش فوج سے عبارت تھا اور آج من و تو کی امتیازات پر حاوی تہذیبی فساد میں مبتلا ایک عالم کا استعارہ ہے۔ پھر اظہار کا اسلوب بھی سرگوشی، خودکلامی یا آپس کی بات چیت کے لہجے سے بہت قریب، مدھم دھیما، متین اور مہذب۔ لیکن کوئی نے اوپر سے مختصر اور بہ ہو دکھائی دینے والے اس دائرے میں کتنی گنجائشیں نکلی ہیں کہ تجربے کی اس انتہائی شخصی اور منفرد زنجیر کے حلقوں میں ان کی دنیا کا کم و بیش ہر حتی خبر سمٹ آیا ہے۔ ان مثالوں میں وہ المیہ جو ایک معاشرتی صداقت ہے ایک ذاتی واردات کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ ایک فرد کی سرگزشت قریب و دور کی ایسی دنیاؤں کا حال بن جاتی ہے جو اس کے تجربوں میں شامل ہو کر اس کی اپنی شخصیت کا حصہ دکھائی دیتی ہیں۔ سہل پسندانہ تعمیم سے کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ کوئی کی اس نوع کی نظمیں ذاتی المیہ

ہیں۔ محض ذاتی حوالوں کو رنگ و خط سے آراستہ لیکن یہاں بھی کول کے لہجے کی شائستگی، ضبط، دھیمے پن اور وقار نے ان کا دفاع کیا ہے اور انہوں نے اپنے احساسِ الم کو جو طلبانہ خود آگہی کے نقطے سے دیکھا ہے تسلسل کے یہ مصرعے:

یہ منظر کیوں بکھر جاتا ہے چہرے پر
تماشائی نہیں ہوں میں تو منظر ہوں

ذات اور غیر ذات کے بیچ کی اس دوری یا دوئی کو ختم کرنے کا پتہ دیتے ہیں جس کے بغیر بیرونی دنیا کے تجربے شخصی سچ تک نہیں آتے۔ تاہم یہاں میں (کہ ایک منظر ہے) شاعر کے جذباتی وجود سے الگ اور ماورا اپنے آپ میں مکمل ایک کردار بن جاتا ہے۔ یہ کردار کسی دوسرے کردار کا عکس نظر آنے اور اس کے اتباع میں اپنے تجربوں کے دوران کسی جذباتی ردِعمل کا اظہار کرنے کی بجائے آپ اپنے عمل کا مظہر دکھائی دیتا ہے۔ اس منظر کے تماشائی (قاری) کو یہ آزادی دیتا ہے کہ وہ شاعر کی نظر سے اس منظر کو دیکھنے کی بجائے اپنے طور پر اس سے گذرے۔ دیکھنے والا آزاد ہے۔ اس سے ایک نتائج اخذ کرتا ہے۔ کول کے شعری طریقِ کار میں اظہار کی یہ جہت ایک بنیادی وجہ کی حامل ہے کہ اس طرح جو ہر داستان کے بیان میں ذاتی حوالوں کی گرفت کے باوجود اپنے شاعرانہ وجود اور تجربے کے مابین ایک غیر معروضی فاصلہ پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ رویہ ان نقیبِ ترقی پسند شعراء کے عمومی طرزِ اظہار سے مختلف ہے ترقی پسند شعراء اور ان کی لیک پر چلنے والے نئے شعراء کے کلام میں بیان کا یہ نقص بہت نمایاں ہے کہ وہ اپنے قاری کے حواس پر ہر وقت پہرہ بٹھائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قاری کو نجی تصور کر کے نہایت فرصت کے ماحول میں کبھی تحکمانہ لہجے میں، کبھی اونچی آواز میں بڑی وضاحت اور صراحت کے ساتھ اس سے خطاب کرتے ہیں۔ قاری کو ہمیشہ اس حقیقت تک لے جانا چاہتے ہیں جو ان کی اپنی دریافت ہوتی ہے یا جس کی بندشوں سے وہ رہا نہیں ہو پاتے۔ "سنو دیکھو آؤ یارو دوستو کیا ہم اور ہم لوگ جیسے الفاظ ترقی پسند شاعری کے علاوہ نئی شاعری کے بعض حاشیہ نشینوں کے کلام میں بھی ایک بازاری آہنگ کی نمود کا سبب بنے ہیں۔ ایسے تمام شعراء کے یہاں نمائش پسندی کے ساتھ ساتھ راہ نمائی اور تلقین کا جذبہ ابھر آتا ہے گویا وہ اپنی قیادت میں ایک پورے گروہ کو اس منزل تک لے جانے کی جدوجہد کرتے ہیں جس کا مرکز کوئی دانائی کی آگہی ہوتی ہے یا آگہی ان کے تئیں حرفِ حق ہوتی ہے جسے قبول کرنا سب پر واجب ہوتا ہے۔ شاعر خود کو دیوتا یا نجات دہندہ تصور کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اندھی بھیڑ کو راہِ راست پر لگانے یا اس بھیڑ کے ساتھ کچھ معرکے سر کرنے کا فریضہ صرف اس پر عائد کیا گیا ہے۔ اس طرح اظہار کے آہنگ میں ایک کم عیار خود ستائشی کا عنصر خود بخود شامل ہو جاتا ہے اور الفاظ کے تانے بانے سے ایک ایسی تصویر ابھرتی ہے جو مجروح ہے اور انہی جراحتوں کا بازار دیتی ہے جو مطلوب ہے اور

اپنی اس اوہر متحیر جو بیرآنے جانے والی سے کہتی ہے کہ ایک عالم دوبے آزار ہے اور ایک عالم گنہگار، جو اپنی افسردگی ہی کو وجہ نشاط بنا لیتی ہے۔ اس کے برعکس کول کا رویہ ان کی مجموعی شعری آہنگ کی غم روحانی فضا کے باوجود حقیقت آگیں ہے۔ وہ آپ اپنا ہدف بنتے ہیں اپنے آپ سے پشیمان ہوتے ہیں حرم کی اس دست آویز پر اپنے دستخط بھی دیکھتے ہیں اور ایک دنیا کی مانند خود کو بھی جواب دہ قرار دیتے ہیں۔

آسمان تک سلگتے ہوئے حرم کے شہر میں
چاہتا ہوں لہو ڈالتے سے گھر میں پریشان نہیں
چاہتے ہو لہو ڈالتے سے گھر تم پریشان نہیں
میں جو زندہ ہوں میں کون ہوں
تو جو زندہ ہو تم کون ہو

(احمد آباد رائٹنگ)

جلنے لگتے ہوئے اس شہر کے تمام مکین ایک دوسرے کے ہم سفر تھے۔ ڈار کی ڈور میں ایک دوسرے سے منسلک شہر کا شہر جل چکا یہاں تک تو حقیقت اپنی سرگذشت سناتی ہے سوال کی ساعت اس وقت سر اٹھاتی ہے جب اس دھواں دھواں شہر میں ایک ننھے بچے کا ہیولیٰ ابھرتا ہے

وہ تو ننھا تھا معصوم تھا
اس کو سورج کا یا چاند کا عکس سب نے کہا
وہ بھی جلنے لگا وہ بھی بہتے ہوئے لہو میں پگھلنے لگا
وہ سچا تھا وہ آخری نور تھا اس کی تقدیر میں
مرگِ بے کار کیوں آج لکھی گئی۔

یہ بچہ انسانی رشتوں کا سب سے مستحکم اور معنی آفریں استعارہ ہے کہ اس کے توسط سے حال اپنے مستقبل کا سراغ پاتا ہے۔ حرم کا یہ شہر ان رشتوں کے انہدام کا عکس ہے۔ کول کے نظامِ احساس کی سب سے نمایاں اور نقاہ بخش حقیقت کہ اس ایک حقیقت میں وہ تمام حقیقتیں جن کا تعلق شاعری کی روایت، تہذیب، تاریخ اور معاشرت سے ہے۔ خاموشی کے ساتھ سما جاتی ہیں اور اس حقیقت کو ایک ہمہ جہتی حقیقت بنا دیتی ہے۔ ہر چند کہ اس نظم میں کول کی شعری سرشت کے تشکیلی دور کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ امتیازی پہلو بھی روشن ہوتا ہے کہ صاف سیدھی لکیروں اور روشن شکلوں کے بے جانی کو چھپانے کیلئے وہ انہیں متحرک دائروں میں ڈھال دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک اور اہم واقعہ یہ ہے کہ کول کی پچھلے برسوں کی شاعری میں فکر کے ناؤں اور نوکیلے استعارے بتدریج کم ہوئے ہیں رائٹنگ کی بیشتر نظموں میں آہنگ کچھ اور پیچ دار ہوا ہے۔ لہجے نے ایک نئی سچ تلاش کی ہے اور اس کی پلوانگی میں اضافہ ہوا ہے۔ اس عرصے کی زیادہ تر اچھی نظمیں

منجمد مادی پیکروں کے حدود تعین سے نکلتی ہوئی ایک ایسی نیم روشن فضا کی جھلک دکھائی دیتی ہیں، جس کے ترکیبی اجزا کی قطعی اور دوٹوک شناخت اور وضاحت ممکن نہیں۔ ان میں رنگ آپس میں گھلے ملے اور لکیریں ایک دوسرے سے الجھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں ایک نیم تجریدی ماحول آفرینی کے ساتھ۔

(ابھی غیر دلچسپ ہو جائیں گے ہم)

ابھی تم زباں پر
سلگتی ہوئی ریت کا ذائقہ چند لمحوں میں محسوس کرنے لگو گے
ابھی میں زباں پر
کوئی خوبصورت فرشتہ صفت نام تنہائیوں میں نہیں لا سکوں گا
ابھی ذہن بیمار ہو جائیں گے سب
ابھی خواب لاچار ہو جائیں گے سب
فلک تک پہنچتے ہوئے ہاتھ بیمار ہو جائیں گے سب

(ایک نظم ۱۹۶۵ء سفر مدام سفر)

میں تو بچھڑ کر ایک عظیم گماں تھا
وہ مجھ کو دست مہرباں میں سونپ کر
چلی گئی تو میں خودگی کی بیکراں مہیب دھند میں
بھٹک گیا
ہر ایک رہگزر پہ گاڑیوں بسوں کا کارواں امڈ پڑا
عجب انقلاب تھا، مری نظر کے سامنے
وہ ایک پل میں سب سپید ہو گئیں
سپید سب سپید، ان کے پہلوؤں، جبین اور پشت پر
صلیب کے نشان دفعتاً ابھر کے آ گئے۔

(ایمبولنس ۶۶ء سفر مدام سفر)

دو دشتوں سے جب پار ہو گیا
اس کے چہرے کے سارے حسیں زاویے
اجنبی ہو گئے دھند میں کھو گئے
ہر ملاقات جس کی خلش داستاں تھی حماقت ہوئی
میں کہاں سے چلا تھا کہاں آ گیا
دل کے آفاق پر
بے کراں فاصلوں کا اندھیرا ابر کیوں چھا گیا

(دوکا لمحہ جاوداں (سفر مدام سفر))

میں صرف آئینہ ہوں
جس کو اپنا عکس کہتا ہوں وہ مرا دشمن ہے بدکار
میرے قتل کی خواہش سے
جسم آئینہ میں مضطرب رہتا ہے روز و شب
وہ تو دو تیرگی سے ماورا ہے
دوسری آنکھ اس کے مرکزی محور پہ رہتی ہے
میں ہر پہلو سے اس کے روبرو ہوں
اس کی خاطر زندگی کے ایک لمحے کو مسلسل دوسرے
سے منسلک کرتا ہوں
شاید سلسلہ بجز عمل ہے خواب منظر میں ہوتا ہے

(آئینہ، بڑا ہو سنگ)

منظر میں ہوتے ہوئے خواب، فلک تک پہنچتے ہوئے ہاتھ، فاصلوں کا اندھیرا ابر، خودگی کی بیکراں مہیب دھند، یہ تمام تصویریں حرکت پذیر اور سیال ہیں تشکیل کے عمل سے مربوط ہیں اور ہر آن بنتی بگڑتی اور بدلتی جا رہی ہیں۔ انہیں اگر بچوں کا جلوس، شکن کے طوطے، نرگس کا گھوڑا، خرگوش کا غم، ناریل کے پیڑ، کاغذ کی ناؤ اور لگے برس کی بات جیسی نظموں کے شانہ بشانہ رکھا جائے تو کول کے شعری احساس اور اظہار کی ایک نئی صورت حال سے تعارف ہوتا ہے۔

میں اس صورت حال کو کول کے سفر کی ایک نئی یا تیسری منزل سے تعبیر کرتا ہوں کہ پچھلے دس برسوں میں انہوں نے اس تسلسل کو ایک نیا رخ دیا ہے جس پر کبھی کبھی تکرار کا گمان ہوتا ہے۔ اس منزل پر کول کی شاعری ایک نئے ذائقے کا اور ان کے مدرکات کی ایک نئی جہت کا احساس دلاتی ہے۔ سب حقیقتیں اشیا اور اسماء کی مانوس سطح سے جست لگا کر ایک بے نام بے کنار فضا میں تبدیل ہوتی ہوئی اور ایک نئے تخلیقی کینوس پر رنگ بکھیرتی ہوئی سامنے آتی ہیں۔ اس کینوس کے خاکے ترتیب کے مرحلوں سے مسلسل گزر رہے ہیں دوسرے لفظوں میں انہیں ایک ایسے عمل کا عکس کہا جا سکتا ہے جو جاری ہے۔ بڑا ہو سنگ کی نئی نظموں مثلاً موت سے ماورا صرف انسان ہے، روزن، پہلا مسافر، آخری مسافر، حلقۂ آزاد، اسیر خاک اور گریزاں ستارہ میں احساس و اظہار کا یہ عکس لرزاں دکھائی دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کول کی شعری حسیت اس موڑ پر ترفع کی اس سطح پر پہنچ گئی ہے جو سیدھے ظواہر کی دسترس سے آگے ہے اور اپنی اڑان کیلئے اس آزاد اور عظیم پھیلاؤ کی جانب رواں ہے جہاں لفظ استعارے اظہار کے محدود اور بے لوچ سانچے پگھل جاتے ہیں۔ جہاں تخیل کی جسارتیں ایسے رنگوں میں ڈھل کے پیمانے ڈھونڈ لاتی ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے متضاد نظر آتے ہیں اور جہاں تجربے کے تعاقب میں قاری کو الفاظ کی ان دیکھی سطحوں تک اور تلازمات کی ایک انوکھی دنیا تک جانا ہوتا ہے۔ اکیلی سے اصوا آباد تک کہیں بھی کول نے اظہار کا دوٹوک اور سہل الحصول طریقہ نہیں اپنایا ہے جو بیان اور تجربے دونوں کی جلد کے آر پار دیکھنے کے بجائے محض ان کی اوپری سطح کا پابند ہو کر رہ جاتا ہے۔ بڑا ہو سنگ کی شاعری مجموعی طور پر ایک ایسا داخلی منظرنامہ ہے جس کا مفہوم و مقصد اپنی

ترسیل کیلئے قاری کی اس آنکھ کے کھلنے کا منتظر اور متمنی ہوتا ہے جو دیکھنے بھی سوچنے بھی اور ظواہر کے اندر چھپی ہوئی اَن دیکھی تصویروں کی دریافت اور شناخت پر قادر بھی ہو جاتی پہیلی زمینوں سے ارتفاع کی کوشش کا نقطۂ عروج ٹرانسفارمیشن کی ایک نظم پرندہ ہے۔ یہ پرندہ صرف ایک سوال ہے یا صرف آنکھ کے ذریعے اپنے پورے پیکر کا اظہار کرتا ہے حقیقت کو تجرید کا رنگ دیتا ہے اور اس طرح ایک تحیر آمیز اور سیّال استعارے میں ڈھل جاتا ہے۔ اس کی پرواز سے یہ منظر دکھائی ہے کہ

ہجومِ سنگ و آہن میں
کوئی آواز دیتا ہے کوئی آواز سنتا ہے
مگر آواز سے آواز کا رشتہ نہیں ہوتا
مگر آواز سے آواز کا پھر سلسلہ پیدا ہوتا ہے

پھر شاعر اپنے آپ سے اپنی روح کی پہنائیوں میں بھٹکتے ہوئے پرندے کو دیکھ کر کہتا اور پوچھتا ہے

یہ منظر تیرا ہے آب جو میں پائے ہیں لیکن اجنبی
میں منظر ہوں یہ تسلسل ہوں
مگر میں اجنبی کیوں ہوں
یہ فرش آب وگل میرے لئے ایک سلسلہ کیوں ہے؟
پرندہ آسماں کی نیلگوں محراب کے اس پار رہتا ہے
پرندہ فاصلہ کیوں ہے؟
پرندہ ماورا کیوں ہے؟

یہ الجھن اور گریہ اور سوالوں کا طویل تر ہوتا ہوا سلسلہ کول کو اس عمیم فلسفیانہ اضمحلال سے ہم کنار کرتا ہے جو ان کے حواس کی فعلیت اور سرگرمی کا سبب ہے۔ تصویر یا منظر چاہے خارج کی سطح پر ابھریں یا شاعر کے باطن کی بساط پر اپنی پیچیدگی اور تابانی کے سبب اپنے دھندلے اور اسرار آمیز دکھائی دیتے ہیں کہ کول کی شاعری میں ایک قدیم معمے کی مثال بن گئے ہیں۔ کول کی بصیرت ان میں ربط کا سرا ڈھونڈ رہی ہے اور اس بنتے اور بگڑتے ہوئے بکھرتے اور پھیلتے ہوئے منظرنامے کے معنوی ربط کی متلاشی ہے۔ یہ تلاش انہیں اپنی زمین اور زماں کے متعین دائرے سے نکال کر اس گہرے مہیب خلاء کی جانب بھی لے جاتی ہے جس میں حقیقتوں کے صد پارہ ٹکڑے کھو گئے ہیں۔ اس طرح آسماں کی نیلگوں محراب کے اس پار بھی فرش آب وگل پھیلے ہوئے ہیں اور روح کا دائمی تسلسل پرندہ کر اپنے مقید ہونے کے احساس سے مضطرب بھی ہے۔ جسم وجاں کے حصار سے نکل کر اس سلسلے کے ساتھ اپنے سوالوں میں کھو جاتا ہے۔ کول کا اندوختہ یہی سوال ہیں کہ وہ شاعر ہے۔ رہے جواب تو ان کا معاملہ دانش حاضر سے طے کیجئے۔

☆

۔بقیہ: شکاری پرندے۔

دونوں نے آواز لگائی۔ ہم کیا کریں؟

میرا خیال ہے کہ یہ دونوں صبح تک مر جائیں گے زخم کی وجہ سے۔ ویسے چاہو تو۔۔۔ ان دونوں کا گلا دبا کر بھاگ لو تم دونوں کی نا اہلی اور نمائی۔۔۔ سوئی گالی۔۔۔ کی وجہ سے موڈ خراب ہو گیا ویسے تمہیں شکایت نہیں ہونی چاہئے، الفت خان کے ساتھ اچھی عیاشی کروا دی۔ بائی۔۔۔ وہ زور زور کا موٹر سائیکل اڑاتا چلا گیا۔ پرویز اور انیل تھوڑی دیر تک سامان سمیٹتے رہے پھر کہنے لگے۔ چھوڑو خود تو دفع ہو گیا ہمیں پھنسانا چاہتا ہے ہم بھی بھاگ لیتے ہیں۔ اور وہ دونوں بھی چلے گئے۔ تب میں نے اپنا فون نکال کر پاپا کو فون کیا۔ اور ان سے کہہ دیا تھا کہ پاپا کو بھی لیتے آئیں۔ میں بمشکل الفت خان تک پہنچا۔ وہ تو بے ہوش تھا۔ سمندر کا پانی بھی ہماری طرف آ رہا تھا ہوا کا بھی طوفان تھا اور چاروں کا دردھی بڑھ رہا تھا۔ میں نے تم دونوں کو بمشکل پانی سے دور گھسیٹا اور پھر ایک پتھر پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ پاپا اور چچا نے باری باری تمہیں اور الفت کو گاڑی میں ڈالا۔ تم سر کے زخم کی وجہ سے اور الفت ڈرگ اور ڈوز میں دھت میں زخموں سے چور خاص کر تمہاری حالت خون بہنے کی وجہ سے خطرناک۔ ہمیں کسی طرح گاڑی میں لا دا گیا۔ پھر ہسپتال گئے ابو کے دوست کی وجہ سے کام بن گیا۔ تمہیں انجکشن لگا کر میں لا کے گئے۔ الفت کو ہسپتال داخل کر دیا گیا گھر والوں کا نمبر انہیں دے کر ڈاکٹر نے بتایا کہ ان لوگوں نے اس کے ساتھ بہت زیادتیاں کی تھیں پہلے ڈرگ دی پھر۔۔۔ sex abuse کیا میرے پاپا تمہارے دروازے پر تمہیں چھوڑ کر دور سے دیکھتے رہے اسی وقت تمہارے پاپا پہنچ گئے جب وہ تمہیں اندر لے گئے پھر ہم واپس آ گئے۔ ان سب کا تعلق بڑے خطرناک گروہ سے تھا اسکے ذریعہ ہو کر اچھی خبر یاد کر گئے۔

اور یوں نے پھر رابطہ نہیں کیا اسلئے نہیں کہ وہ ہماری اخلاقیات سے متاثر ہو گیا تھا بلکہ اس واقعے کے۔۔۔ کچھ دنوں بعد ہی وہ موٹر سائیکل کے ایکسیڈنٹ میں شہ رگ ٹوٹ جانے سے مفلوج ہو گیا تھا جانے مر گیا یا زندہ ہے اور انیل اور پرویز۔۔۔ عیش منانے اور چھٹیاں گزارنے ساوٰتھ گئے تھے تو انہیں امریکن فوجی پکڑ لے گئے انکا شک تھا کہ یہ القاعدہ کے کارندے ہیں۔

How funny ? ہے نا خالہ بی؟ الفت خان نے ہمارے اس جیسی کالج کے بجائے عام غریبوں والے کالج سے فرسٹ کلاس میں بی اے کیا اور اسکے ماموں نے اسے امریکا بلا لیا۔ اسکی والدہ نہیں تھی بیچارے کی قسمت کھل جائے گی۔

میں نے اطہر سے کہا چلو خدا کا شکر کرو۔ poetic justice ہو گئی۔ جلد یا بدیر زمانے کی گردش انسانی شعور کو عطا کرتی ہے" جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بھی برائی کی ہو وہ اسے دیکھ لے گا۔" القرآن آیہ ۸ سورہ ۹۹۔ زلزال

# ادب کی تلاش

ڈاکٹر خلیق انجم (دہلی بھارت)

بلراج کومل شاعر ہیں، افسانہ نگار ہیں اور نقاد ہیں۔ شاعری میں اب تک ان کے پانچ مجموعے میری نظمیں، رشتۂ دل، سفر مدام، سوز بہ سنگ اور پرندوں بھرا آسمان شائع ہو چکے ہیں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے ان کی شاعری کا انتخاب بھی شائع کیا ہے۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "آنکھیں اور پاؤں" اور ہندی میں ایک ناولٹ "ہریالی کا ایک ٹکڑا" شائع ہو چکا ہے۔ یہ تفصیل بیان کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ بلراج کومل شاعر، افسانہ نگار اور نقاد ہیں لیکن ان کی شخصیت کا بھرپور وسعتوں کے ساتھ شاعری اور شاعری میں نظم میں اظہار ہوا ہے۔ افسانوں کی شخصیت و کردار پر کچھ اور روشنی پڑتی ہے۔ بلراج کومل کے تنقیدی مضامین اور تبصرے ان کی فکر و نظر ہے ان کی ادبی قدروں کو اتنے صاف اور واضح انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ان کی روشنی میں بلراج کے تخلیقی کارناموں کا جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ بلراج کی تخلیق میں انسان اور اس کے مسائل کے ساتھ ایک گہرا اور مسلسل تعلق بھی نظر آتا ہے۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں گہرا تنقیدی شعور اور ایک فکری فضا نظر آتا ہے۔ اردو میں تنقید اور تخلیق ادبی سرگرمیوں کے دو الگ الگ شعبے ہیں۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کسی نقاد نے اعلیٰ درجے کا تخلیقی ادب پیش کیا یا کسی تخلیقی فنکار نے اعلیٰ درجے کی تنقیدی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ بلراج کومل ان بہت کم تخلیق کاروں میں ہیں جو تنقید کی بہترین صلاحیت رکھتے ہیں۔ جنھوں نے اردو اور انگریزی کے تنقیدی ادب کا گہرا مطالعہ کر کے زندگی، ادب، فرد اور سماج کے بارے میں اپنی رائے قائم کی ہے اور جن کی تحریروں میں ہر چیز کے بارے میں سوچی سمجھی رائے ملتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ اگر ۱۹۳۶ء سے لیکر ۱۹۵۰ء تک کے اردو کے بہترین تخلیقی اور تنقیدی ادب کا انتخاب کیا جائے تو اس ادب میں اکثریت ان ادبی شہ پاروں کی ہوگی جن کے خالق اصل معنی یا اصطلاحی معنی میں ترقی پسند تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض ترقی پسند ادیبوں کا ذاتی کردار کچھ بھی رہا ہو ان کا ایک مقصد، ایک نصب العین، ایک سمت اور منزل تھی۔ ہندوستان کی تاریخ میں آزادی اہم ترین واقعہ تھا لیکن ادیبوں اور شاعروں کے لیے یہ واقعہ خاصا پریشان کن تھا۔ ان کے سامنے کوئی منزل اور کوئی مقصد نہیں رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بقول بلراج کومل ادب کی مثبت اقدار اور زندگی کی معنویت کو بنیاد بنانے کے بجائے لفظوں کی ترتیب اور اشکال کو شاعری سمجھا جانے لگا۔ ان مسائل کو موضوع بنایا گیا جو ہمارے مسائل ہی نہیں تھے۔ تنہائی، بے چہرگی اور ذات کے کرب کے نام پر زندگی کی بے معنویت اور بے مقصدیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور بلراج کومل کے قول کے مطابق لفظ اور معنی اپنا توازن کھو بیٹھے۔ "ادب کی تلاش" میں شروع میں دو مضامین ہیں "ادب کی تلاش" اور "جدید ادب" ان دونوں میں ۱۹۵۰ کے بعد پیدا ہونے والے اردو ادب کے حوالے سے تنقیدی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ ادب، ادیب، صاحب اقتدار طبقہ، پیشہ، سماجی وقار، آسائش کے سامان، شہرت وغیرہ کے باہمی رشتوں پر انتہائی عالمانہ اور غیر جانبدارانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ بلراج کومل نے اصل ترقی پسند اور اصطلاحی ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں میں بڑی معقول تفریق کی ہے۔ انہوں نے ان ادبی رویوں اور مظاہر کی نشاندہی کی ہے جو اصطلاحی ترقی پسندوں سے متعلق ہے۔ بلراج کومل کے پہلے مقالے "ادب کی تلاش" کا ایک پیراگراف نقل کرنا اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اس پیراگراف میں ادب کے سلسلے میں بہت اہم اور بنیادی باتیں کہی ہیں۔

"ادیب و فنکار کا حقیقی مرتبہ ادب اور فن کے معیار اور قدروں سے متعین ہوتا ہے۔ وہ شخص جو صاحب اقتدار طبقے کی قدر مستحکم کو قبول نہیں کرتا۔ کسی سماجی مرتبے کا مالک نہیں ہوتا لیکن جب انکار کا عمل اثر اندازی کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ شخص پہلے توجہ کا مرکز بنتا ہے پھر ایک حلقہ اثر کا مرکز اور آخر کار دوسرے ہم خیال لوگوں کی مدد سے ایک تحریک کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ اس عمل کے ذریعے وہ فرد یا افراد ایک قدر نو کو جنم دیتے ہیں۔ جو ایک مخصوص سماج کی مروجہ اقدار سے افضل تر ہوتی ہے۔ جب یہ عمل اپنی انتہا پر پہنچ کر اپنا تحرک کھو بیٹھتا ہے تو انکار اور بغاوت کا بیج ایک بار پھر بویا جاتا ہے۔ ادب کی پوری تاریخ انکار اور بغاوت کی تاریخ ہے۔۔۔۔ ادب کی پوری تاریخ میں ہمارے عزیز ترین کردار وہ ہیں جو انکار و بغاوت کی علامت کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں چاہے وہ کردار دستوفسکی کے ہوں یا ترگنیف کے یا پریم چند کے"

زیر نظر کتاب کا دوسرا اہم مضمون "جدید ادب ایک رویہ" ہے۔ اس مضمون میں جدید فنکاروں کے تخلیقی رویوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مقالے میں شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ضبط مستقیم کی شاعری اور بے ضبطگی کی شاعری بہت معقول طریقے سے ان دونوں قسموں کی خصوصیات بیان کی ہیں۔

بلراج کومل کے قول کے مطابق اقبال، غالب اور عباس اطہر کی شاعری بے ضبطگی کی شاعری ہے۔ اس سلسلے میں عباس اطہر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے بلراج کومل صاحب لکھتے ہیں۔

"عباس اطہر کے یہاں الفاظ میں ایک پر اثر اور شدید تحریک ہے الفاظ اور مصرعے تیکھے اور نوکیلے ہیں۔ ان کے اندر چونکا دینے والی قوت ہے۔ ایک عجیب و غریب دیوانگی، پوری نظم کا مفہوم آسانی سے مرتب نہیں ہوتا لیکن نظم اپنی قوت کا احساس دلاتی ہے۔" اپنے اس بیان کی تائید میں بلراج صاحب نے عباس

باقی: صفحہ نمبر 45 پر

# نقشِ گریزاں

جناب سراج کول کے کلام سے مختصر انتخاب

فاری شا (لندن)

## تکمیل

جب موسم کی پہلی بارش چھم چھم کرتی آئی تھی
میں نے تمہیں
گھر کے ہر گوشے میں ڈھونڈا لیکن تم
کہیں نہ تھیں
میں موسم کے جادو میں
کھویا ہوا
کمرے کی کھڑکی کے شیشے سے چپکا
رنگ و نغمہ کی سرشاری اپنے جسم و جاں میں کوشش بھر
جذب تو کرتا جاتا تھا
لیکن تم اس ساعت میں
چونکہ میرے ساتھ نہیں تھیں موسم کا یہ جشن مجھے
آدھا اور ادھورا سا
لگنے لگا

ناتکمیلی کے عالم میں جب کھڑکی کے شیشے سے
میں نے تمہیں
سر سے پا تک اک رقصاں تصویر کی صورت بارش کی وارفتہ
موجوں میں ڈھلتے دیکھا
میں بھی فقط
ایک جست میں سب دیواریں پھاند گیا
سارے سلاسل سے آزاد
جا پہنچا دیوانہ وار تمہارے پاس
موسم کے بے پایاں جشن میں ساری حدوں کے آر اور پار

## پارہ پارہ ایک کتاب

باقیاتِ خانۂ دل میں جواہر اب کہاں
اور اس کنجِ قفس میں جس کا میں مہمان ہوں
چار سو بکھرا ہوا تھا میرے بچھڑے رفتگاں کے اور میرے اجداد کا
کھو گیا تھا آج میں دشتِ منظر میں کہیں

وہ جو آیا تھا مجھے
سارے متروکات سے آزاد کرنے اس نے ہاتھوں سے سمیٹا سب کباڑ
اور ایک گٹھڑے میں باندھا
جب وہ اس کو
سر پہ رکھ کر
پاس کے اپنے ٹھکانے کی طرف چلنے کو تھا
میں نے دیکھا اجڑی بچھڑی پارہ پارہ اک کتاب
حیرت و حسرت کی صورت
اس کے گٹھڑے کی کسی نادان کھڑکی سے
مری جانب مسلسل دیکھتی جاتی تھی
جیسے کہہ رہی ہو
میں تو صدیوں سے رہی تھی
آپ کی ہم راز و دیرینہ رفیق
آپ نے یہ کیا کیا
مجھ کو رخصت کر دیا۔
میرے اندر جاگ اٹھی ہے نئی قوت کوئی
آگے بڑھ کر چھین لی ہے میں نے گٹھڑے سے پرانی پارہ پارہ وہ کتاب
اس کو آنکھوں سے لگاتا ہوں اسے میں چومتا ہوں آنسوؤں کے درمیاں
پڑھ رہا ہوں آج پھر اس کو یہ ممکن ہے کہیں اوراقِ پارینہ میں ہو
تشنگی میں قائم و دائم کوئی ان جانا خواب
یا حیات و مرگ کے اسرار کا
بھولا بسرا یا کوئی تازہ جواب۔

## اداکار

جان کاؤس اور نا ڈیا
میری تازہ فلم میں وہ
میری عرضی پہ رول ادا کرنے کی خاطر
بھولے بسرے جادو بکھرے
کسی دیس سے آئے ہیں
کتا، گھوڑا اور بچہ۔
میری فلم کے باقی کے
عام سے سب کردار مگر
غائب ہیں
وقت ہو چلا لیکن ان کی خبر نہیں
ملتوی کر دوں آج کی شوٹنگ
یا پھر میں
سوچتا ہوں
میں جو اکثر سب کی کایا کی پرتوں سے گزرا ہوں
محض تماشائی پن سے آگے نکلوں
ایک اکیلا میں ہی اپنا رنگ بدل کر
روپ بدل کر
اپنے رول کے ساتھ ساتھ ان کا بھی رول نبھا ڈالوں
اور اپنی
آخری فلم
کسی طرح
آج مکمل کر ڈالوں

## لہلہاتا پیڑ

ایوانِ روز و شب میں جب داخل ہوا تھا میں
لایا تھا اپنے ساتھ میں تاریخ رو جہاں
اشیائے نو بہ نو کی تھی فہرس بڑی طویل
لمبے سفر کے فیض سے مجھ کو ملے تھا تحفہ و انعام بھی کئی
رشتوں کے جشن، چاہتیں، خوشیاں ہزار ہا
لیکن کبھی کبھی
کچھ ایسے فاصلے
بے برگ و بار فاصلے بھی قربتوں کے درمیاں حائل ہوئے
تو مجھ کو یوں لگا
میرے کسی گناہ کی مجھ کو سزا ملی
میں نے نگر بتا لیے تھے رفتہ رفتہ ان پر بل گئی
جن کے طفیل آج بھی میں گامزن ہوں زندگی کی راہگزر پر
لہلہاتے پیڑ کی طرح
میں جاوداں نہیں
لیکن میں وصلِ آب و گل کا شاہکار ہوں
میں انتہائے لامکاں کا راہوار ہوں

## کاغذ کی ناؤ

رات کو سونے سے پہلے
مجھ سے ننھا کہہ رہا تھا چاند لاکھوں میل کیوں کر دُور ہے
کیوں چمکتے ہیں ستارے ـــــ روٹھ جائے کالی بلی کیا ہوئی؟
میرے ہاتھی کو پلاؤ گرم پانی مجھ کو نیند آنے لگی

نصف شب کو آتے جاتے بادلوں کے درمیاں
کچھ حروفِ ناتواں
پھلجڑیوں کے روپ میں کاغذ کے کاک پرزے پیپر کے ساتھ
دیر تک گرتے رہے
نظم کے نقش گریزاں نے ستم لاکھوں سہے
ان گنت برسوں پہ پھیلی چشم و دل کی داستاں
رات کے پچھلے پہر کی گود میں
تیز تر ہوتی ہوئی بارش کی لوری سن کے شاید سو گئی

صبح دم
کھل اٹھے چاروں طرف بچوں کے رنگیں قہقہوں اور
تالیوں کے سرخ پھول
رات بھر کی تیز بارش کی بنائی جھیل میں
ڈگمگاتی ڈولتی
چل رہی تھیں چھوٹی چھوٹی کشتیاں
میں نے دیکھا ان میں ننھے کی بھی تھی پیاری سی ناؤ
نظم کا نقش گریزاں جانا پہچانا سا کاغذ جانے پہچانے حروف
ننھا بولا: آج جنتا لی نہ پڑے بیوقوف!

## ڈرگ سٹور

اگر میں جسم ہوں تو سر سے پاؤں تک میں جسم ہوں
اگر میں روح ہوں تو پھر تمام تر میں روح ہوں
خدا سے میرا سلسلہ وہی ہے جو صبا کا ہے
اگر میں سبز پیڑ ہوں
تو روح اور جسم کی
وہ کون سی حدیں ہیں فاصلوں میں جو بدل گئیں؟
زمین میری کون ہے؟
چمکتا نیلگوں حسین آسمان کون ہے؟
جو رگ رگ میں دھیرے دھیرے جذب ہو رہی ہے
دھوپ زرد دھوپ کیوں مجھے عزیز
میں سوچتا ہوں سب مگر میں طاقچوں میں بند ہوں
میں نام کوئی ڈھونڈتا ہوں آج اپنے کرب کا
تلاش کر رہا ہوں ایک ایک پل
قطار در قطار شیشیوں کے اس ہجوم میں
وہ آسمان کیا ہوا؟ وہ سبز پیڑ کیا ہوا؟
جگر میں آگ تھی مگر جگر برف بن گیا
جو سرخ تھا کبھی مرا لہو سپید ہو گیا
میں بوتلوں میں کٹ گیا
میں ڈبیوں میں بچ گیا
یہاں پہ میری روشنی یہاں پہ میری زندگی
سپید، سرخ، زرد، نیلگوں، سیاہ لیبلوں میں بٹ گئی
صبا کی رہگزر سے دور ہٹ گئی

## ماں

میری ماں کی
خمیدہ پشت پر
جو بوجھ تھا
وہ میرے دن کے نکلتے ہی
مسلسل بڑھتا جاتا ہے
جو بچے اس نے اپنی کوکھ سے جنے
مرے بھائی بہن اور سب مرے اپنے
وہ لاکھوں اور کروڑوں میں
حدِ آفاق تک
پھیلے ہوئے ہیں چار سو
اور دور تک لڑتے ہوئے
صدیوں کے اپنے ہی گندا آلود ملبے کی
ہزاروں گٹھریاں
اس جسم جاں پر
لادتے جاتے ہیں ہاتھوں سے
یہ ماں ہے سوچتے ہیں
صبر سے سب ڈھو کے لے جائے گی آخر تک

یہ ماں
کچھ اس قدر بارِ گراں سے جھک گئی ہے اب
یہ خدشہ ہے
فنا اور اس کے بوڑھے خمیدہ جسم کا
باقی ماندہ کا وہ فاصلہ اک روز شاید ختم ہو جائے
مگر ماں ہے
کہ وہ اپنے سفر کے راستے پر
آج بھی رکتی نہیں ہے
بے خبری
خامشی سے
ہر تھکن سے ماورا
معمول کی رفتار سے
چلتی ہے جاتی ہے۔

## بھان متی کا کنبہ

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا
بھان متی نے
صدیوں کی کوشش سے جو کنبہ تھا جوڑا
دور دور تک
کنکر کنکر بکھر گیا ہے
بھان متی کے اپنے ہاتھوں پالے گورے کالے بچے
چوپائے دوپائے راجہ رنک مسافر
بھوکے پیاسے
اک بستی سے دوسری بستی کی جانب پیاس لگائے
آگے پیچھے بھاگ رہے ہیں
پانی کے دو قطرے گندم کے کچھ دانے
شاید ان کو مل جائیں گے
ملبے کا ایک پربت جیسا ڈھیر پھیلتا جاتا ہے دن رات یہاں
بھان متی کنگال دیس کی نردھن رانی
بیٹھی ہے اس پربت کی اونچی چوٹی پر
میلا چیکٹ
دھول بھرا اک تاج ہے اس کے گنجے سر پر
ناچیا آنکھوں سے اس کی
گنگا جمنا بہتے بہتے سوکھ گئی ہیں

آسمان میں سناٹا ہے
بادل بارش نرم ہوا کے
دور دور تک کوئی بھی آثار نہیں ہیں
بھان متی ملبے پر بکھرے
اینٹ اور روڑے
کنکر پتھر
اس امید میں بیٹھی بیٹھی سہلاتی ہے
شاید اک دن
کوئی جادو ہو جائے گا
اس کا اجڑا بکھرا کنبہ
پھر سے جڑ جائے گا۔

## آخری پودا

سردی کا
سارا موسم بیت گیا
اب کے برس اونچے پربت پر برف کہیں بھی نہیں گری
پچھلے برس کی بچی کچھی کچھ برف تھی آخر وہ بھی باقی نہیں رہی
پربت پر سب پیڑ اور پودے رفتہ رفتہ سوکھ گئے
پربت کے دامن میں ندیا بہتی تھی۔
وہ ندیا اب پیاسی ندیا ریت میں اپنا پاون رستہ بھول گئی
مچھلی، مینڈک، کچھوے، کیڑے، بھوک کے پیاسے
ایک پرانے جوہڑ میں دم توڑ گئے
میدانوں میں وہ جو برقی رو سے اپنے گھر کو روشن رکھتے تھے
لالٹین یا دیے یا موم کی بتی کے
رحم و کرم پر
سوا، گھور اندھیرا سہتے ہیں
اس پر یہ بھی ہوا ستم
اب آنے والا موسم
جلتی آگ کا موسم ہے اور چاروں طرف
طوفانی اور تیز ہوائیں بہتی ہیں

میرے گھر کے آنگن میں
ننھا منا ہرا بھرا
ایک آخری پودا ہے
میں اس دشمن موسم میں
اس کو دیکھ کے شاید اب تک زندہ ہوں
پانی کی اک بوند نہیں
میں اب اپنی آنکھوں کے
باقی ماندہ اشکوں سے
اس کو سینچا رہتا ہوں

## رفتہ رفتہ آگ بجھتی جا رہی ہے

آگ بجھتی جا رہی ہے
رفتہ رفتہ
آگ بجھتی جا رہی ہے
رات لمبی اور کالی ہے، کہا یا
سرد موسم ہے کہ بام و در ہوئے ہیں
آج یخ بستہ جو جلتی تھی اب کچھ
دیر پہلے تک وہ روشن
آگ بجھتی جا رہی ہے
رفتہ رفتہ
آگ بجھتی جا رہی ہے

رات کا پہلا پہر ہے اور یہ عالم ابھی یہ
اور بھی کچھ
سرد ہو جائے گی
جسم و جاں میں اترے گی، جونہی پچھلا پہر ہوگا
ستم کچھ
اور ڈھائے گی تمازت دے رہی تھی جو وہ زندہ
آگ بجھتی جا رہی ہے
رفتہ رفتہ
آگ بجھتی جا رہی ہے

اس سے پہلے میرا سب کچھ سرد موسم میں سحر تک
برف ہو جائے، مجھے اس
آگ کو اب تیز کرنا ہے، یہ ممکن ہے یا ناممکن مگر اس
ساعتِ شب میں یہ سب کرنا ہے مجھ کو
آگ بجھتی جا رہی ہے
رفتہ رفتہ
آگ بجھتی جا رہی ہے

## ننھا شہ سوار

شہ سوار
ننھا منا شہ سوار
ایستادہ ہے
خمیدہ پشت پر میری
جونہی رکتا ہوں
وہ ترغیب دیتا ہے
مجھے چلنے کی
آوازوں کی سرگم سے
میں چلتا ہوں
میں واماندہ قدم چلتا ہوں
وہ مہمیز کی جنبش سے کہتا ہے کہ دوڑو
اور دوڑو تیز تر سرپٹ چلو
باد صرصر سے باتیں کرو

اس کا میں رخشِ رضا
تیز تر کرتا ہوں رفتارِ خرام
مجھ کو پہچانا ہے آج
اس کو رنگوں تتلیوں کے دیس میں
جادو نگر میں
میرے سائے کا بھی اب شاید جہاں
منتظر کوئی نہیں
منتظر ہیں اس کے لیکن میرے ننھے دوست کے
دیوقامت سبز و ارفع و وقار
دور تک سرگوشیاں کرتے ہوئے اشجار
رقص برگ و بار
جا رہا ہے خواب کی رفتار سے
دیوانہ وار
میرا ننھا شہ سوار

## بریل

مری آنکھیں سلامت ہیں
مگر میں سینۂ قرطاس پر ابھرے ہوئے خاموش نکتوں کو
بریدہ انگلیوں کی بے نوا بینا کیوں کے کرب سے بیدار کرنے کی
عجب کوشش میں غلطاں ہوں
کوئی مفہوم خوابیدہ ہے ان نکتوں میں مجھ سے ماورا شاید
بصارت کی حدوں سے ماورا جسم
اور اس کے پُر فسوں اسرار کی لمبی مسافت میں
میں بیمِ خوف و دہشت کے
جہنم سے گزرتا ہوں

بڑی مشکل ہے یہ تحریر بے حد ریزہ ہوتا ہوں
خدا کا شکر کرتا ہوں
کہ آنکھوں کی مجھے نعمت میسر ہے
مگر یہ ماورائے چشم دستاویز ایسا رزم نامہ ہے
جسے لمس کے احساس سے مجھ کو
فنائے خواب پر مقدور کے امکان میں پھر سے
بہ انداز دگر تخلیق کرنا ہے
جسے مجھ کو فقط مجھ کو ہی پڑھنا ہے
جسے مجھ کو فقط مجھ کو سمجھنا ہے

## کھنڈر اور پھول

مکاں جل چکا ہے
کھنڈر ہے سیاہی ہے بجھتی ہوئی راکھ کی سسکیاں ہیں
مری آنکھ پرنم ہے
چپ چاپ گم صم کھڑا ہوں یہاں پر
مرے آنسوؤں میں
تصاویر ہیں
ماضی و حال کی
وقت کی منزلوں کی
مرے ذہن میں داستاں ہے
زمانے کے بنتے بگڑنے کی
تعمیر و تخریب کی دھڑکنوں کی
مرے کان میں گونجتی ہیں وہ مدھم اور شیریں صدائیں
جنہیں آگ نے اس مکاں کے کھنڈر میں فنا کر دیا ہے
محبت کی تقدیس
معصوم شمعوں کے اشکوں کی گرمی
دھوئیں کی تڑپتی ہوئی دھاریاں
ان کا پیغام بن کر
فضاؤں میں شاید بھٹکنے لگی ہیں

مری آنکھ پرنم ہے پھر بھی میں خوش ہوں
مرے پاس خوابوں کی معصوم ٹھنڈک
اراروں کے روشن ستاروں کی نرمی
تخیل کی بجتی ہوئی نغمگی ہے
میں یادوں کے ملبے پہ تخلیق کا پھول لے کر کھڑا ہوں

## سبز پتہ

برسوں پہلے شرقی ساحل پہ اپنی مختصر تعطیل میں
میں نے دیکھے تھے ہوا میں لہلہاتے ناریل کے سبز پیڑ
وہ مجھے
کر گئے سرشار اس انداز میں
جب میں لوٹا پتھروں کے شہر میں
ان کو اپنے ساتھ لے آیا تھا میں
ناریل کے پیڑ میرے دوست مجھ کو پیار سے
اس طرح سے نوازتے تھے روز و شب
مجھ کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں ان کے طفیل
رنگ و بو کے بھید سب
خانۂ دل میں چھپا لوں گا ہمیشہ کے لیے
رفتہ رفتہ بن گئے وہ راحتِ جاں میرے دیرینہ رفیق
میری مشکل رہگزر پر میرے ہم راہ دیر تک چلتے رہے

ناریل کے پیڑ اب میری طرح واماندگی کی مضمحل تصویر ہیں
میرے گھر کے پاس ایک
تازہ دم سرسبز اونچا پیڑ تھا
وقت کی یورش میں وہ بھی برگ و گل کے فیض سے محروم پھلایا ہوا
ٹھنٹھ بن کر رہ گیا
کچھ دنوں سے چرمرا کر ڈھیر ہونے کے لیے
منتظر تھا وہ ہوا کے اک تھپیڑے کے لیے

آج جب ساون کی پہلی چھم چھم تیز بارش کے سواگت کے لیے
میں نے اپنے گھر کی کھڑکی کھول دی ہے عالمِ حیرت میں ہوں
سر اٹھا کر مسکرا کر دیکھتا ہے میری جانب پیار سے
ایک ننھا سبز پتہ ٹھنٹھ پر
معجزے سے کم نہیں
یہ نمودِ نو نئے امکان کی تحریر یہ تصویر آج

○

آسماں ہو گا یا زمیں ہو گا
حرفِ روشن کا وہ امیں ہو گا
بزمِ یاراں پناہ گاہ اس کی
ہوا ہوگا تو وہ وہیں ہو گا
شہرِ رسوا میں کل جو آیا تھا
آج بھی وہ وہیں کہیں ہو گا
وہ جو تصویر میں نہیں ڈھلتا
کس قدر شخص وہ حسیں ہو گا
عام سے ہوں گے سب کے سب چہرے
ایک ان میں سے مہ جبیں ہو گا

☆

○

میں ستارہ نہیں ہوں، شبنم ہوں
روشنی ہوں ذرا سی مدھم ہوں
قہقہہ ہوں فلک کو چھوتا ہوں
پھر بھی صدیوں سے چشمِ پُرنم ہوں
دوست تو مجھ سے ہنس کے ملتے ہیں
ایک میں ہوں کہ سب سے برہم ہوں
نثر ہوتا تو واشگاف ہوتا
شعر ہوں اس لیے میں مبہم ہوں
ہوش میں ہوں زمیں پہ رہتا ہوں
پھر بھی وارفتگی کا عالم ہوں
سیلِ باراں میں وقفۂ تنویر
سات رنگوں کی ایک سرگم ہوں

○

ذہن میں کوئی خواب رکھ دیتا
دشت میں جوئے آب رکھ دیتا
جلوۂ آفتاب کے اندر
سیرتِ ماہ تاب رکھ دیتا
کچھ تو پڑھ لے گا روبرو اس کے
اپنے دل کی کتاب رکھ دیتا
داستاں کو طویل کر دیتا
باب میں اور باب رکھ دیتا
اچھی چیزیں لگیں گی اور اچھی
درمیاں کچھ خواب رکھ دیتا
گر پرستش کا اس کی وعدہ ہے
پاؤں میں اک گلاب رکھ دیتا

☆

○

دوست جب کھل کر ملے اچھے لگے
سارے شکوے اور گلے اچھے لگے
کیا افسردہ تھا موسم آج جب
پیڑ کے پتے ہلے اچھے لگے
خانۂ دل میں اکیلے رہ رو
رہ گزر پر قافلے اچھے لگے
جو بھی قسمت سے ملا بس ٹھیک تھا
کچھ نہ کرنے کے صلے اچھے لگے

☆

# "لمحۂ مرگ کا شفیق وقفہ"

بلراج کومل

زمین آغاز ہے
زمین انجام ہے
زمین ادھریاں ہے
زمین لمحۂ مرگ کا شفیق وقفہ، پناہ ہے
زمین تسلسل ہے

راجندر سنگھ بیدی کے تعلق سے یہ سب باتیں میرے ذہن میں بیک وقت ابھرتی ہیں۔

لوگ کہتے ہیں:
بیدی پنجاب کی زندگی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔
بیدی ترقی پسند ہیں۔
بیدی بقول منٹو لکھنے سے قبل بھی سوچتے ہیں لکھتے ہوئے بھی سوچتے ہیں اور لکھنے کے بعد بھی سوچتے ہیں۔
بیدی چیخوف کے انداز میں لکھتے ہیں۔
بیدی مشکل افسانہ نگار ہیں۔
بیدی کردار نگاری کے فن میں یکتا ہیں۔

زمین کی پہچان روئیدگی سے ہے۔ زندگی کے مظاہر سے ہے۔ سبزہ اور مادہ سے ہے۔ رشتوں کے تضادوں اور رشتوں کی مفاہمتوں سے ہے۔ بیدی کی کائنات میں یہ سب عناصر موجود ہیں۔ یہ سب عناصر چونکہ بنیادی ہیں اس لیے ان کے ساتھ اکثر اوقات اساطیری اور دیومالائی نوعیتیں وابستہ کی گئی ہیں۔

ان سب آراء کے ہجوم میں راجندر سنگھ بیدی بہر حال زمین کی طرح متواتر اور مسلسل ہیں۔

بیدی کی کائنات کی جسمانی حدود بہت زیادہ وسیع نہیں ہیں۔ ان کے کردار مرد، عورتیں اور بچے۔ زیادہ تر کردار چھوٹے قصبوں چھوٹے شہروں کے رہنے والے لوگ ہیں۔ ان میں اکثر جنم سے موت کا سفر یا وقفہ محدود جغرافیائی حدود میں گزارتے ہیں۔ وہ ہجری شعور یا قرۃ العین حیدر کے کرداروں کی طرح سفر کی لذتوں یا سفر کے مسائل سے دوچار نہیں ہوتے، اور اگر وہ جان کی طرح عازمِ سفر ہو بھی جاتے ہیں تو اپنی منزل تک نہیں پہنچ پاتے۔ بیدی کے کچھ کردار بڑے شہروں کے جذباتی تضادوں کے زیر و بم میں سے بھی گزرتے ہیں۔ لاہور، کلکتہ، بمبئی اور بے نام ساحلی شہروں کا ذہنی روحانی اور سماجی کرب برداشت کرتے ہیں اور بالآخر زندگی کرنے کا فن سیکھ جاتے ہیں۔ طبقہ واری تقسیم کے میزان کے مطابق بیدی کے اکثر کردار نچلے درمیانہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ محنت کش طبقے کے کردار اور اونچے طبقے کے کردار بیدی کے ہاں خال خال نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں کچھ ایسے مرد، عورتیں اور بچے ان کی دنیا میں آباد ہیں جن کو فیصلہ کن انداز میں مخصوص حد بندیوں میں قید کرنا ممکن نہیں ہے۔ بیدی کے ہاں زیادہ تر مرد دکاندار، چھوٹے کاروبار کرنے والے لوگ، نوکری پیشہ یا غیر سرکاری یا غیر سرکاری ملازم، ڈرائیور اور مختلف غیر واضح تفصیلات کے افراد ہیں۔ کھو رام، علی جی، علم، جیرام، مادھو، پھریا لال، مدن، بھاگی، سندر لال، موہن، جا م دیاری لال، گپی ہت، گنی تلے، سکندری، کیل بابو، مادھو، لکا، منگل، چھن، مراری لال، بھیم، تارو، گھمنڈی لال، پنڈت رام، رحمان، ست رام۔ سب کردار بیدی کی مٹھی بھر دنیا کے رہنے والے لوگ ہیں۔ ان کے رویے، کچھ رویے طبقاتی نوعیت کے ہیں۔ بیدی کے یہ سب کردار اکثر اوقات کثیر الجہت کردار ثابت ہوتے ہیں۔ ان کی بہت سی پرتیں اور تہیں ہیں جو مختلف تضادوں میں سطحِ آب پر ابھرتی ہیں۔ کھو رام، دیاری لال، گپی ہت، گنی تلے بظاہر سیدھے سادے انسان ہیں لیکن جنسی اور سماجی تضادات کی کشمکش میں گرفتار ہیں۔ بیدی کے وہ کردار جو زوالِ عمر کے نشیب میں پہنچ چکے ہیں یا زوالِ عمر کے نشیب کے قرب و جوار میں ہیں کم و بیش شفیق اور فراخ دل ہیں۔ اور تضادات میں گرفتار ہونے کے باوجود ہمدردانہ جذبات سے معمور ہیں۔ ست رام، حضور سنگھ، سندر لال۔ سب تضادات میں گرفتار ہیں۔ سب ہمدردانہ جذبات سے معمور ہیں۔ بیدی ان سب میں شامل بھی ہیں اور ان سے الگ بھی۔ جب بیدی بطور راوی خود بیانیہ میں شامل ہو جاتے ہیں تو کبھی کبھار اپنے مفید لیکن کہانی کے تعلق سے غیر ضروری خیالات کہانی میں شامل کر دیتے ہیں۔ وہ افسانے جن میں بیدی کا انداز خود نوشت سوانح یا اعترافِ ذات کا ہے "ہاتھ ہمارے قلم ہوئے"، "آئینے کے سامنے" بیدی کے فن کی جانی پہچانی سطح سے نیچے رہ جاتے ہیں۔

بیدی اپنے ان سب مرد کرداروں کا اخلاقی محاکمہ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ آیئے دیکھیں بیدی اپنے نسوانی کرداروں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔

ہولی گرہن کی رات کو ایک انجانے فرد ہونے کے عمل میں ایک بہوتر انجا

کا شکار ہوگئی (گرہن)۔
نگی۔ محرومی، شفقت سے عاری، ناآسودگی کی آرزو میں گرفتار۔ (نگی)
کسم۔ لیڈی چیٹرلی کے انداز میں چل جوگی باہوں میں تلاش تسکین کرتی ہے۔
(اغوا)
رانی۔ احتجاج کی آواز بنتی ہے۔ (دس منٹ بارش میں)
اندو۔ سراپا ماہتاب کی طرح شفاف ہو جاتی ہے (اپنے دکھ مجھے دے دو)
لاجونتی۔ صرف عورت بن کر زندہ رہنا چاہتی ہے دیوی بننا اسے منظور نہیں
ہے (لاجونتی)
کیرتی۔ خود اعتمادی کی دولت اپنے انہدام سے حاصل کرتی ہے (ٹھنڈی)
سوتیا۔ جنسی ضرورتوں میں گھِر کر تیز سے راستے تلاش کرتی ہے۔ (سوتیا)
رانو۔ ازلی و ابدی غیر مختوم تانیت۔ زندگی کا تسلسل۔ (ایک چادر میلی سی)
کندن۔ ماں بننے کی آرزو سے سرشار عورت۔ (بولو)

جوگیا۔ کلیانی، سیتا، سوتی، کلکارنی، سوتر دھار، چاند، عزیزہ، سب عورتیں ہیں۔ بیدی کے سب نسوانی کردار بیدی کے مردوں کی طرح طبقہ واری زاویوں سے آزاد ہیں۔ وہ اپنی صورت حال کو مردوں ہی کی طرح نہ تو مکمل طور پر قبول کرتے ہیں نہ رد کرتے ہیں۔ نہ اس صورت حال سے فرار اختیار کرتے ہیں نہ اس کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ صرف اس کو جیتے ہیں۔ تمام تضادات کے کرب کے ساتھ ہولی، بکی، گوری، بھکمیا، لاجونتی، اندو، رانو، کلیانی، جوگیا، ٹھیک اس انداز سے جیتی جاگتی عورتیں ہیں جس انداز سے لم، بھاگو، سندر لال، مدن، بابا ہری داس، گوکا، مٹکل، جیتے جاگتے مرد ہیں۔ بیدی ان میں سے کسی کردار کو مشتہر مفروضوں اور اخلاقی حد بندیوں سے آلودہ نہیں کرتے۔ وہ ان کو ان کی تمام مجبوریوں، پاکیزگیوں اور آلودگیوں کے ساتھ قبول کرتے ہیں اور اپنی بے پناہ فراخ دلی اور ہمدردی سے زندگی کے تمام رموز و اسرار سے ان کے شب و روز کو روشن کر دیتے ہیں۔

مرد اور عورت کے رشتے کا ذکر کرتے ہوئے بیدی اکثر غیر ازدواجی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں۔ بکی اور دیہاتی نوجوان مادھو اور اندو، موہن جام اور اچلہ، رامیاری داس، ہری بیتا، سوتی، بھودا، کل بابو، کلیانی، گھی بہت۔ یہ سب لوگ جنگوں اور ناآسودہ اشتہاؤں کے کرب میں گرفتار ہیں۔ یہ سب لوگ دیواروں سے ٹکراتے ہیں اور لہولہان ہو کر گھر لوٹ جاتے ہیں۔ بیدی کے کچھ کردار عادت کا شکار ہیں۔ ان میں کچھ لوگوں کو تسکین صرف تخیب ہی میں مل سکتی ہی۔ کچھ کو ''کالی'' کے کرداروں کی طرح آزاد و غیر رسمی فضا میں۔ چھدرام کی غلامی، معمول سے وابستگی کی غلامی ہے۔ عزیزہ صرف ماحول کی غلاظت میں زندہ رہ سکتی ہے۔ صاف آب وہوا اس کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ گھمنڈی لال زرکرب ہو چکا ہے لیکن ماں کے لیے صرف بیٹا ہے، گھی بہت اور سوتیا کے

ذریعہ تسکین میں مسموم لیکن اشتہا انگیز ذائقہ شامل ہو گیا ہے۔ بھولا، رحمان، بگل، بھاگو، سنت رام، اندو، رانو، لاجونتی، ان گنت جہتیں اختیار کرتے ہیں اور بار بار ذہن کے دروازے پر دستک دیتے رہتے ہیں۔ رانو، گوکا، مٹکل، تشدد کے تسلسل سے متصادم ہیں اور اسی تسلسل میں ربط و تسلسل کے نقطے تلاش کرتے ہیں۔

فکشن کے کرداروں کی رسمی تقسیم کرتے ہوئے ان کو عام طور پر FLAT کرداروں یعنی ٹائپ کرداروں اور ROUND کرداروں میں بانٹا گیا ہے۔ فکشن کے اکثر کردار بہر حال FLAT کرداروں یعنی ٹائپ کرداروں کے ذیل میں آتے ہیں۔ سوپاں کے اکثر کردار ٹائپ ہیں۔ ان دونوں کے برعکس دوستوؤسکی کے کتیا (Matya) اور مٹکلی، ROUND کردار ہیں۔ ٹائپ کردار عام طور پر عمومی سماجی صورت حال کی یا عمومی سماجی رویوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ROUND کرداروں کا دائرہ عمل ناگزیر طور پر وسیع تر ہوتا ہے کسی منفرد جذباتی، روحانی فکری جہت کی وجہ سے جو انسانی صورت حال کی کلیت پر حاوی ہو جاتی ہے اور ہمہ گیر تلازمات کو جنم دیتی ہے۔ بعض فنکاروں کے ہاں اکثر کردار بظاہر ٹائپ دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن وہ افسانوی فضا جس میں وہ سانس لیتے ہیں ان کو بالآخر سے سرفراز کرتی ہے۔ کرشن چندر کے ٹائپ کرداروں پر افسانوی فضا کی سحر طرازی حاوی ہے۔ منٹو کے کردار ٹائپ ہوتے ہوئے بھی مخصوص اور منفرد خد و خال اور شخصی اکائیوں کی وجہ سے وسیع تر دائرہ معنویت اختیار کر لیتے ہیں۔ بعض فنکاروں کے ہاں فضا کے طلسمات کا سحر تو قائم ہو جاتا ہے لیکن کردار یا تو سرے سے غائب ہو جاتے ہیں یا بے نام ہو جاتے ہیں۔ بعض دوسرے فنکار بنیادی نوعیتوں کی تلاش میں استعارے، علامت اور امیج کو بروئے کار لاتے ہوئے شعری حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر افسانہ نگار کے پیش نظر مقصد کیا ہے۔ فکشن کے سلسلے میں حقیقت نگاری اور سماجی حقیقت نگاری کی تحریکیں، فکشن کو سماجی دستاویز قرار دینے پر اصرار کرتی ہیں۔ فکشن کے سلسلے میں حاوی تصور غالباً یہی ہے۔ دور جدید میں استعارے اور علامت کی سرگرم پیش قدمی نے اس تصور میں بہت سی دراڑیں ڈال دی ہیں۔ نتیجتاً دستاویزی تفصیلات رفتہ رفتہ استعارے اور علامت کی شعری معنویت کو قبول کرنے لگی ہیں۔

پریم چند، کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی، بیدی۔ شاید بیدی ان سب میں پریم چند کے زیادہ قریب ہیں۔ دونوں کے اکثر کردار قریبی زندگی کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔ دونوں کے ہاں ہمدردی اور انسان دوستی کا بے پناہ جذبہ ہے۔ دونوں کے ہاں افسانے کی ساخت کا احترام ہے۔ ان قربتوں کے باوجود دونوں کے رویوں میں اختلاف کی سطح پر کچھ مخصوص اور منفرد خصوصیات بھی ہیں۔ مثلاً پریم چند اپنے مردوں اور عورتوں کو تضادات سے آزاد رکھتے ہیں۔ اگر کچھ مسائل ان کو درپیش ہوتے ہیں تو پریم چند ان کا فوراً کوئی آسان حل تلاش کر لیتے

باقی: صفحہ نمبر 45 پر

# کنوار

بلراج کول

جب میونسپل کارپوریشن کی طرف سے شہر کے بیشتر حصوں میں پانی کے نل مہیا کر دیے گئے تو شہر کے اکثر کنویں بے مصرف ہو گئے اور کافی عرصہ تک بے مصرف رہے۔ آخر ایک ذہین شہری نے ان کا ایک انوکھا مصرف ڈھونڈ نکالا۔ اس نے ایک جست میں کنواں پھلانگنے کا ایک انوکھا تجربہ کیا۔ یہ تجربہ کامیاب رہا۔ اس کے بعد اس ذہین شہری نے کنواں پھلانگنے کا شغل باقاعدہ اختیار کر لیا۔ جب وہ ایک کنواں پھلانگ چکا تو اس کی خواہش ہوتی کہ وہ اور کنواں پھلانگے۔ ہر بار وہ پہلے سے زیادہ مشکل صورت حال کا انتخاب کرتا اور تماشائیوں کی تالیوں اور واہ واہ کے درمیان کنواں پھلانگنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس کی مقامی شہرت رفتہ رفتہ قومی شہرت کا درجہ اختیار کر گئی اور اب اس کا نام بیرونی ممالک کے اخبارات میں بھی کہیں کہیں نظر آنے لگا۔

کسی بھی فرد کا کوئی دعویٰ ایسا نہیں ہے جس کو چیلنج کرنے کے لیے کوئی دوسرا فرد موجود نہ ہو۔ چنانچہ گولنکر کے سلسلے میں بھی یہی ہوا۔ ایک روز اسے ڈاک سے ایک خط ملا۔ یہ خط ایک اجنبی کی طرف سے تھا جس نے گولنکر کو کنواں پھلانگنے کے مقابلے کے لیے چیلنج بھیجا تھا۔ گولنکر نے خط پڑھا اور خط پڑھتے ہی اس کے مردانہ وقار نے تقاضا کیا کہ وہ چیلنج منظور کر لے۔ چنانچہ گولنکر نے فوراً چیلنج کرنے والے کو تحریری اطلاع دی کہ وہ کسی وقت بھی باہمی خط و کتابت کے ذریعہ طے شدہ شرائط کے مطابق مقابلہ کے لیے تیار ہے۔ اگلے چند ہفتوں کے اندر شرائط طے ہو گئیں اور مقابلے کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ مقامی اور قومی اخبارات میں مقابلہ کی تفصیلات کا اعلان کر دیا گیا۔

اگرچہ گولنکر کہنہ مشق کھلاڑی تھا اور بہت سے کنویں پھلانگ چکا تھا۔ جوں جوں مقابلہ کی تاریخ قریب آتی گئی اس کے دل میں خدشات پیدا ہونے لگے۔ ان خدشات پر قابو پانے کیلئے گولنکر نے فیصلہ کیا کہ چونکہ سوال اپنی شہرت اور وقار کو برقرار رکھنے کا ہے اس لئے مقابلہ سے قبل کنووں کی کچھ مشق ضروری ہو گی جو مقابلے کا فیصلہ کن نتیجہ کن انداز سے اس کے حق میں کرنے میں مفید ثابت ہو گی۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد گولنکر نے شہر کے تمام کنووں کا (جس میں سے اکثر کو وہ پھلانگ چکا تھا) بغور جائزہ لیا۔ ہر ایک کنویں کا قطر ناپا۔ پھلانگنے کے زاویوں کا مطالعہ کیا۔ ظاہر ہے کہ گولنکر جیسی شہرت کے مالک کے لیے شہر کے کنووں پر مشق کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے اس نے اس کام کیلئے شہر سے باہر ایک ویران کنویں کا انتخاب کیا۔ یہ کنواں چاروں طرف سے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ باہر سے گذرنے والا آدمی اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ درختوں کے جھنڈ کے اندر کنواں ہے۔ اس کنویں کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس کی منڈیر پر اس کا قطر اور اس کے چاروں طرف کی خالی زمین کا رقبہ اور بعد اس کنویں کے مماثل تھے جو آخری مقابلہ کیلئے منتخب کیا گیا تھا۔۔۔۔ کنویں کا انتخاب کرنے کے بعد مناسب تیاری کی ضرورت تھی۔ گولنکر نے تمام تیاری دو چار روز میں مکمل کر لی اور ایک صبح کو کنویں کی طرف روانہ ہو گیا۔

مارچ کی صبح بڑی خوبصورت تھی۔ ہوا میں موسم بہار کا اثر تھا لوگوں کی چہرے پر مسرت تھی بچے آنگنوں میں کھیل رہے تھے زندگی کا کاروبار معمول سے زیادہ حسن اور خوش اسلوبی سے چلتا ہوا نظر آ رہا تھا گولنکر رنگ و بو کی اس محفل سے لطف اندوز ہوتا ہوا شہر کے تیز ہوتے ہوئے ہاؤ ہو میں سے گذر کر درختوں کے اس جھنڈ کی طرف جا رہا تھا جہاں اسے کنواں پھلانگنے کی مشق کرنی تھی۔ اس کا دل اس کا دماغ، اس کا پورا وجود زندگی کے نشے سے سرشار تھا۔ اس کے قدم انداز سے اٹھ رہے تھے اور اس کے چہرے پر کامرانی کا وہ نور تھا جیسے وہ مقابلہ میں شامل ہونے سے پہلے ہی مقابلہ جیت چکا ہو۔

شہر کی نواحی بستی میں وہ ایک پارک کے قریب سے گذرا سبزے پر کچھ لڑکے کھیل رہے تھے ٹھیک اسی وقت کھیلنے والے لڑکے نے ایک شاندار چھکا لگایا۔ گولنکر کا دل مسرت سے چھلک اٹھا۔ نواحی بستی سے نکل کر وہ اس سڑک پر آ گیا جہاں خوبصورت بنگلوں کی ایک لمبی قطار دور تک چلی گئی تھی۔ ایک مکان کے باہر ایک گول مٹول، سرخ و سپید بچہ ٹافی کھا رہا تھا۔ گولنکر نے اس کے ملائم صحت مند گالوں کو تھپتھپایا اور آگے بڑھ گیا۔

اب وہ درختوں کی جھنڈ کے بالکل قریب تھا وہ رک گیا اور اس نے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی فطرت کا سارا حسن نغموں اور سرور میں سمٹ آیا تھا۔ گولنکر کچھ دیر اس حسن سے سرشار ہوتا رہا۔ پھر جھنڈ کے اندر داخل ہو گیا۔ کنویں کے قریب پہنچ کر اس نے جو منظر دیکھا اسے دیکھنے کا امکان اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کنویں کی منڈیر پر سوکھا مارا چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا اور بڑے انہماک سے کنویں کے اندر جھانک رہا تھا۔ اجنبی گولنکر کی آمد سے بالکل بے خبر تھا۔ اس لیے جب گولنکر اس کے قریب پہنچا تو وہ چونک پڑا۔ گولنکر نے اپنے ردعمل کا اظہار ایک سوال کی صورت میں کیا۔

''تم کون ہو؟''

اجنبی اب بھی کنویں کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا اور گولنکر پر ایک تحقیر آمیز نظر ڈال کر کنویں کے اندر جھانکنے کے عمل میں دوبارہ مصروف ہو گیا۔

گولنکر کے سوال کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

گولنکر نے اپنا سوال دہرایا۔

''میں پوچھتا ہوں تم کون ہو؟''

اجنبی دوسری بار بھی گولنکر کا سوال خاموشی سے ہضم کر گیا۔ گولنکر نے

تیسری بار کوشش کی۔ اس بار اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

''میں پوچھتا ہوں تم کون ہو؟'' کیا کرتے ہو اور یہاں کس لیے آئے ہو؟

اجنبی نے اپنی آنکھیں کنویں کے چبوترے سے ہٹائیں اور گونکر کے چہرے پر گاڑ دیں۔ گونکر کو یکا یک محسوس ہوا کہ اجنبی اس کی روح کے اندر جھانک رہا ہے اور اس کے ہر راز سے واقف ہوتا جا رہا ہے گونکر کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے لیکن اس سے پیشتر کہ گونکر اپنے غصہ کا اظہار کر پاتا، اجنبی کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے ——— دو انسانوں کے درمیان ہم دردی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ان کے مقاصد ایک جیسے ہوں۔

''تو تم ہم دردی کی تلاش میں ہو۔''

''شاید میں نے غلط لفظ استعمال کیا۔ مجھے رشتہ یا تعلق یا اسی قسم کا کوئی عام لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا۔ بہر حال میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا ہوں۔''

گونکر چکر میں آ گیا۔ عجیب آدمی سے واسطہ پڑا تھا۔ وہ اجنبی کو کچھ دیر بے بسی کے عالم میں دیکھتا رہا اور پھر بولا

''دیکھو میں یہاں ایک خاص مقصد سے آیا ہوں' تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

''میں واپس جانے کے لیے یہاں نہیں آیا ہوں۔ تم چاہو تو یہاں سے جا سکتے ہو۔''

''آخر تم کیا چاہتے ہو؟'' گونکر نے پوچھا۔

''میں چاہتے ہو نہ چاہنے کے عمل سے بہت دور نکل چکا ہوں۔''

گونکر کے ذہن میں ایک اور سوال کلبلا نے کی طرح چبھا۔

''کیا تم خودکشی کرنا چاہتے ہو؟''

''مجھے زندگی اور موت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا'' اجنبی نے جواب دیا۔

گونکر کے چہرے پر مسرت اور اعتماد کی روشنی نمودار ہوئی۔ وہ اجنبی کی پراسرار شخصیت کے ایک گوشے کو بے نقاب کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ میں کس مقصد سے یہاں آیا ہوں''

''مجھے اب دوسروں کے مسائل سے دلچسپی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے کسی مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے''

گونکر کی حیرت میں ہر لحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

''یقیناً تمہارا گھر ہو گا' تمہاری بیوی ہو گی' بچے ہوں گے''

''تھے! اب نہیں ہیں'' اجنبی نے ایک بار پھر کنویں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''کہاں گئے''

''مر گئے''

''کس طرح مر گئے؟''

''جس طرح انسان مرتے ہیں۔ بھوک سے' بیماری سے' قتل سے''

''یہ تو عام بات ہوئی۔ خاص طور پر تمہاری بیوی اور تمہارے بچے کیسے مرے؟''

اجنبی شاید گونکر کے ضرورت سے زیادہ سوالوں کا جواب دے چکا تھا۔ اس لئے برہم ہو کر بولا

''میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا تم مجھے مجبور کیوں کر رہے ہو؟''

کچھ سوالوں کا جواب تم نے اپنی مرضی سے دیا ہے۔ ویسے بھی مجھے تمہارے ساتھ دلچسپی ہو گئی ہے۔ میں تمہارے ساتھ دوستی کرنا چاہتا ہوں۔

دوستی کا نام سن کر اجنبی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور چلا کر بولا

''چلے جاؤ یہاں سے۔ تم کون ہوتے ہو میرے ساتھ دوستی کرنے والے۔''

گونکر مسکرایا

''میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔''

''تو پھر کون ہو؟ اجنبی سوال پوچھ کر اپنے سوال پر خود حیران ہو گیا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے ٹھیک یہی سوال میں نے تم سے پوچھا تھا۔ جس کا جواب دینے سے تم نے انکار کر دیا تھا لیکن میں انکار نہیں کروں گا میرا نام گونکر ہے میرے نام سے اس شہر کے تمام لوگ واقف ہیں۔ میں مشہور کنویں پھلانگنے والا ہوں۔

''مجھے تمہارے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہے؟''

''تمہیں میرے ساتھ دلچسپی ہے۔ اسی لیے تم نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں کون ہوں؟''

اجنبی کی آنکھوں میں غصے کی ایک لہر ابھر آئی اس کے بعد اس نے آہستہ آہستہ کہا

''مجھے کنویں پھلانگنے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

''نہ سہی۔ لیکن میں کنویں پھلانگنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کرتا ہوں۔''

''میں جانتا ہوں تم جو کچھ کرتے ہو۔ جھوٹ، چوری، ڈاکہ زنی قتل زنا بالجبر ———

اجنبی کے یہ الفاظ سن کر گونکر سناٹے میں آ گیا۔

"شاید تم اپنے کارناموں کی تفصیل پیش کر رہے ہو"

"جی ہاں۔ اپنے تمہارے تمام ہم نوعوں کے"

"لیکن تمہارے بیوی بچے کیا ہوئے؟"

"اجنبی کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ اس سوال کے جواب سے بھی کترا جانا چاہتا ہے۔

"جھوٹ، چوری، ڈاکہ زنی، قتل ـــــ

"لیکن انسان کی زندگی صرف اس کی ذات تک محدود نہیں ہے"

گولنکر نے اسے درمیان میں ٹوک دیا میں تمام فلسفوں سے بخوبی واقف ہوں۔ یہ مت سمجھو کہ تم کنویں پھلانگتے پھلانگتے زندگی کے رازداں بھی بن گئے ہو"

"خودکشی سے صرف تمہارا مسئلہ حل ہوتا ہے"

"ہر انسان اپنا ہی مسئلہ تو حل کرتا ہے"

گولنکر کو اجنبی کی باتوں سے جو دلچسپی پیدا ہوگئی تھی مزید گہری ہوگئی۔

"لیکن اس زندگی کے دوسرے اہم مسائل بھی تو ہیں جو میری اور تمہاری ذات کے مسائل سے زیادہ اہم ہیں"

"جی ہاں! میں ان سے بھی واقف ہوں ان پر بھی جھوٹ، چوری، ڈاکہ زنی، قتل، زنا بالجبر حاوی ہیں۔ فرد سے اجتماع تک پہنچتے پہنچتے تفصیلات میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

"فرض کرو تم خودکشی کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہو جس کا امکان بہت کم ہے کیونکہ میں تمہیں ہرگز ایسا کرنے نہیں دوں گا۔ تو کیا تمہارے ذاتی مسائل اور دنیا کے مسائل حل ہو جائیں گے۔

مجھے اس سوال کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہے مسائل حل ہوں یا نہ ہوں میں اپنا آخری فیصلہ کر چکا ہوں اور پھر میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا کا کوئی اجتماعی مسئلہ فیصلہ کن طریقے سے ہمیشہ کیلئے کبھی حل نہیں ہوتا۔ صرف عارضی طور پر حل ہوتا ہے میں صرف اپنا مسئلہ حل کرنا چاہتا ہوں"

"تم نادان ہو"

"کون جانتا ہے کون نادان ہے"

دونوں آدمی اپنے اپنے سوالات اور جوابات میں الجھ گئے تھے۔ تھوڑی دیر کیلئے دونوں خاموش ہوگئے گفتگو کا دوبارہ آغاز اجنبی نے کیا۔

"تم یہاں سے چلے جاؤ میں اپنے آخری فیصلے پر عمل کرنا چاہتا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم اس سے پہلے اپنے کسی فیصلے پر عمل نہیں کر سکے" اجنبی کے چہرے پر جھلاہٹ پیدا ہوگئی۔

"میں اپنے ہر فیصلے پر عمل کرتا ہوں۔"

"تو پھر اس فیصلے پر عمل کرنے کے لیے ہچکچاہٹ کیوں۔ تم اپنا مسئلہ ملتوی کیوں کرنا چاہتے ہو"

اجنبی کے چہرے پر مزید غصے کے آثار پیدا ہوئے۔

"میں نے کہا نا کہ میں اپنے آخری فیصلے پر فوراً عمل کرنا چاہتا ہوں میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ"

"اگر یہ فیصلہ تمہارا آخری ہے اور تم اس پر عمل بھی فوراً کرنا چاہتے ہو تو میری موجودگی سے تمہیں کیا زحمت ہے؟"

میں اپنی موت کے عمل میں تنہا شامل ہونا چاہتا ہوں تم میری موت کے گواہ نہیں بن سکتے میں یہ حق تمہیں کبھی نہیں دے سکتا۔

"میں تمہیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ زندگی خوبصورت ہے۔ زندہ رہنے کی کوشش کرو"

"مجھے تمہارے امید افزا الفاظ بے معنی نظر آتے ہیں۔ بفرض محال اگر زندگی خوبصورت بھی ہے تو تمہیں اس سے لطف اندوز ہونے کی پوری آزادی ہے تم میرے معاملے میں ٹانگ کیوں اڑا رہے ہو؟"

"اس کا مطلب ہے تم اپنے آخری فیصلے پر عمل کرنے پر بضد ہو۔ تم بخوشی خودکشی کرو میں یہاں سے چلتا ہوں۔"

یہ کہہ کر گولنکر وہاں سے چل پڑا۔ اجنبی کنویں کی منڈیر پر چڑھ گیا اور کنویں کے اندر کودنے کے لیے تیار ہوگیا۔

گولنکر دو چار قدم چلنے کے بعد رک گیا اور واپس اسی جگہ آ گیا جہاں وہ چند لمحے پہلے کھڑا تھا۔

"میرا آخری سوال باقی ہے"

"پوچھو" اجنبی نے ناگوارانہ انداز میں کہا۔

"تم نے خودکشی کے لیے یہ کنواں کیوں منتخب کیا؟"

"تم نے پھلانگنے کے لیے یہ کنواں کیوں منتخب کیا؟

"میرے لیے یہ کنواں مناسب تھا۔"

"ٹھیک یہی بات میں کہتا ہوں۔ یہ کنواں میرے لئے مناسب تھا۔"

اس جواب سے گولنکر کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ لمحہ بھر سوچنے کے بعد اس نے اجنبی سے پوچھا۔

"کیا تم اپنی خودکشی چند مدت کے لیے ملتوی کر سکتے ہو؟"

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں یہاں کنواں پھلانگنے کی مشق کیلئے آیا تھا۔ کیوں کہ مجھے دو روز بعد کنواں پھلانگنے کے ایک مقابلے میں حصہ لینا ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟ تم سمجھتے ہو اس مسخرے پن سے تم مجھے متاثر کر لو گے۔"

"تمہیں کچھ نہیں کرنا ہے۔ میں چاہتا ہوں میں جس کام کے لیے یہاں آیا ہوں اسے پورا کر کے جاؤں جہاں تک تمہیں متاثر کرنے کا تعلق ہے تم جہنم میں جاؤ میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

شوق سے پورا کرو لیکن جلدی کیوں کہ میں اپنا فیصلہ زیادہ دیر کے لیے ملتوی نہیں کر سکتا۔ اپنے صبر کی انتہا تک پہنچ چکا ہوں۔

یہ کہہ کر ہنجی کنویں کی منڈیر سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

گونگلر نے کنویں کی منڈیر سے مخصوص فاصلہ ناپ کر زمین پر کچھ نشان لگائے ایک نشان پر کھڑے ہو کر اس نے اپنی قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کیا، اپنے جسم کو تولا اور اس کے بعد دوڑتا ہوا کنویں کی جانب بڑھا راستے میں ایک دوسرے نشان سے اس نے زور پور جست لگائی۔ ہنجی کے دل کی دھڑکن اس دوران تیز ہو گئی۔ جست لگاتے ہی گونگلر کا جسم ایک قوس سی بناتا ہوا کنویں کے اوپر سے گزرنے لگا۔ اور عین اسی لمحہ ہنجی کو توقع تھی کہ گونگلر کنویں کے دوسری طرف ہوگا۔ ایک زور کا دھماکہ ہوا گونگلر کا جسم کنویں کی منڈیر کی اندرونی سطح کے ساتھ ٹکرایا اور پھر کنویں کی پوری گہرائی کا فاصلہ طے کرتا ہوا دھم سے پانی میں گرا۔

ہنجی کی آنکھیں پھیل کر روزن بن گئیں۔ اس کا پورا وجود فوری فطری رد عمل کی زد میں آ گیا۔ اور وہ ڈوبنے والی تقدیر سے غافل، اپنے ارادوں اور فیصلوں سے غافل درختوں کے جھنڈ کو چیرتا۔ سرسبز و شاداب کھیتوں کو اپنے پاؤں تلے روندتا شہر کی جانب بھاگ نکلا۔

۔بقیہ: ادب کی تلاش۔

اطہر کی ایک نظم کا جو اقتباس پیش کیا ہے اس کے ساتھ یہ اعلان بھی منسلک ہے کہ "مطلب بتانے والے کو انعام دیا جائے گا تیسری دنیا کے ستم زدہ عوام کے لیے ادب ذہنی آسودگی اور زندگی کے مسائل کا حل پیش کرنے کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ ذہنی ورزش نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اصلاحی ترقی پسند ملکی وقار اور دولت حاصل کرنے کی جدوجہد میں اتنے مصروف ہیں کہ اب تخلیق کی طرف توجہ دینے کا ان کے پاس وقت نہیں ہے۔ چونکہ اس دوڑ میں کامیابی صرف ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جن کی عمر پچاس کے قریب یا اس سے زیادہ ہے۔ اس لیے اصلاحی ترقی پسندوں میں نوجوان نمونے کیلئے بھی نظر نہیں آتا۔

ادب کو اصل ترقی پسندوں کی ضرورت ہے اور وہ خاصی تعداد میں ہیں لیکن وہ ایک ادبی گروہ کی حیثیت سے منظم نہیں ہیں۔ اس لئے یہ اچھا ادب پیش کر رہے ہیں۔ ان ترقی پسندوں میں سرفہرست جن فنکاروں کے نام ہیں ان میں ایک بلراج کومل کا نام بھی ہے۔

مستقبل کا مورخ جب ہندوستان کی آزادی کے بعد کے اردو ادب کا جائزہ لے گا تو بلراج کومل کی یہ مختصر کتاب اس کی رہنمائی کرے گی، بلکہ میں کہوں گا کہ اس ادبی جائزے کی بنیاد ہی بلراج کومل کی اس کتاب پر ہوگی۔

۔بقیہ: لمحہ مرگ کا شفیق وقفہ۔

ہیں۔ پریم چند کے افسانوں میں "قاتل" اور "مقتول" اکثر آنکھ جھپکنے کے وقفہ میں کمال فراخ دلی سے ایک دوسرے کو معاف کر دیتے ہیں اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جاتے ہیں۔ پریم چند اکثر پورے سچ کو قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں اس لیے وہ آدھے ادھورے سچ تخلیق کرتے ہیں۔ جب وہ پورے سچ کو قبول کرنے کی سطح پر پہنچتے ہیں تو گئودان جیسا عظیم ناول اور کفن جیسا عظیم افسانہ تخلیق کرتے ہیں۔

بیدی تک پہنچتے پہنچتے فنی رویے میں کچھ بنیادی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بیدی نہ تو پریم چند کی طرح آسان سمجھ کے افسانہ نگار ہیں اور نہ ہی منٹو کی طرح جگہ جگہ برمن میں خدا کی تلاش کرتے ہیں۔ بیدی کے کچھ کردار مرد اور عورتیں۔ خاص طور پر عورتیں زمین دوز جذبوں کی عورتیں ہیں۔ کیرتی، سوشیا، کلیانی، رانو۔ سب زمین دوز جذبوں سے بھرپور ہیں۔ اُن کے اکثر کردار الجھنوں میں گرفتار ہیں لیکن خود وقتی کے کرب سے گزرتے ہوئے بعض اوقات کلیانی اور مکی بہت، درباری لال اور ستیا، مندرلال اور لاجونتی، اور مدن اور اندو کی طرح ذہنی اور روحانی تطہیر کا تجربہ کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ خوش قسمت جیسے کردار بھاگی، ست رام، رانا اور رانو کا مرتبہ اختیار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بیدی کے نسوانی کرداروں کے ارد گرد گھومنے والے مرد زیادہ تر ناسمجھ قوت کے مظہر ہیں (گوکا مکی بہت، درباری لال وغیرہ) اس لیے بیدی کی بنیادی ہمدردی مرد کرداروں سے زیادہ نسوانی کرداروں کے ساتھ ہے۔ زمین کے ساتھ ہے۔ حق تو یہ ہے کہ بیدی کے نسوانی کردار اندو، لاجونتی، رانو، سیتا ماں ہی کے مختلف روپ ہیں۔ اس لیے بیدی کے ہاں جب سب راستے مسدود ہو جاتے ہیں تو بل یا کلیانی کے ننھے منے بیٹے کی صورت میں ایک بچہ ہی تاریک صورتحال کو منور کرنے کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ یا پھر کسی کے لڑکے کے پیر کو چھونے والی کندن جیسی ماں پیدا ہو جاتی ہے۔ یا پھر رانو نام کی عورت جو بھائی اور ماں ہوتے ہوئے بھی اپنے دیور منگل سے بیاہ کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے ایک بار پھر زمین بن جاتی ہے۔ دائروں کے تسلسل سے گزرتی ہوئی ایک بار پھر ماں۔ ایک بار پھر زمین!

بیدی کی پہچان زمین کی پہچان ہے۔ بیدی کی عظیم تخلیقات گرہن، دھان کے جوتے، ہڈیاں اور پھول، بھولا، گالی، چیچک کے داغ، اپنے دکھ مجھے دے دو، لاجونتی، بل، اندو، گرم کوٹ، کوکھ جلی، کوارنٹین، ایک چادر میلی سی، اور متعدد عظیم کہانیوں کی پہچان۔ اس محبت، رفاقت، یگانگت کی پہچان ہے جو صرف ماں کے قدموں میں نصیب ہوتی ہے۔ ہمارے دائرہ ادراک کو وسیع تر کر دیتی ہے۔ ہمیں ہمہ وقت جسمانی علائق اور جغرافیائی وابستگیوں سے ماورا لے جاتی ہے اور ہمیں انسانی صورتحال کی بنیادی نوعیتوں سے روشناس کراتی ہے۔

# زہے عز و شرف

## مدینے والے

لے کے آیا ہوں مناجات ۔ مدینے والے
ٹھیک ہوتے نہیں حالات ۔ مدینے والے

صبحِ آزادیٔ کامل کو ترستی امت
ختم ہوتی ہی نہیں رات ۔ مدینے والے

خون بہتا ہے تو بہتا ہی چلا جاتا ہے
شہر در شہر ہیں اموات ۔ مدینے والے

پھر سے دربار میں حاضر ہے زہے عز و شرف
آپ کی ہیں یہ عنایات ۔ مدینے والے

کھلتے جاتے تھے کسی دور میں سب در ہم پر
اب تو بنتی ہی نہیں بات ۔ مدینے والے

علم بڑھتا ہی رہے ۔ ربِّ شرح لی صدری
فکرِ نو ۔ تازہ خیالات ۔ مدینے والے

الاماں! امتِ مظلوم ہے فریاد کناں
روک دے ظلم کا ہر ہاتھ ۔ مدینے والے

نئے ذہنوں میں سوالات جنم لیتے ہیں
نہیں ملتے ہیں جوابات ۔ مدینے والے

دین پر جن کا اجارہ ہے ۔ نہیں جانتے ہیں
کیا ہیں اس کی نسل کے جذبات ۔ مدینے والے

کتنے دریا ہیں عقیدت کے شب و روز رواں
چشم در چشم ہے برسات ۔ مدینے والے

موج در موج چلے آتے ہیں عشاق یہاں
اک سمندر ہے تری ذات ۔ مدینے والے

کفر تو ملتِ واحد ہے منظم بھی ہے
ہوں مسلمان بھی اک ساتھ ۔ مدینے والے

محمود شام (کراچی)

## "گنبدیدہ"

(ہدیہ ہے یہ رسلِ آخر کو زیور
خود بھی کامل دین بھی جس کا کامل:)

ہے راہِ خدا جملہ تگ و تاز محمدؐ
جب دیکھیے سجدے میں سرِ ناز محمدؐ

قرآن کے آہنگ سے کم فرق ہے لیکن
آوازۂ الہام ہے آوازِ محمدؐ

بے کھٹکے چلا آئے ہو جویا جو بھی حق کا
بے حاجب و درباں ہے درِ بازِ محمدؐ

پایانِ سفر ہے جو رسولانِ سلف کا
در بست ہے وہ نقطۂ آغازِ محمدؐ

بے دم ہو نہ کیوں پیکِ تخیل کہ پرے ہے
ہر سرحدِ ادراک سے پروازِ محمدؐ

جو رسل تمہیں جو دے سا ہے بے لیت و لعل لو
اس سے کرو اندازۂ اعزازِ محمدؐ

ہے اس کا وجود انفس و آفاق میں یکتا
ہو کیوں نہ کہ ہے ممتنع انبازِ محمدؐ

یکدم بنے وہ ذرّہ زرتاب کہ جس پر
پڑ جائے نگہِ غلط اندازِ محمدؐ

منظورِ نظر اس کا سرافراز دو عالم
احسانِ مجسم نظر اندازِ محمدؐ

گو حوصلۂ نطق نہیں نوکِ زباں کو
ہے سینۂ خالد حرمِ رازِ محمدؐ

وہ خالدِ دل سوختہ وہ شاعرِ مرتاض
ہے جو لبِ زمزمہ پروازِ محمدؐ

عبدالعزیز خالد (لاہور)

# شکاری پرندوں کو لہو رنگ چونچیں ، لہو رنگ پنجے

حمیدہ معین رضوی (لندن)

فون بجتا ہی چلا گیا مگر جب میں نے ہیلو کہا تو ایک مردانہ آواز آئی۔ ہیلو کی دفعہ میں نے ہیلو کہا تو ادھر سے ٹوٹی پھوٹی آواز آئی ــــ خالہ بی میں ہوں۔ یہ ظاہر تھا کہ میرے بھانجے اطہر کی آواز تھی اور بہت بھرائی ہوئی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ بڑی مشکل سے اس نے کہا میں ایک گھنٹے میں پھر فون کروں گا لائن خراب ہے میں نے فون واپس رکھ دیا۔ اور ذہن خیال کی وادیوں میں گھومنے لگا چھ سال قبل ایک شام اسی وقت ماہ ترک کا فون آیا تھا۔ دسمبر کا مہینہ تھا عجیب اداسی کا عالم تھا منڈ درختوں کے نیچے سوکھے پتوں کا ڈھیر تھا جیسے بہار کا جنازہ خزاں کے دوش پہ لدا ہوا ہو ایسے میں ماہ ترک کی اداس آواز جو درد سے ڈوبی ہوئی تھی کتنی پریشان ہو گئی۔

"میں نے سنا ہے تم پاکستان آ رہی ہو کم از کم دو ہفتے صرف میرے گھر کے لئے رکھنا تم سے کسی بہت ہی سنجیدہ مسئلے پہ بات کرنی ہے" کیا بیٹے کا رشتہ کر رہی ہو؟ میں نے ایسے ہی مزاقاً کہا وہ روہانسی ہو گئی۔

تمہیں ٹھٹھولیاں سوجھی ہیں ــــ یار مزاق نہ کرو زندگی موت کا مسئلہ ہے اس کی آواز بھرا گئی اور میں نے فوراً معافی مانگی۔ دسمبر میں مجھے اکثر ماہ ترک یاد آتی ہے میری اس کی پہلی ملاقات بھی دسمبر میں ہوئی تھی وہ کالج کا یوم تاسیس تھا اس دن مزاحیہ مضامین کا مقابلہ تھا اگرچہ میں پہلے سال میں تھی مگر اول انعام میں نے جیتا تھا اس نے مجھے گھیر لیا۔ چلو اسی خوشی میں تمہیں چائے پلائیں۔ پھر ہم چند فٹ کے کمرے کی اکلوتی کینٹین میں جا بیٹھے۔ ہمیں پتہ چلا وہ ہماری رشتہ دار بھی نکلتی ہے اور ــــ اور یہ بھی کہ ہماری تاریخ پیدائش بھی دسمبر کی آخری ہفتے کی ہے اس نے مسکرا کر کہا۔ تمہیں ایک راز بتاؤں؟ تمام باغی روزگار دسمبر میں پیدا ہوتے ہیں تمہارا تو مجھے معلوم نہیں میں تو ہوں غیر معمولی ذہین اور شخصی یا غیر روزگار میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی۔ یہ کیا؟ یہی مطلب تھا۔ اپنی کم گو کم آمیز شخصیت کو جھٹلا جانے کیوں گزشتہ دس سال سے نہ اس نے رابطہ کیا نہ میں نے بس میں زمانے کی گردش کو دوری تھی اور جانے اسے کیوں نہیں رابطہ کیا۔ اس سے رابطہ ہمیشہ گہری مسرت کا پیش خیمہ ثابت ہوتا تھا ہم دونوں کے لئے۔ فون ختم ہو گیا مگر ــــ وہ وقت وہ لمحے جو ہاتھوں سے نکل گئے لوٹ آئے ــــ وہ زندہ رہیں گے جب تک میں زندہ ہوں اور باشعور ہوں۔ میرے ذہن میں فلم چل پڑی۔ میں فون کے سامنے بیٹھی سوچ رہی تھی۔ ہمارا کالج ان دنوں کچھ عجیب چیز لگتا تھا آپ بھی سوچئے مگر آنکھیں بند کر کے۔ ایک بڑا سا گیٹ ہے تقریباً بیس فٹ چوڑا دروازہ اس میں داخل ہوتے ہی چوڑا راستہ راستے یا روش کے دونوں طرف دو فٹ چوڑی کیاریاں جن میں گلاب کے پھول بھرے ہوئے اور کناروں پہ رنگ برنگے بارڈر پلانٹ اور پھر لہلہاتے بڑے بڑے شیشم اور نیم کے درخت جن میں سے بنگال سے دھوپ چھن کر آ جائے اس لمبے راستے کے دونوں طرف گھاس سے بھرے میدان جن کے بیچ سے راستہ گزر کر ایک جگہ ختم ہوتا تو اسکے دونوں طرف دائیں بائیں بیس فٹ کا عمودی راستہ پھر اسکے آگے ایک اکلوتی عمارت جیسے ایک ٹرین کھڑی ہے وہ اکلوتی عمارت تقریباً بیس کمروں پہ مشتمل تھی دس کمرے اس راستے کی دائیں طرف اور دس بائیں طرف کمروں کے آگے دس فٹ چوڑی محراب دار دالان پرانی وضع کا فرش، کمروں کے دروازے دالان میں کھلتے اور دروازے کے مخالف سمت پہ بڑی بڑی لوہے کی چھڑوں والی کھڑکیاں جن کے سامنے بیلوں تک پھیلے ہوئے کھیت اس ٹرین نما عمارت کے ایک سرے پہ ٹائلیٹ اور دوسرے سرے پہ سٹاف روم بس یہ ہمارا ڈگری کالج تھا۔ ایک اہم چیز اور گیٹ میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف مڑ جائیں تو ــــ پہلے کوئی بیس کمروں کی مستطیل عمارت تھی جو ہوسٹل کہلاتی تھی اور اس کی چار دیواری کے باہر کیلے کے درختوں کے جھنڈ میں ایک رہٹ تھا اور اسکو ایک بیل کھینچا کرتا چھوٹے چھوٹے ڈبوں کی زنجیر کنوئیں کے اندر جاتی ڈبوں میں پانی بھر کر اوپر آتی پانی کے ڈبے ایک ٹین کے مربع برتن میں خالی ہو کر نیچے واپس کنوئیں میں چلے جاتے اور پانی ڈبوں سے برتن حوض میں اور حوض سے کیاریوں اور وہاں سے کھیتوں کی طرف زندگی کے ایک طویل سفر پہ روانہ ہو جاتا ڈبوں کا کنوئیں میں آنا جانا مجھے ایک سحر میں مبتلا کر دیتا کالج کی چار دیواری کی دوسری طرف ایک چکی کی کوپ کوپ، فاختہ کی کوک، گھاس پہ بیٹھی بدبد کی تسبیح، ان سب میں مولانا روم کی مثنوی والی لے اور لے تو آواز پھر چکی اور علامہ اقبال کی سوشلزم کے حوالے سے نظم پھر ــــ چکی اور بدبد اور فاختہ کی مرکب آوازوں کے جادو پہ غور کر رہی ہوتی تو ماہ ترک مجھے پیچھے سے آ کر ڈراتی ــــ چلو بقراط اعظم گھنٹی بج گئی۔

اس کالج کی ایک اور تاریخی حیثیت تھی پہلے اسے سیالکوٹ کا گنڈا سنگھ سکول کہا جاتا تھا، جس میں جوگندر پال کے علاوہ بھی مشاہیر پڑھے تھے اور پھر ۱۹۴۷ء ــــ ۴۸ کے خوفناک دور میں جموں سے آئے مہاجرین کے لئے کیمپ ۱۹۴۸ء تک لوگوں کو گھروں میں بسا دیا گیا جسکے بعد فاطمہ جناح کے دورہ سیالکوٹ پہ لوگوں نے لڑکیوں کے کالج کا پر زور مطالبہ کیا اس وقت جمہوریت ہوتی تھی اسلئے فوراً احکامات کے ذریعے کالج ہنگامی بنیادوں پہ کھول دیا گیا مگر واہ رے بدنصیبی قائداعظم گئے پھر لیاقت علی گئے پھر جمہوریت گئی ہماری بدنصیبی ہم کالج پہنچے تو ایوب صاحب ایوان صدر میں لٹکا رہے تھے۔ جب ہم ڈگری لے کر یونیورسٹی پہنچے تو تب بھی وہ ہی براجمان تھے۔ ہم وہ بدنصیب نسل تھے کہ ہم نے کبھی اپنے ملک کے انتخابات میں حصہ ہی نہیں لیا۔ جب انتخابات ہوئے تو ہماری عمر نہیں تھی ووٹ دینے کی حالانکہ ہم بزعم خود اس قابل تھے کہ سیاستدانوں کو مشورہ دے سکتے تھے کاش انہوں نے ہماری وہ زور دار تقریریں سنی ہوتیں جو ہم کالج کے اسٹیج پہ کرتے تھے تو ہمیں ضرور مشورے کے لئے فی الفور

ایوانِ صدر میں بلوایا جاتا (یا جیل میں بند کر دیا جاتا) انھیں کیا معلوم ہم کیسی مدلل اور زبردست تنقیدیں کرتے تھے، کیلے کے درختوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر ہم نے مارلین منرو کے قتل، شاہزادی مارگریٹ کے پیٹر ٹاؤن سینڈ سے شادی کے مسائل کس پھرتی سے حل کئے تھے، سب سے دلچسپ تھا life and Time magazine میں کرسٹین کیلر کے دنیا بھر کے عموماً اور ایوب خان کیساتھ خصوصاً ملوث ہونے کی داستان کیلوں کے درختوں کے جھنڈ میں چھپ کر پڑھتے ہوئے اور تبصرہ کرتے ہوئے ہم خود کو کتنا اہم اور کتنا معتبر محسوس کرتے یہ ملک کی خوش قسمتی تھی کہ فیض احمد فیض اس وقت امروز اور پاکستان ٹائمز کے مدیر تھے اور جیل سے آ چکے تھے ورنہ ہم انکو چھڑانے کے لئے ضرور سول نافرمانی کی تحریک چلاتے آج اکیسویں صدی میں مجھے یہ خیال آ رہا ہے کہ "سول" تھی ہی کہاں جسکی نافرمانی ہم کرتے ہاں تو "فوجی" جو کچھ بھی تھی۔

اور ہم کتنی معصوم سیدھیاں تھیں جسم نہ کام بھی ہوتا اعمال چھڑانے کو بھی تیار رہتیں، بہر حال جب ووٹ ڈالنے کی عمر ہوئی تو انتخابات کا رواج ختم ہو گیا اور ہم نے مارے غصے کے خود کو ملک بدر کر لیا اچھا ہی ہوا ہم اس بیدائی سے صاف و صاف بچ گئے کہ انتخابات ہمیں راس نہیں آتے کیونکہ جب واقعی انتخابات ہوئے تو ہارنے والے نے وزارت عظمیٰ کی گاڑی کھینچنے کے لئے آدھا ملک اپنی وزارت کے صدقے میں دے دیا۔ بھلا بتایئے ایسے میں عام انتخابات کی بات کون کرتا چنانچہ طے ہوا کہ نوے ہزار اللہ کے بچے ہوئے لوگ ہی (جو ایک بڑی مہم سے سرفراز ہونے گئے تھے مگر نہ ہو سکے) واپس آ کر اکیلے ملک کو گھن کی طرح چاٹیں گے باقی لوگ خود کش حملہ آوری کا پیشہ اختیار کریں گے۔ میں شاید اپنی الجھنا کتنا رنج دہرائے ہی جاتی کہ فون کی گھنٹی بج گئی، اس دفعہ پول انجت تھا سیٹ پکی ہونے کی خوشخبری دے رہا تھا، اسی وقت ماہ ترکو کوئی خبر دینا بیکار تھا، کیونکہ وہاں رات ہو چکی تھی۔ ماہ ترکی ایک اور دلچسپ عادت تھی میرے خیال کا سلسلہ پھر جڑ گیا، وہ اردو کی بھاری بھرکم کتابیں پڑھتی اور اسے الفاظ ہی نہیں پورے پورے جملے زبانی یاد ہو جاتے وہ انھیں بے دھڑک استعمال کرتی اور انکی گفتگو خاصی بھاری بھرکم سنائی دیتی مگر کبھی کبھی سیاق و سباق کے لحاظ سے غلط بھی بول جاتی اور نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے ہنسی آ جاتی۔ "تمھیں میرے سر کی قسم بتاؤ کیوں ہنسیں؟" وہ اس وقت تک میری جان نہیں چھوڑتی جب تک میں اسے سچ سچ بتا نہیں دیتی کہ غلطی کیا ہے؟ وہ کبھی برا بھی نہیں مانتی، "تمھیں میں نے بے مقصد تھوڑی دوست بنایا ہے" میں بھی اسے سمجھاتی کہ دوست آن باشد کہ گیرد دست دوست ـــــ

کبھی کبھی ہم بے مقصد بیٹھے ہی چلے جاتے کسی طرح ہماری ہنسی نہ رکتی آج وہ فون پہ رو رہی تھی وہ اکثر کہتی "مجھے رونا آتا ہی نہیں" اور ادھر میرا یہ حال کہ مجھے ہنسی نہ آتی، ہمارے گھر کی کچھ تربیت ایسی تھی کہ زیرِ لب تبسم کی ہی عادت رہی مگر اسکے ساتھ رہتے رہتے میں بھی اکثر ہنسنے لگتی، بلکہ ہنسی کا دورہ پڑ جاتا، اور اس دورہ کا ہماری صحت پہ بہت اچھا اثر پڑنے لگا تھا۔ اللہ جانے اسے

کیا غم لگ گیا ہے؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے میں وقت کے گزرنے کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا نہ ہی اسکے دیے ہوئے ستم اور ظلم کے نشاں کی کوئی تصویر ہی مل پاتی ہے اسی لئے تو جب ہم گاؤن پہنے یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لینے کے لئے اپنے کالج آئے تو ہمیں پہلی بار اس شدید احساسِ زیاں کی خلش محسوس ہوئی جو آج تک ہے اور وقت کے گزرنے کے ساتھ اس میں کمی نہیں آئی، محراب دار برآمدوں کے سامنے تصویریں کھنچواتے ہوئے ہمیں تصویریں خراب ہونے کا کوئی غم نہیں تھا ہمارے آنسو ڈھلک کر گالوں سے ہوتے ہوئے گاؤن تک آ گئے تھے۔

محراب دار لمبی راہداریوں سے گزرتے ہوئے ہمیں محسوس ہوا ہم اپنے وجود کا کوئی حصہ وہاں چھوڑ آئے ہیں ـــــ اور میرا خیال ہے یقیناً تقریباً ہر دو زن سب کے یہی احساسات ہونگے، میں مقامی کالج میں ایم اے کرنے لگی اسے لاہور کے کسی کالج میں پڑھانے لگی، ایم اے کے فوراً بعد میری شادی ہو گئی جیسے اپنے یہاں شادیاں ہوتی ہیں، وہ جھٹ سے بڑی بوڑھیوں کے لہجے میں کہا "خیر چلو بیٹیاں اپنے گھر کی ہو گئیں" مجھے روتے روتے ہنسی آ گئی، پھر وہ بھی زندگی میں پہلی بار پھوٹ پھوٹ کر روئی، اسی ہفتے میں لندن کے لئے روانہ ہو گئی دس برس بعد اپنی آخری بہن کی شادی میں گئی تو اس سے ملاقات ہوئی اسکی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی، وہ مجھ سے اداس اور بوڑھی لگی میں نے پورے دلائل کے ساتھ اسے سمجھایا کہ اسکے لئے آخری ٹرین میں گنجائش رہ گئی ہے بیٹھ لو میں ایک ہفتے میں واپس جا رہی ہوں کوئی مدد چاہیے یعنی اگر کوئی آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا پسند ہو تو بتاؤ گر چہ چھوٹا سا ایک کنبہ ہوں۔ حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے وہ خاموش اور اداس دیر تک بیٹھی رہی میں بھی اداس ہو گئی ـــــ جب میں نے جانے کی کوشش کی مگر وہ چپ ہی رہی ـــــ البتہ اسنے دوسرے دن ہی مجھے فون کیا۔ دیکھو تمھاری بات میرے دل کو لگی۔ اب ایک مسئلہ ہے وہ مسافر دنیا کے دونوں کناروں پہ دس برس سے چل رہے ہیں میں نے انکو لاکھ سمجھایا کہ کنارے مل نہیں سکتے مگر وہ فرہاد جو نہر کھودنے پہ مصر ہے اور ہمارے یہاں لڑکی کی تنہائی کے زخموں سے مرنے دیں گے مگر ـــ بابر ـــــ تم تو جانتی ہو کیا خرافات؟ سوری کی اینٹ مسجد میں وغیرہ وغیرہ وہ اپنے برابر کا نہیں۔ اللہ قسم بڑا اچھوت ہے جبکہ میرے لئے صرف ساڑھے پانچ کے ہیں۔ پھر وہ ہنسی۔ اسے ہر بات میں سچ اپنی کرنے کی عادت تھی اور ستوال نے L.M.L کیا ہے بہت اچھی نوکری ہے آئی اے پی گریڈ انتہائی rare quality یعنی دیانت دار اور حلال رزق میں یقین رکھتا ہے، میں سنتی رہی یقین ہی نہیں ہوا اسی دن میں ملی بھی اور میں نے منظر بابائی کو ماہ تر کے لئے فوراً پاس بھی کر دیا، پھر میں اسکے والدین سے ملی اور واضح کر دیا کہ یہ شادی آج نہیں تو کل ہونی ہے کل ـــــ بہت دیر ہو چکی ہوگی، بات اسکے دماغ میں آ گئی اسی ہفتے پانچ ستارہ ہوٹل میں بے حد قریبی عزیزوں اور خیر خواہوں کی موجودگی میں اسکا نکاح اور رخصتی سب ہو گئی ماہ تر اور منظر بابائی ہمیشہ میرے احسان مند ہے اور میں انکی کامیاب شادی

کو دیکھ کر ہمیشہ دل سے خوش ہوتی رہی اور تھوڑا رشک بھی کرتی رہی، کیا فائدہ ہوا مجھے بڑی سے بڑی ملازمت کا کر کے؟ کچھ ۔۔۔ وہ دونوں ہر ہر بات میں مجھ سے مشورہ لیتے مگر ادھر دو تین سالوں سے میں کچھ غم ذات اور کچھ غم کائنات میں ایسی مصروف ہوئی کہ کسی سے تعلق ہی نہ رکھا ۔۔۔۔۔۔ نہیں ۔۔۔۔۔۔ ممکن ہے معلوم ہو میں کیسے کرب سے گزر رہی ہوں ۔۔۔۔۔۔ ممکن ہے کہ چونکہ اسکا شوہر محبت کرنے والا مثالی شخص تھا اسلئے میں نے طے کر لیا کہ اسکو کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتا ۔۔۔ مسئلے تو شوہر پیدا کرتے ہیں اگر وہ محاذ مضبوط ہو تو کوئی دکھ ہو ہی نہیں سکتا، مگر ماہ تر نے تو مجھے فکر مند کر دیا ہے۔ وہ واقعی اداس تھی۔ تو کیا دس سال محبت میں تڑپنے والا ۔۔۔ شوہر بھی ۔۔۔۔۔۔ نہیں اسے شوہر کی طرف سے کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتا، آخر کو یابالی کو میں نے approve کیا تھا۔

بچے بڑے ہو کر گھونسلہ چھوڑ دیتے ہیں بچے رہنا بھی چاہیں تو میرے شوہر جیسے مغرب زدہ لوگ ٹھوکرے مار مار کر انہیں بھگا دیتے ہیں اور تنہا مرنے کو پسند کرتے ہیں۔

ہمیں اپنی پرائیویسی عزیز ہے اب آپ مشرق میں سوال کریں گے کس لئے؟ یہ انہیں سے پوچھئے۔ مجھے تو اس وقت یہ معلوم ہے کہ بچے پیکنگ میں مدد کر دیتے۔ اب تنہا الجھ رہی ہوں تھک جاتی تو بچے ہاتھ پیر دبا دیتے تھے، بیماری میں تیمارداری کرتے اب یہ ہے کہ ۔۔۔۔۔ اور اگر مر جائے تو خود خوں کوئی نہ ہو۔ دس سال قبل میں ماہ تر کے گھر گئی تھی میرے بچے اس وقت سولہ اٹھارہ کے تھے اسکے بچے آٹھ اور دس کے تھے۔ بچے سب ایک کمرے میں سو گئے تھے میں اور ماہ تر ایک کمرے میں ہم نے ساری رات باتیں کی تھیں اور جیسے تھے اور میرے بچوں نے تبصرہ کیا تھا۔

''ممی آپ دونوں تو ٹین ایجرز کی طرح قہقہے لگا رہی تھیں کاش آپ ایسے ہی گھر پہ بھی خوش رہا کریں'' میں لاجواب سی ہو گئی زندگی میں ہر بات کا جواب ہے بھی کہاں؟

میرا ذہن پھر ماہ تر کی طرف اور اسکے ساتھ گذاری زندگی کی طرف مڑ گیا۔ بلا کی سردی پڑ رہی تھی پنجاب میں درجہ حرارت انجماد تک پہنچ چکا تھا غالباً جنوری کی ہی کوئی تاریخ تھی ہمیں کسی بین الکلیاتی مقابلہ میں جانا تھا وہ مشاعرہ میں گئی تھی میں مشاعرہ اور تقریر دونوں میں ہم نے سفر میں ساری رات باتیں کیں جب ہم ملتان کے اسٹیشن پہ اترے تو فجر کی اذان ہو رہی تھی اور ہمیں اپنے گرم کپڑوں میں ایسے سردی لگ رہی تھی جیسے ہم سیالکوٹ سے نہیں یورپ سے آ رہے ہیں کالج میں انہوں نے ہمیں سیدھے ہوسٹل پہنچا دیا تھا کالج کے اندر ایک چھوٹی سی مسجد بھی تھی ہم نے بڑے جوش وخروش سے اس میں نماز ادا کی ہم نے پہلی بار ریگستان میں پو پھٹنے کا منظر دیکھا اور پھر ناشتہ لگ رہا تھا تو ہم بے سدھ ہو کر بستروں میں جا سوئے تھے۔ اس شام کالج والے باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کو کوئی ورائٹی پروگرام دکھا رہے تھے ہم نے شام اپنی اپنی غزلوں کی نوک پلک درست کرنے میں گزاری ہوئی مشاعرے کے بعد ملک کی سیاست سے لیکر دنیا بھر کی سیاست پہ اپنے تئیں عالمانہ بحثیں کیں آج کی زندگی کو دیکھتے ہوئے احمقانہ خود اعتمادی کی خود نمائی کی۔ اس بڑے سے ہال میں کوئی بارہ بستر تھے اور مختلف شہروں سے آئی ہوئی talented teen agers اپنی ذہانت کا سکہ جما رہی تھیں رونق لوگوں کے دراز میں بستروں پہ دراز باتیں کرتے کرتے دھیرے دھیرے سب سو گئے۔ پھر غالباً ہمیں کھانے اور شو کے لئے جگایا گیا خیمے میں سٹیج لگا تھا انہوں نے منٹو کا ڈرامہ ''سچ تھیٹر میں'' سٹیج کیا تھا۔ مجھے یاد ہے ہمارے کچھ پلے بھی نہیں پڑا تھا مگر تھی ہمیں اچھا لگا۔ دن بھر سو کر ہم تمام رات جاگے آخری شفٹ میں ہمارے کمرے والوں نے اونگھتے ہوئے ناشتہ کیا اس دن تقریروں کا مقابلہ تھا جو گیارہ بجے شروع ہوا تھا۔ شام کو کھانے کے بعد مشاعرہ ہونا تھا ہماری حالت نیند سے ابتر تھی ہمیں خوب ڈانٹ پڑی ''بھول جاؤ کہ ٹرافی جیتنا ہے'' ہماری لیکچرر انچارج کہہ رہی تھیں اور لگ رہا تھا کہ وہ صحیح کہہ رہی ہیں پتہ ہے کتنا خرچہ ہوا ہے پرنسپل ہمیں کیا کہیں گی۔ اس سال کہیں جانے کے لئے، ہارنے والے گھوڑے پہ کوئی پیسہ نہیں لگاتا، ہمیں گھوڑے سے ہوئی مشابہت کچھ اچھی نہ لگی مگر سوائے خاموشی کے چارہ کیا تھا غلطی بھی ہماری تھی ہمارے پاس سوائے شرمندگی کے کچھ نہ تھا۔ وہ غصہ میں پیر پٹختی کمرے سے باہر چلی گئیں اور ہم نے دعائیں مانگیں کہ کوئی معجزہ ہو جائے۔ اور سو گئے آنکھ کھلی تو رات کے سات بج رہے تھے یعنی پروگرام شروع ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا بدحواسی میں اٹھ کر کھڑی ہوئی تو دھم سے گری پورا کمرہ بدحواس ہو گیا شور سے سب جاگ اٹھے اور دوڑے ہال کی طرف جہاں ادھورا ہو رہے تھے عجیب بات یہ ہے کہ اس دن سے آج تک میں اکثر یہ خواب دیکھا کرتی ہوں کہ میں کسی مقابلہ میں گئی ہوں اور سو گئی ہوں اور مقابلہ ختم ہو چکا ہے۔

بہرحال معلوم ہوا کہ محمد علی بوگرا کے انتقال کی وجہ سے اس دن کے سب پروگرام ملتوی ہو گئے۔ ہم سب نے آسمان کی طرف دیکھ کر شکرانے میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے آپ یہ نہ سمجھیں ہم بے حس تھے اور ہمیں خدانخواستہ محمد علی بوگرہ کے انتقال کا افسوس نہیں تھا بس جانے کیوں آسمان کی طرف دیکھا جس پہ ملتان کا تیز سورج چمک رہا تھا اور گرمی محسوس ہو رہی تھی ۔۔۔ سیالکوٹ کے انجماد کا کوئی پتہ نہ تھا۔ یہ کہنا بیکار ہے کہ ہم نے کس کی مرادیں پائیں اور ہمارے اوپر بین نہیں لگا اور ہم تیسری بار ٹرافی جیت کر لے گئے اللہ مغفرت کرے بوگرہ کو اسلئے بھی کہ محمد علی بوگرہ کا نام ایک بھولا بسرا ہو گیا ہے۔ قدسیہ آپا مرحومہ کی ۔ وہ میرے اسلامک لیکچر میں آیا کرتی تھیں ایک دن وہ میرے لئے کوئی خاص کھانا پکا کر لائی تھیں بدقسمتی سے اس دن مجھے لیکچر ملتوی کرنا پڑا مجھے ایک کانفرنس میں جانا تھا وہ ایک ہفتہ پہلے بتایا گیا تھا وہ اس ہفتے آ نہ سکی تھیں اسلئے انہیں معلوم نہ تھا اگلے ہفتے میں آئی تو معلوم ہوا کہ وہ میرے لئے کھانا پکا کر لائی تھیں اور میری وجہ سے پوری کلاس کیلئے کھانا لائی تھیں۔ اس دن وہ نہ آ سکی تھیں جانے کیوں مجھے بہت افسوس ہوا جیسے کوئی بہت قیمتی اثاثہ کھو گیا ہو۔ سوچا تھا مگر

پہنچ کر فون کروں گی شکریہ کروں گی جانے کیوں انکی صورت آنکھوں میں پھرتی رہی گلابی رنگ، نازک سراپا خوبصورت نقوش چھوٹا قد مناسب جسم، بنگالی تھیں اور اس نسل سے تعلق رکھتی تھیں جس نے ہمیشہ اسلامی بھائی چارہ میں یقین رکھا میں جب بھی پوچھتی۔

"قدسیہ آپا اگر آپکو اردو میں مشکل لگے تو میں انگلش میں تشریح کروں" وہ خوشدلی سے اپنی پیاری سی اردو میں کہتیں۔ نہیں تمہارے منہ سے اردو اتنی اچھی لگتی ہے کہ میں اور کسی زبان میں سننا پسند نہیں کروں گی۔ پھر مجھے کچھ سمجھ آتی ہے تو پھر ــــــ؟ اور پھر اس دن وہ نہیں آئیں میں نے سوچا قدسیہ آپا خفا ہو گئیں۔ خیر مناؤں گی اتنا تو مجھے چاہتی ہے جیسے بقول لوگوں کے "جہاں تمہارا پسینہ گرے وہاں خون بہا دیں۔ میں چائے پیتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ پیاری قدسیہ آپا جنکی ایم اے کے دوران اپنے سے پندرہ سال بڑے شخص سے شادی ہوئی۔ بچہ کوئی نہیں تھا انکے میاں بیوہ ہوئے پندرہ سال ہو چکے تھے لندن کے ایک اونچے لوگوں کے علاقے میں ایک فلیٹ تھا جہاں انہوں نے تنہا رہ کر گزارا ہو زندگی کی مصروفیات کا میں جانتی کی اس دن میں نے چائے پیتے ہوئے طے کیا کہ میں اگلے ہفتے جاؤں گی وقت نکال کر جاؤں گی۔ آج میں پانچ برس بعد سوچ رہی ہوں۔ وقت انسان کے رشتے کیسے اور کہاں کہاں جوڑتا ہے اور کیسے زبردستی توڑ دیتا ہے جیسے انسان سوئی ہے جس سے وقت کا کچا سوت کا تار رہتا ہے اور جب چاہتا ہے وقت کا معمار اس کچے سوت کو پھر سے نوچ کر دھنک دیتا ہے جیسے قرآن حکیم میں ہے "اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے اپنا سوت مضبوط کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر کے توڑ ڈالا"۔

اس دن وقت نے میری زندگی کا حصہ سوت کو بھی پھر سے دھنک ڈالا۔ قدسیہ آپا وقت نے مجھے روند دیا۔۔ میں اس دن فون کرتی رہی وہ نہیں ملیں کاش۔۔ صبح میں کالج جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی تو میری اور انکی مشترکہ دوست کا فون آیا ابھی گھنٹہ پہلے قدسیہ کا انتقال ہو گیا۔ یہ خاتون ڈاکٹر ہیں انہوں نے ہی دو بجے رات کو قدسیہ آپا کو ہسپتال داخل کروایا تھا۔ قدسیہ آپا اتنی مطمئن نظر آ رہی تھیں کہ ڈاکٹر جو ڈیوٹی پہ تھے وہ بھی دھوکہ کھا گئے ہسپتال کے ڈاکٹروں کو بھی نہیں پتہ لگا کہ وہ جا رہی ہیں رخصت ہو رہی تھیں۔ سوچا کہ ہسپتال میں دیکھ آؤں گی کالج سے چھٹی نہ لی، جنازہ ہسپتال سے مسجد اور وہاں سے قبرستان پہنچ گیا کچھ رشتہ داروں کو جائداد کی تقسیم کی بہت جلدی تھی تین دن بعد بنگلہ دیش سے آئی ہوئی بہنوں نے انکی ڈائری دیکھ کر ہم سب کو بلایا ہم نے دعا کی۔

سارے فلیٹ میں گھوم کر دیکھا۔ دیوار پہ تصویریں لگی تھیں۔ پہلی تصویر پہ نظر پڑی دو فٹ لمبی ایک فٹ چوڑی تھی قدسیہ آپا مرحومہ نوجوان خوبصورت لڑکی سی محمد علی بوگرہ کے ساتھ تھیں انکی بہن نے بتایا محمد علی بوگرہ ہمارے ماموں تھے۔ فیروز خان نون، عبدالرب نشتر، اور بہت سے وزراء کے ساتھ انکی تصاویر تھیں، میرا دل تڑپ کر رہ گیا، قدسیہ آپا کا غم دو چند ہو گیا مجھے محسوس ہوا پاکستان آدھے دھڑ سے ابھی ابھی مفلوج ہوا ہے کیسی گمنام تھیں کس کی نظر کھا گئی پاکستان کو۔۔ میں آج تک ماتم کر رہی ہوں پاکستان سے زیادہ قدسیہ آپا کا وقت انسان کو کیسی کیسی پٹخنیاں دیتا ہے میرے آنسو میرا دوپٹہ بھگاتے رہے ۔۔۔ سورج کے درخت کے پیچھے جا چکا تھا۔۔ پھر فون کی گھنٹی بجی تو میں نے گھڑی دیکھی پندرہ منٹوں میں میں صدیاں پھلانگ آئی تھی۔۔۔ اچھا ہوا صائمہ نے خود فون کیا انکے ساتھ وقت گزرنے کا موقع ملا کون جانے کل کیا ہو؟ اس وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ جنکو ہم پسند کرتے ہیں انکے مرنے سے ہماری زندگی کا وہ وقت جو انکے ساتھ گزرا وہ بھی مر جاتا ہے قدسیہ آپا۔۔۔ آپ میرے ساتھ زندہ ہیں دیکھئے آپکے بال بچے نہیں تھے تو کیا آپ میرے دل میں زندہ ہیں اور میرا احساس محرومی آپکو کبھی بھولنے نہیں دیگا۔ صائمہ کالج مقابلے مشاعرہ، شرقی اور محمد علی بوگرہ انکی موت اور قدسیہ بیگم میں نے آنسو پونچھے ہائے لوگ کیسے قافلے سے بچھڑ جاتے ہیں۔ بقول عبیداللہ علیم ہوا افکار و عارف یہ موت ہمارے حلقوں میں بھی داخل ہو چکی ہے" میں نے ایک طویل ٹھنڈی سانس بھری اور پھر ٹکٹ اور پاسپورٹ کو ایک جگہ رکھتے ہوئے سوچنے لگی۔۔ "جانے صائمہ کو کیا مسئلہ درپیش ہے؟" "مجھے معلوم ہے میں آ رہی ہوں سفر سے پہلے مجھے نیند ویسے بھی نہیں آتی اوپر سے صائمہ نے دماغ کو دھندے سے لگا دیا۔ باہر جاڑے کی شفاف چاندنی میں ٹنڈ منڈ پالے کے مارے درخت کھڑے رات میں زیادہ خوفناک لگ رہے تھے دور تک سوکھی ٹہنیوں کی قطاریں اور سوکھے پتوں کا ڈھیر۔۔۔ "دنیا کی زندگی کی مثال انکے سامنے بیان کرو جیسے آسمان سے بارش ہوتی ہے پھر ملا جلا سبزہ نکلتا ہے پھل اور پھول رنگ برنگے پھر۔۔ آخر کار۔۔ وہ چورا چورا ہو جاتا ہے جسے ہوائیں اڑائے لئے پھرتی ہیں" قرآن کہتا کیا میں نے کھڑکی سے اپنے ذہن کے پالے زدہ باغ کو دیکھا کون جانے؟ اگلی بہار تک کون ہوگا؟ اور کون قافلہ حیات سے۔۔۔ نکل جائے گا میں نے کھڑکیوں پہ پردے برابر کئے اور سونے کے لئے لحاف اوڑھتے ہوئے سوچا میں اور۔۔ صائمہ۔۔۔ اور کالج کی سرگرمیاں۔۔۔

دوسرے دن جہاز میں سوتے جاگتے میں سیالکوٹ کالج کے کوے کی منڈیر پہ بیٹھی سریلے انداز میں اقبال کی غزل گا رہی تھی۔ جو ہم نے یوم اقبال پہ گائی تھی۔

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرف محرمانہ۔۔۔

قریب تر ہے نمود جسکی، اسی کا مشتاق ہے زمانہ۔۔۔ پھر۔۔۔ کالج کے سبزی والے پلاٹ سے مولیاں گاجریں اڑانا۔۔۔ مالی کی بکری نے بچے دیئے تھے انکو گود میں لیکر کھلانا۔۔ جانے کہاں کہاں گھومتی رہی۔۔۔ پھرتی، آنکھ اس اعلان سے کھلی کہ جہاز کراچی اترنے والا ہے بیلٹ باندھ لیجئے۔۔۔ کراچی کا موسم سرے کے مقابلہ میں بہت خوب صورت تھا ہفتے بھر میں شادی سے فارغ ہو کر میں نے صائمہ کو فون کیا کہ میں فارغ ہوں۔ صائمہ فوراً آ گئی اور کہنے لگی معذرت کی کہ وہ شادی میں بوجہ مجبوری نہ آ سکی اور پھر جلدی سے میرا سامان گا

ڑی میں ڈال کر چل پڑی جیسے کسی پریشانی میں ہو۔ وہ گاڑی چلاتی رہی میں خاموشی سے سوچتی رہی بہت دیر بعد جیسے اسنے میری موجودگی کو محسوس کیا اور تھوڑی ندامت سے کہا۔ شادی کیسی رہی؟ مجھے واقعی افسوس ہے بس تمھیں جب صورت حال معلوم ہوگی تو۔۔۔ تم فکر نہ کرو گاڑی چلاؤ ٹریفک بہت ہے۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ کراچی میں تو میں ہرگز گاڑی نہ چلاؤں۔ کیا بلا کی ٹریفک ہے۔ آدھے گھنٹے میں ہم اسکے گھر پہنچ گئے۔ بہت اچھا معقول صاف ستھرا گھر تھا۔ منظر کی یہ بات مجھے پسند تھی کہ وہ بہت بڑے سرکاری عہدے پہ فائز تھا مگر اسکے گھر میں بغیر حرام کے خطرے کے کھانا کھا سکتی تھی ورنہ پاکستان میں سرکاری عہدوں پہ فائز بہت کم لوگوں کے گھر رزق حلال ملنے کی امید ہے۔ گاڑی کی آواز سنکر وہ گیٹ کھولنے آگیا اور میرا کھلے دل سے استقبال کیا۔

شام کے نو بج رہے تھے تھوڑی دیر میں کھانا لگ گیا۔ نادرا سائرہ کی بیٹی کو میں نے پانچ سال بعد دیکھا تھا بہت سمجھدار اور شائستہ اطوار کی بچی تھی۔ میں نے اطہر جلیل کے بارہ میں پوچھا تو سب ایک دم اداس ہو گئے۔ میں نے ہاتھ روک لیا۔ سائرہ نے کہا "وہ کھانا کھا کر سو چکا ہے کچھ طبیعت ٹھیک نہیں" تمھیں بلایا اسی لئے ہے سب بتاؤں گی۔ صبح پھر اسنے واقعات یوں بیان کئے۔ "دو سال قبل امتحان ختم ہونے کے دوسرے دن اطہر نے بتایا کہ دوستوں کے ساتھ پارٹی میں کسی کے گھر مدعو ہیں۔ ہم نے منع نہیں کیا آخر کو سترہ سال کا ہو گیا تھا۔ اسنے امتحان میں کافی محنت کی تھی میں نے سوچا چلو تھوڑا خوش ہو جائے گا ہم نے کہا جلدی چلے جانا۔ چار بجے کا گیا جب بارہ بج گئے تو ہمیں تشویش اور اندیشوں نے گھیرا۔ یہ سقوط افغانستان کا زمانہ تھا امریکن بس نوجوانوں کو خوامخواہ پکڑ لیتے تھے۔ تمام رشتہ داروں اور دوستوں کو فون کیا مگر کوئی پتہ نہیں لگا۔ منظر اور اسکے بھائی گاڑی اور موٹر سائیکل میں دور تک چکر لگاتے رہے تین بجے رات کو تھکے ہارے واپس آئے تو اطہر کو دروازے پہ پڑا دیکھا اسکی قمیص خون سے بھری ہوئی تھی اور سر میں پیچھے کی طرف لگے ہوئے تھے اور وہ نیم بیہوش تھا۔ صبح ایک اور قیامت آئی۔ اٹھا تو ہم میں سے کسی کو پہچان ہی نہیں رہا تھا۔ بلکہ دہشت زدہ تھا۔ اور اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ خود کون ہے۔

"مجھے معلوم ہے تم بڑے پھرتے ہو مجھے مار ڈالو گے" میں نے وہ چہرا دیکھا ہے" ہمیں دیکھتے ہی چلانے لگتا کسی طرح ڈاکٹر کے پاس کیا جانا کمرے سے نکلنے کو تیار نہیں۔

خیر ڈاکٹر نے کہا چوٹ آئی ہے ٹھیک ہو جائے گی۔ جتنے بھر پیوا کر وہ انجکشن لگا کر چلا جاتا ہم کھانا لے جا کر رکھ دیتے۔ ایک دن نادرا نے ہمت کی اور جاگتے میں جا کر اسے شربت دیا جو اسنے لے لیا اور سرگوشی میں پوچھا تم تو ایک اچھے خاندان کی بچی لگتی ہو تم ان لوگوں میں کیسے پھنس گئیں۔۔۔ نہیں میں انہیں کچھ نہیں کرسکا وہ بہت خطرناک ہیں۔ نادرا نے بھی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سرگوشی ہی میں کہا بھائی وہ میدان چھوڑ کر بھاگ چکے ہیں۔ اور میں نے امی اور ابا کو بلا لیا ہے اب فکر کی بات نہیں آپکو کوئی چھو بھی نہیں سکتا۔

کیا میرے امی اور ابا ہیں؟ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ میں کون ہوں؟ نادرا نے کافی بک بک کی مگر فرق نہیں پڑا۔ پھر نادرا کے ساتھ میں بھی گئی وہ ڈرا نہیں لیکن کوئی توجہ بھی نہیں دی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قیامت بہت قریب ہے اسی لئے اب ماں کے خون کی خوشبو بھی جھوٹی ہو گئی ہے۔ اور باپ سے تو بہت ہی لگاؤ تھا انہیں بھی نہیں پہچانا۔ بار بار پوچھتا آپ کون ہیں؟ میں کون ہوں؟ آپ جو بھی ہیں بہت اچھے لوگ ہیں آپنے مجھے پناہ دے رکھی ہے ورنہ میرے دشمن مجھے مار ڈالتے۔ چند ہفتے ہوئے جب وہ ایک دن صبح صبح نیچے آیا مجھے کہنے لگا۔ خیر النساء کا فون نمبر ہے؟ وہی تمھیں میں اور میری بہن خالہ بی کہتے ہیں۔ میں نے نادرا کو آواز دی اور پوچھا یہ کون ہے؟ اسنے پہچان لیا۔

میری بہن نادرا اسنے جانے کیوں تمھیں پوچھا اسلئے میں نے تمھیں بلایا۔ کہ میں نے سوچا تمھارے آنے سے شاید کچھ پردہ اٹھے تمھارے ذکر پہ وہ پہلی بار مسکرایا اور دیر تک تمھاری باتیں کرتا رہا۔ ایک تو تمھارا نمبر نہیں تھا اوپر سے یہ افتاد پڑی تمھارے بھائی کو فون کیا تو معلوم ہوا تم آرہی ہو اسلئے فوراً تمھیں فون کیا۔ تمھارا تجربہ بھی youth counselling کا ہے۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے خیر اکہ انسان زندگی میں ایک بار ضرور گردش زمانہ کا شکار ہوتا ہے میرا شوہر اتنا اچھا کہ اس سے بہتر کی توقع نہیں ہو سکتی۔ اتنی دیر میں شادی ہوئی مگر اس عمر میں اللہ تعالی نے مجھے اولاد دی لیکن اس مصیبت نے تو مجھے ڈیڑھ سال سے قید کر کے رکھ دیا ہے۔ ذہنی پریشانی الگ مالی الگ مجھے نوکری چھوڑنی پڑی۔ نقصان مالیہ پھر تاجر ہے۔ سب مجھے جانے کیوں تمھارے اوپر اتنا اعتماد ہے اور اللہ پہ یقین کہ وہ تمھارے ذریعے میری پریشانی دور کر دیگا۔ مجھے ایسا ایک خواب بھی نظر آیا تھا۔

تمھیں اللہ نے میری مدد کا بہترین ذریعہ بنایا۔ اسلئے مجھے اور بھی بھروسہ ہو گیا۔ تمھیں یقین نہ ہو مجھے ہے کہ تم نہ ہوتیں تو میں کنواری کی لاش اٹھائے ابھی تک پھر رہی ہوتی۔ اور منظر نے تو طے کر لیا تھا کہ شادی ہوگی تو مجھ سے ورنہ نہیں۔۔۔ "اسی بات کو سوچتے ہوئے سو جاؤ" ۔۔۔ میں نے اسکا ہاتھ گرم جوشی سے دبایا۔ جب کہ میں سوچ رہی تھی اپنی قسمت تو سنوارنے کی چلو کسی اور کی ہی ہو جائے۔ منظر ناشتے کی میز پہ اطہر کو لے کر آئے اور پیار سے اس سے کہا" بیٹا دیکھو تم سے کون ملنے آیا ہے؟" اسنے مجھے دیکھا اور چند لمحے دیکھتا رہا اسکی آنکھیں ڈبڈبا گئیں میں نے اسکو اسے پیار دیا اور اپنے ساتھ والی کرسی پہ بٹھایا میں اپنے سفر کے کچھ لطیفے سنانے لگی وہ کسی اور دنیا میں رہا مجھے افسوس ہوا اچھا بھلا لڑکا جانے کیا ہو گیا؟ ہاں کچھ سوالات ضرور کئے یہ صورت حال مجھے پریشان کن لگی دل میں جتنی دعائیں یاد تھیں مانگیں اسے غور سے دیکھا وہ کچھ موٹا اور بھدا لگا اور ایک دم توندلی۔ شاید اسی کی وجہ سے دروازوں پہ ابھی تک پردے پڑے تھے۔ پردے کھولے تو وہ ڈرتا تھا۔ مجھے الجھن سی ہو رہی تھی ویسے بھی امی کے آنے کا وقت ہو رہا تھا سائرہ نے مجھے آہستہ سے کہا کمرہ دیکھنے کے بہانے اوپر چلی جاؤ۔ میں اسکے ساتھ یہ کہکر چل پڑی کہ چلو تمھارا کمرہ

دیکھوں۔ انکے پیچھے چلتے ہوئے میں نے دیکھا اسکے بال کافی عرصے سے بھی لمبے تھے۔
اسکو میں نے کئی سال بعد دیکھا تھا باپ اور ماں کا مرکب خوبصورت لڑکا دبلا پتلا لمبا اب گھر میں بند بند جسم بھاری ہو گیا تھا چہرے سے پریشانی نمایاں، کبھی کبھی ایک دم محسوس ہوتا کہ وہ ماحول سے بےخبر ہے۔ ماہر کا کہنا تھا کہ آج پہلی بار اسنے کچھ باتیں کی ہیں ورنہ ہم دونوں سے چڑ جاتا ہے اسکا کمرہ کشادہ تھا دونوں طرف کھڑکیاں تھیں جن کے باہر لوہے کی سلاخیں تھیں اور جالیاں پھر شیشے کی کھڑکیاں اندر کی طرف۔ ائرکنڈیشنڈ بھی تھا جو سردی کی وجہ سے آج کل بند تھا اچھا فرنیچر اس میں ایک واش بیسن بھی تھا یہ کمرہ مہمانوں کے خیال سے بنایا گیا تھا وہ بڑے سے بستر پہ تھے۔ ٹی وی دیکھنے سے بھی وہ خوفزدہ تھا البتہ ایک ریڈیو ایک میوزک سسٹم ضرور تھا۔ اس کمرہ کی صفائی ماہر یا انکی بیٹی کرتی۔ میں ایک آرام کرسی پہ بیٹھ گئی وہ بے چینی سے ٹہلتا رہا پھر میرے کہنے سے بیڈ پہ بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا کالج کیوں نہیں جاتے تو وہ ٹال گیا۔ پھر تھوڑی گفتگو آگے بڑھی تو میں نے کالج کے بارہ میں سوال دہرایا۔ "کوئی فائدہ نہیں۔ کسی چیز کا کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے کالج سے نفرت ہے مجھے ظلم سے نفرت ہے مجھے دہشت گردی، تشدد، جبر اور ناانصافی سے نفرت ہے کوئی درندہ اپنی نسل کے لوگوں کو نہیں کھاتا سوائے انسان کے اسلئے مجھے انسان سے نفرت ہے مجھے اس شہر سے نفرت ہے" موقع غنیمت جان کر میں نے کہا اگر کسی دوسرے شہر جا کر رہیں تو پسند کرو گے کالج جانا۔۔۔ وہ بولا کچھ نہیں صرف حیرت سے مجھے دیکھتا رہا پھر پلک جھپکائے۔

دیکھو اگر ظلم اور ناانصافی تم نے دیکھی اور تم نے اسے روکا نہیں تو تم بھی اس میں شریک ہو۔ ناانصافیاں اور ظلم اسلئے ہوتا ہے کہ لوگوں کے دل سے قانون کا احترام ختم ہو جاتا ہے چاہے وہ ملک کا قانون ہو یا اخلاقی اور مذہبی قانون ہو۔۔۔ کیونکہ قانون ہی ہماری حفاظت کا ضامن ہے۔" نہیں قانون صرف طاقتور کی حفاظت کا ضامن ہے۔ مجھے قانون سے بھی نفرت ہے ہم جیسوں کو خودکشی کر لینی چاہیے" یہ تو بہت شکست خوردہ رویہ ہے اور جو ظلم پہ چپ رہے وہ ظالم کا ساتھی ہے یہ مجھے بھولتا نہیں۔ جانے کیوں اسکا رنگ پیلا پڑ گیا۔ دیر تک وہ چپ رہا پھر تھوڑی دیر بعد میں نیچے آ گئی۔ شام کو دوبارہ میں اوپر گئی میں اسکو بولنے پہ آمادہ کرتی رہی وہ مجھسے زیادہ چڑ جاتا نہیں جیسے والدین سے چڑ جاتا تھا۔

دوسری شام اسکی اداسی کچھ کم محسوس ہوئی۔ شام کو منظر کے آنے پہ ہم نے کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے بات چیت کی اور اسنے بھی حصہ لیا جو والدین کی رائے میں واضح فرق تھا۔

میں نے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے کچھ لطیفے بھی سنائے اور وہ ہنسا بھی۔ مگر کئی بار میں نے غور کیا کہ وہ ایک دم سہم کر چپ ہو جاتا، مگر وہ ذہنی طور پہ بالکل صحیح انسان لگا اور میں سمجھتی ہوں تھوڑی کوشش سے وہ تھوڑے دنوں میں ہی زندگی کے میلے میں شامل ہو سکتا تھا۔

مجھے یہاں آئے کئی دن ہو گئے تھے وہ اب مجھسے کافی مانوس ہو گیا تھا۔ اس دن منظر بابا کی چھٹی تھی ناشتے کے بعد ماہر نے پوچھا اگر تم انکی دیکھ بھال کر سکو تو ہم دونوں شاپنگ کر آئیں؟ گذشتہ دو سال سے ہم اکٹھے گھر نہیں چھوڑ سکے ویسے نارمل ہی ہے انکے جانے کے بعد میں نے اطہر سے کہا آؤ ذرا لان میں ٹہلتے ہیں۔ نہیں نہیں کہتا ہوا وہ بھاگ کر سیڑھیوں کی طرف آیا اور بدحواسی سے سیڑھیوں پہ چڑھ گیا جب تک میں سیڑھیوں تک پہنچوں، وہ دوسری منزل تک پہنچ گیا تھا میں حیران رہ گئی۔ میں نے سانس درست کی پھر اوپر جا کر پوچھا۔ "بیٹے کیا بات ہے؟۔۔۔ کہنے لگا وہ آ جائیں گے۔ وہ۔ وہ نہیں آپکو نہیں پتہ۔ اوپر جا کر وہ دھم سے بستر پہ گر گیا۔ میں نے پریشانی سے پوچھا طبیعت کیسی ہے؟ کہنے لگا چکرا رہا ہے۔ میں دس منٹ بیٹھی رہی پھر محسوس ہوا کہ وہ سو گیا ہے تو میں نیچے آ گئی۔

ماہر اور منظر کے آنے پہ میں نے انہیں رپورٹ دیتے ہوئے تجویز پیش کی کہ کسی طرح اسکو لاہور لے چلیں ممکن ہے ماحول بدلنے سے کچھ گرہیں کھل جائیں۔ ہو سکتا ہے وہ نانی نانا کے گھر رہنے پہ راضی ہو جائے تو پھر کالج میں داخلے کے لئے بھی سوچا جا سکتا ہے۔

"میں کل آفس میں ایک دو ہفتے کی چھٹی کی بات کروں گا ایک ہفتہ لاہور رہ کر۔۔۔ اگر حالات سازگار ہوئے تو پھر سب اکٹھے سوات وغیرہ چلیں گے۔ ورنہ جو اللہ کی مرضی میں تو" اسکا گلا رندھ گیا۔ ناشتے کے بعد میں نے اطہر سے پوچھا۔ "اطہر میں لاہور اسلام آباد جانا چاہ رہی ہوں کیا تم مجھے لے چلو گے؟ وہ بے اعتباری سے مجھے دیکھنے لگا۔ کیوں بھئی تمہیں کراچی سے نفرت ہے نا باہر جانے میں کیا قباحت ہے؟ ویسے بھی تم اکیلے کیسے رہو گے؟ ماہر بیچاری دو سال سے تمہاری وجہ سے قید ہے" مگر ایئرپورٹ پہ جانا مسئلہ ہے اس نے بڑی سنجیدگی اور فکرمندی سے کہا۔

ہم رات کی فلائٹ سے چلیں گے گاڑی اندر آ جائے گی تم لمبا کوٹ پہن کر مفلر لپیٹ کر بیٹھ جانا کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ تم کون ہو۔ وہ تھوڑا سا مسکرایا پھر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ یہ بہت مشکل ہے مگر۔۔۔ میں یہاں اکیلے بھی تو نہیں رہ سکتا۔ اصل میں تو۔ بس یہ سمجھو کہ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے میں نے پوری سنجیدگی سے کہا "مگر میں تو صدیوں سے باہر نہیں نکلا مجھے ڈر لگے گا" یہ طے ہے نا کہ تمہیں خطرہ کراچی میں ہے کراچی سے ہزار میل دور تمہیں کون جانتا ہے؟ وہ کچھ دیر چپ رہا پھر اس نے کہا۔۔۔ "میں اس پہ غور کروں گا"

اس تمام دن وہ خاموش رہا مجھے پریشانی ہوئی کہ کہیں مجھسے خفا تو نہیں ہو گیا جو قطعی نیک شگون نہیں ہو گا۔ میں نے اوپر جا کر پوچھا تو معلوم ہوا وہ تمام دن سوتا رہا ہے۔ کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ شام کو کھانا کھانے کے لئے نیچے آیا سب لوگ باری باری چلے گئے تو اسنے کہا۔۔۔ خالہ کیا آپ فارغ ہیں؟

میں نے کہا ہاں بالکل۔۔۔ "اگر میں آپ سے کسی کے بارہ میں کوئی سوال کروں تو کیا یہ بہت بری بات ہو گی؟ میں نے کہا تم نے ہوئے

پوچھنے کی کوشش نہیں کی؟۔ کہنے لگا۔ ''وہ بہت اچھے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ وہ میرا سوال سمجھ نہیں سکیں گے'' آپ یورپ میں رہتھو کونسلنگ کا کام کرتی ہیں آپ ہی صرف یہ بات سمجھ سکتی ہیں۔ کاؤنٹی بون میں ہوتے نہیں۔۔۔۔ پھر بھی میں نے کہا بالکل میں تو ایک سائج کے طور پر تمہارے سوال پہ غور کروں گی ''exactly'' اس نے کہا۔ چلو میں کوشش کروں گی میں اپنے جواب سے تمہیں مطمئن کرسکوں۔ اس نے ایک طویل سانس لی۔۔۔۔ کچھ دیر تذبذب میں رہا پھر کہنے لگا۔ یہ بتائے کہ gay اور Homo میں کیا فرق ہے؟ کیونکہ اس سوال کا میری موجودہ صورت حال سے کوئی گہرا تعلق ہے مگر میں بتا نہیں سکا کہ کیا؟ سوال حیران کن نہیں تھا سوال ایک پاکستانی لڑکے کے منہ سے حیران کن معلوم ہوا۔

میں نے اسکے وجود و سراپے کو پوری گہری تنقیدی نگاہ سے دیکھا۔ کیا یہ جنس بدل رہا ہے یا اسکے کسی سے غیر فطری تعلقات ہیں اور دونوں ہی حقیقتیں تو تھا کہ ہیں وہ سیدھا سیدھا میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا میرے ذہن نے فوری طور پہ کہا۔ یہ بچہ نہیں ہے جو اسے پریوں کی کہانی سے بہلایا جاسکتا۔ قبل اسکے کہ میں لفظوں کو تول کر گفتگو شروع کروں اس نے ایک اور فائر کردیا۔ ''اسلامی نقطۂ نظر اسکے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے؟''

Gay تو ہیجڑوں کو کہتے ہیں۔ جو شادی بیاہ میں ناچتے گاتے ہیں میں پاکستان کی بات کر رہی ہوں۔ برطانیہ میں یہ لوگ عموماً زلف تراش اور فیشن ڈیزائنر بن جاتے ہیں میک اپ مین بھی بنتے ہیں اور روزی کے لئے کیا کیا کام کرتے ہیں مجھے معلوم نہیں۔ یہ لوگ پیدائشی طور پہ ناقص جسم کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں نہ مرد ہیں نہ عورت بلکہ دونوں، ماں کے پیٹ میں ہی جین کی خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور۔۔۔۔ میں نے ایک طویل سانس کھینچی۔ اور کبھی کبھی بعد میں بھی نقص نظر آنے لگتا ہے اسکو معذوری کہہ سکتے ہیں۔ سارا اچکر جین کی گڑبڑ کا ہے مگر کیوں؟ اس نے جلتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

قرآن میں ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''میں جسے چاہتا ہوں بیٹا دیتا ہوں جسے چاہوں بیٹی جسے چاہوں جڑواں بچے دیتا ہے اور جسے چاہوں بانجھ رکھوں (جسے چاہوں ناقص جسم دیدوں)'' اسکا مطلب یہ ہے کہ ناقص جسم والے انسان نہیں ہیں اور ہمیں انہیں ذلیل کرنا چاہئے۔ بلکہ مجھے بتایا گیا ہے کہ ایسے بچے ماں باپ کی بد اعمالیوں کی سزا ہیں اسلئے ماں باپ ایسے بچوں کو چپکے سے باہر پھینک آتے ہیں یا ہیجڑے گروپ کو دے آتے ہیں۔ اور اگر۔'' بلکہ میرے اسکول میں تو لڑکے کہتے تھے نہیں مارنا ثواب ہے کیونکہ وہ انسان نہیں۔ مجھے یاد ہے وہ کیسے ستاتے تھے اسکی آواز بھرا گئی۔۔۔۔ پھر وہ خاموش ہی رہا۔ کیا انہیں ایذا دینا اسلام میں جائز ہے؟ کیا انکے حقوق نہیں ہیں؟ اس نے سکتے کے بعد پوچھا۔ پہلی بات، ہمارا معاشرہ نہ اسلامی ہے نہ ہماری معاشرت اسلامی، نہ لیکن دین اسلامی ہے نہ معاشرہ کے کمزوروں کو اسلامی حقوق کی کوئی سند کبھی دی گئی ہے۔ ایسے میں اسلام کو استعمال کرنا بہت بڑی حماقت ہے مگر تم یہ کیوں جاننا چاہتے ہو؟ میں نے بہت سنبھل کر یہ سوال کیا۔ لفظوں کے بادل گہرے ہو گئے۔

''میں اپنے ضمیر کے اطمینان کے لئے جاننا چاہتا ہوں۔ اپنی ذات کی تسکین میں ہیجڑوں کے اداروں اور مرضی کو تو دخل نہیں پھر؟

اسلام میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو چیز مخلوق کے طور پہ پیدا کرتا ہے اسکی قدر و قیمت کو سمجھنا چاہئے یہاں تک کہ جانوروں کو بھی ایذا دینا جائز نہیں۔ بلکہ غلطی سے بھی اگر کوئی جانور مل جائے تو کفارے میں تین روزے رکھنا ضروری ہے۔ اور ناحق ظلم سے کسی کو مارنے کا مطلب قتل ہے جسکی سزا موت ہے خواہ یہ مقتول مسلمان ہو کافر مرد ہو عورت ہو یا ہیجڑا ہو۔ یہ قرآن و سنت کا قانون ہے۔ نفسِ اہل جدید آدمی کے سوا دین اسلام کی بات نہیں کر رہی نہ ہی اس روشن پاکستان کی بات کر رہی ہوں جس میں روز قتل عام ہوتا ہے اور سہرا اسلام کے سر باندھا جاتا ہے۔ اب یہ سوال کہ ہیجڑے کے ساتھ والدین کیسا سلوک کریں۔ تو انہیں انکے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہئے جو بچوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ حسب استطاعت کھلانا پہنانا، تعلیم و تربیت کرنا محبت اور حفاظت کا احساس دینا۔ انہیں شریعت میں مردوں میں ہی شریک کیا گیا ہے اور ان سے عورتوں کو ستر پوشی کا حکم دیا گیا ہے۔ نماز کے نظم و ضبط میں انہیں لڑکوں کے بعد آخری صف میں کھڑا ہونے کو کہا گیا اسکے بعد ایک پردہ ہونا چاہیے پھر عورتوں کی صف ہوگی، وہ مردوں کے امام نہیں ہو سکتے جیسے بچے اور عورتیں مردوں کی امامت نہیں کر سکتے۔ اگر دو یا دو سے زیادہ صرف ہیجڑے ہیں تو وہ آپس میں اپنے گروہ کی امامت کر سکتے ہیں۔ جیسے عورتیں عورتوں کی امامت کر سکتی ہیں۔ اسلئے انہیں دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم دی جانی چاہیے اسلام نے انہیں حفاظت دی ہے تاکہ معاشرے کے اندر وہ مہذب زندگی بسر کر سکیں اور ازیتوں سے بچے رہیں۔ مگر مرد کیا زیادہ ذہین ہوتے ہیں جو ہیجڑے اور عورتیں انکی امامت نہیں کر سکتے؟ یا انہیں بہتر مخلوق بتایا گیا ہے؟ Master piece of God's creation اس نے نظریہ لہجے میں کہا۔

تم اپنی عقل سے سوچو کیا مرد جو شغل کے لئے اپنی بہنوں بیٹیوں کو قتل کردیتے ہیں کہ اس قتل سے انکی عزت میں اضافہ ہو جاتا ہے وہ ہیجڑوں یا عورتوں کے پیچھے نماز ادا کرسکتے ہیں؟

نہ مردوں کی نفسیات ہیجڑوں کی امامت قبول کرتی نہ ہیجڑوں کی نفسیات امامت کی ذمہ داری سنبھال سکتی ہے۔ مرد امام کے پیچھے نماز ادا کرتے ہوئے بھی ذرا سی خفگی میں اسی امام کو جلا دیتے ہیں یہ میں مبالغہ نہیں کر رہی ہوں کوئٹہ ضلع میں ایسا ہو چکا ہے۔۔۔۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر اس نے کہا ''اگر یہی طریقہ رائج ہوتا تو ضرور ہیجڑے امامت قبول کرتے'' بالکل نہیں کرتے اسلئے کہ انکی فطرت کے مطابق جو حکم ہوا کیا وہ کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اسے مردوں کی جابر اور خون ریز فطرت کا علم ہے۔ پھر عورتیں اگر امامت کریں تو مرد نماز قطعی نہیں پڑھیں گے عورتوں کو گھور تے رہیں گے اور ہیجڑے سے تو اس صورت حال کا مقابلہ نہیں کر سکتے لہٰذا اللہ نے

جنکو جتنے حقوق دیے ہیں وہ بھی انہیں نہیں مل سکے تو باقی کا ذکر ہی فضول ہے
پھر امامت میں کوئی ذہانت درکار ہے کہ عورتیں امامت کا شوق رکھیں گی۔

مجھے بہت دکھ یہ سوچ کر ہوتا ہے کہ مرد خود کو قدرت کی بہترین تخلیق سمجھتے ہیں اور اللہ تعالے کا نائب مگر ۔۔۔ انکی ہوس کا شکار ہوتیں بچے چھوٹے لڑکے بچیاں سب ہوتے ہیں اسکے لئے کیا کہیں سزا نہیں ہے جو زیادتیاں وہ کرتے ہیں ان کی؟

مجھے لگتا ہے کہ تم گھر میں بند بند ایسی غیر متعلق باتوں کے بارہ میں سوچتے رہتے ہو جن پہ تمہیں اختیار ہے نہ تم انہیں بدل سکتے ہو دوسری اچھی باتیں سوچا کرو۔ جو کچھ میں پوچھ رہا ہوں اسکا تعلق براہ راست میری اس ذہنی حالت سے ہے مجھے کچھ یاد آتا ہے مگر پھر غائب ہو جاتا ہے اور اچھی کوئی چیز اس ملک میں ہے ہی کہاں؟

اور Homo کون ہوتے ہیں؟ اسنے اصرار کے ساتھ کہا۔

یہ بدکاری کرنے والے ہیں مرد پرستی کو اسلام عیسائیت اور یہودیت سب نے قابل سزا حرکت قرار دی ہے یہ لوگ ہی بچوں کو ۔۔۔ بھی اپنا شکار بناتے ہیں ان پر عذاب آچکا ہے حضرت لوط کی پوری قوم کو شکست و نابود کیا گیا آج ایڈز اسی کا ثمر ہے کسی برطانوی فلسفہ اخلاق کے ماہر نے کہا ہے Humanitie's self inflicted wound

کیا بچوں سے قابل رحم کوئی نہیں؟ اس نے پھر سوال کیا

غور کرو اس ملک میں کون قابل رحم نہیں ہے؟ عورتیں بچے مزدور، مسجد کا ملا، مدرسے کے یتیم، معاشرے کا ہر مفلس۔ جسکو چاہو سر میں بم باندھنے کے لئے خریدا جا سکتا ہے انکی بھوک چند سکوں کی روٹی کے لئے سب کچھ کروالیتی ہے تم اسکے بارہ میں کیا کہو گے؟

آپ کہتی ہیں اللہ تعالی ضرور ظالم کو سزا دیتا ہے تو پھر ان لوگوں کو کیوں سزا نہیں دیتا جنھوں نے اودھم مچا رکھا ہے؟

بیٹا انسان اللہ تعالے کو ایک بہت بڑا لمبا چوڑا انسان تصور کرتا ہے جو غلط ہے میں اسوقت اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتی تم نے جو سوال کیا ہے اسکا جواب براہ راست اللہ تعالے نے خود دیا ہے "اللہ ایسا نہیں کہ کوئی چیز اسے ہرا دے نہ آسمان میں نہ زمین میں۔ وہ بڑے علم والا ہے اور بڑی قدرت والا ہے( سورہ روم ۴۴) اور ۔۔۔ اگر اللہ لوگوں کو انکی بد اعمالیوں کے سبب پکڑنے لگے (سزا دینے لگے) تو روئے زمین پر کوئی جاندار بچتا ہی نہیں۔ (کیونکہ سب نافرمان اور ظالم ہیں) لیکن اللہ تعالے نے ایک میعاد اور وقت مقرر کر رکھا ہے اسلئے مہلت دے رہا ہے (ممکن ہے لوگ مرنے سے پہلے توبہ کر لیں) لیکن جب وہ وقت مقررہ آ پہنچا تو اللہ تعالی ہر ایک سے سمجھ لیگا۔ سورہ فاطر ۱۴ آیت تمام اہل کتاب کا عموماً اور اسلام کا خصوصاً جس چیز پر ایمان ہے وہ یہ ہے "بحر و بر میں جو فساد (ظلم و ستم ہے) پھیلا ہے وہ لوگوں کی اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے ہے" ۔۔۔ اب تم جا کر سو جاؤ اور جو جواب اللہ تعالی نے دیا ہے اس پر غور ضرور کرنا کہ کیا تمہارا اطمینان ہوا یا نہیں بغیر دوسروں کے نظریات خود پہ مسلط کئے تم خود سوچو۔ اللہ تعالے سے مدد مانگو اسی سے کہ وہ تمہیں سمجھائے۔ اسکے علاوہ ۔۔۔ لاہور اور اسلام آباد جانے کے لئے بھی خود کو تیار کرنا۔ اچھا خالہ بی کہکر وہ سعادتمندی سے اوپر چلا گیا۔

رات کو میں نے دونوں میاں بیوی سے سارا ماجرا کہا۔

"تو معاملہ اتنا گمبھیر ہے"۔

صائمہ نے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا منظر کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ میرا اکلوتا لڑکا بچہ ہو رہا ہے۔ اسنے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لے کر بھرائی آواز میں کہا۔ یہی خیال اژدھا بنکر لرزا رہا تھا۔ بیدائی کا آنچل فضاؤں میں کہیں کھل دیگا۔ وہ پھر بین کرنے لگی۔ اپنے اندیشے اور خوف کو علاحدہ کر کے میں نے professionalism سے کام لیا اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ ممکن ہے اسکے سوالات صرف مشاہدے اور بلوغت شعور کا حصہ ہوں۔ ممکن ہے کسی اور نے یہ سوالات اس سے کئے ہوں ممکن ہے جب وہ ذہنی ہوا اس وقت کوئی ٹی وی پروگرام دیکھا ہو اور یہ سوالات اسکے ذہن میں چکرا گئے رہے ہوں اور اس معاشرہ میں ایسے سوالات کی اجازت نہیں اسے برا سمجھا جاتا ہے اسلئے وہ اندر اندر اس الجھن کو پال رہا ہو۔۔۔ اور ممکن ہے کہ اسکے سر کی چوٹ اور حادثے کا تعلق بھی ایسے ہی کسی واقعہ سے متعلق ہو۔ زندگی میں موڑ تو آتے ہیں یہ انکی الجھنوں کا ایک خطرناک موڑ ہے جہاں وہ ایک سوالیہ نشان بنے معاشرہ کے سامنے کھڑا ہے انصاف اسلام اور انسانیت تینوں سے وہ سوال کر رہا ہے اور یہ اسکا حق بھی ہے۔ انصاف کے ترازو میں بے انصافی، ظلم اور ظلم کو مسلط کرنے والوں کے ہاتھ میں ظلم کرتے رہنے کا اجازت نامہ دینے والا دیکھ رہا ہے آج کے مسلم معاشرہ میں اپنی شناخت، اپنی اقدار، اپنی انسانیت کا حوالہ تلاش کر رہا ہے اور ۔۔۔ قنوطیت، مایوسی، اور شکوک کی دھند سے حوصلے، اعتبار اور یقین کا سورج تلاش کر رہا ہے یہ اسی ابہامی فکر سے دوچار ہے جسے کبھی بابر ستاروں کو ڈھونڈتا لالا پھر اصل حقیقت کو پاکر آگ میں کود گیا تھا۔ انصاف آج کے "روشن پاکستانی معاشرہ میں کتنی نایاب شے ہے ہم جانتے ہی ہیں۔ بیمر سے کی کتاب کی سزا ہوگی منظر نے درد سے کہا۔۔۔ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں میں نے اسے پورا یقین دلایا"۔

ہم تینوں میں سے بتایا کوئی بھی سو نہیں سکا صبح خلاف معمول ہم سب نے بے حد خاموشی سے ناشتہ کیا اطہر نے بہت کم کھایا اور کسی سے نظریں ملائے بغیر کہا "مجھے معاف کیجئے گا میری طبیعت ٹھیک نہیں" وہ اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے سوچا میں تھوڑی بہت خریداری کر لوں لاہور اسلام آباد میں کچھ تقریبات میں جانا تھا۔ میں نادر کو لے کر حیدری اور طارق روڈ سے کچھ کپڑے وغیرہ خریدنے چلی گئی میں دکان کے باہر کھڑی ستارہ کی دکان دیکھ رہی تھی کہ ایک عورت بے حد لمبی میرے قریب آکر کھڑی ہو گئی وہ سفید ریشمی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھی زیور بھی تھے چوڑیاں بندے ہار۔ گہرا میک اپ اس نے قریب

آ کر آہستہ سے کہا۔۔ باجی اللہ کے نام پہ کچھ دے دو۔ میں نے کہا اتنے اچھے کپڑے پہنے ہو زیور پہنے ہو اور بھیک مانگ رہی ہو کام کیوں نہیں کرتیں۔ باجی مجھے کون کام دیگا پہلے ناچ گا کر گزارہ ہو جاتا تھا اب ٹی۔وی کی گھریلوں نے ہماری روزی چھین لی آپ بتائیں ہمیں کون کام دے گا؟ اسکی روتی ہوئی آواز سے میں چونکی میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بے پناہ رحم کا ایک جذبہ میرے دل میں سوچ کی صورت میں اٹھا میں نے قلم اٹھائی۔۔۔ تو کئی بچے قریب قریب نظر آئے میں نے پرس میں ہاتھ ڈالا جو اسکے نصیب کا تھا دیا اور کہا کہ اس میں سے چاروں بانٹ لینا۔ اسنے کہا جی۔۔۔ خالہ بی۔ اس طرح سے تو آپ کنگال ہو جائیں گی لیکن میں مطمئن نہیں تھی کاش اس مخلوق کے حقوق اور مستقبل کے لئے کچھ کیا جا سکتا۔

شاید میں طاہر کے قصے کی وجہ سے زیادہ جذباتی ہو رہی تھی۔ میرا دل شاپنگ سے بالکل اچاٹ ہو گیا، دنیا اور اسکے حقائق سے مجھے نفرت محسوس ہوئی، آخر ان کی فلاح بہبود اور حقوق کے لئے کیوں نہیں سوچا گیا؟۔ پھر وہ لڑکی میرے خیال میں آئی جسکے ساتھ گاؤں بھر نے اجتماعی زیادتی (آبرو ریزی کی تھی) اور پنچائیت کا فیصلہ تھا۔ جس قوم کے بزرگ ایسے بے غیرت ہوں کہ ایسے حرام اور ظلم کو قانون بناتے ہوں وہاں۔ حق نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہو سکتی پھر یہ کوئی واحد واقعہ تو نہیں ہر تیسرے دن ایسے واقعات ہوتے ہیں کسی کا ضمیر ملامت نہیں کرتا۔ یہ بیچارے تو مجبور انسان ہیں۔ یا ناقص انسان ہیں۔ پھر اس معاشرہ کا بیرونی دنیا کی طرح اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ ہم اللہ تعالےٰ کی پسندیدہ قوم ہیں سلئے جو چاہیں کریں بیچارہ طاہر اس سے کسی نے بھی پوچھا تھا۔ آج یہودیوں نے دنیا کو بازی کی طرح اپنے پنجے میں دبوچا ہوا ہے شکار کے زخم سے جو خون رس رہا ہے یہ خون ہمارا ہے اور ہمیں اجتماعی بدکاری کو قانون بنانے سے فرصت نہیں مجھے محسوس ہوا کہ مجھے بھی الٹی آ جائے گی۔ میں نے فوراً ٹیکسی پکڑی اور گھر آ گئی۔ اس دن مجھ سے کھانا نہیں کھایا گیا۔

رات کو میرے ذہن میں منظر کا دیا ہوا ایک جملہ بار بار آتا رہا یہ میرے کس گناہ کی سزا ہو گی۔ کیونکہ The sins of fathers arevisited by their sons مگر میں یقین کرنے کو تیار نہیں کیونکہ میرے دماغ میں ایک آیت بار بار آ رہی تھی۔۔۔ "جس نے بھلائی کی اسے اسکا دس گنا ملے گا۔ اور جس نے برائی کی اسے اتنا ہی ملے گا" (سورہ انعام آیہ نمبر ۱۶۰) صحیح بخاری کتاب الرقاق باب ۱۲، کے مطابق سو گنا تک مل سکتا ہے نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ منظر کا بیا نہیں۔ میں نے آسمان کی طرف ایسے دیکھا جیسے مجھے جواب ملیگا۔ یا اللہ تعالےٰ مجھے نظر آ جائے گا۔

رات کو کھانے پہ منظر نے بتایا کہ اسکی چھٹی بھی منظور ہو گئی ہے اور لاہور کے ٹکٹ بھی بک ہو گئے۔ طاہر کے چہرے پہ پریشانی کے سائے لہرائے۔ میرا خیال ہے تمہیں اچھا لگے گا ہم بہ نفارس بھی دیکھیں گے۔ اسنے پیار سے طاہر کے کاندھے پہ تھپتھپا کر کہا، پھر منظر نے طاہر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا like old times,remember? اسنے بیٹے سے کہا جو پریشان نظر آ رہا تھا۔

مجھے باپ بیٹے کا یہ بندھن اور محبت کا اظہار اسکے اعتماد کی بحالی کے لئے پسند آیا۔ دوسرے دن رات کے گیارہ بج کر پچپن منٹ پہ ہم سب لاہور کے لئے روانہ ہو گئے طاہر نے واقعی لمبا کوٹ پہنا مفلر لپیٹا اور گھر سے کولمبو نکلا اور ہم میں سے کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا سب اگرچہ پہلے پیارے اپنے دوستوں فکر کر لے گئے سامان وغیرہ کی ذمہ داری صائمہ نے لی۔ ڈاکٹر نے کوئی گولی بھی دے دی تھی کہ وہ سوتا رہے۔

ہم لاہور دو بجے پہنچے منظر نے بیٹے کو سنبھالا وہ نیند میں بے ہوش تھا پھر ہم باہر آ گئے جہاں صائمہ کے بھائی جان گاڑی لئے کھڑے تھے۔ رات کو طاہر اپنی نانی کے کمرے میں سویا۔ صبح ناشتے پہ خاصا پریشان نظر آ رہا تھا گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا کھانے کی میز سے بیٹھا ہوا اٹھ گیا کہ مجھے نیند آ رہی ہے میں نانی کے کمرہ میں جا رہا ہوں اور پھر لیٹتے ہی سو گیا۔ صبح ناشتے کے بعد صائمہ اور منظر باہر کسی کام سے چلے گئے طاہر دو بجے دن دوبارہ اٹھا ناشتہ لایا گیا جو اس نے بددلی سے کیا۔ اس کا موڈ خاصا خوش ہو رہا تھا نانی آ کر بڑے چاؤ سے بیٹھیں پیار کیا بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ ایک ٹک باہر دیکھتا رہا میں نے پوچھا ٹی۔وی لگا دوں۔ جواب ملا نہیں۔ میں نے پوچھا کیوں؟ جلے ہوئے لہجے میں کہنے لگا "خالہ بی مجھے نفرت ہو گئی ٹی۔وی سے۔ پتہ ہے کیوں؟" میں نے کہا نہیں۔ کہنے لگا ٹی۔وی دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے کہ پاکستان میں یا وہ سیاستدان رہتے ہیں جو بیکار ترین مخلوق ہیں اور جاہلانہ بحث کرتے ہیں نئی نسل کو دینے کے لئے انکے پاس سچ ہوتی کے کچھ ہیں نہ خود کبھی کوئی مفید کام کیا نہ نئی نسل کو آگے بڑھنے دیا کہ وہ خود کوئی تجربہ کریں ٹی وی سکرین کی وہ جان چھوڑتے ہیں تو باورچی اور باورچنیں قبضہ کر لیتی ہیں، دونوں میں مجھ بڑی مشابہت ہے یا باورچی یا وہ خواتین جو چند اشیاء سے مختلف چیزیں تیار کر لیتی ہیں یا ملغوبہ تیار کر لیتی ہیں چاہے ملک کے نوے فیصد کو سوکھی روٹی میسر نہ ہو یہ باورچی یا وہ خواتین مرغی اور انڈے اور روسٹ سے نیچے بات نہیں کریں گے۔ سیاستدان عوام کی جہالت سے اقتدار کا ملغوبہ تیار کرتے ہیں۔ بگی بگی سکرین پہ داڑھی والے ملا اس انداز میں موجود مختلف عقیدوں کے ملغوبوں کی کتابوں سے فتوے کا مربہ تیار کرتے ہیں اور ایک ہی عقیدے پہ ہوتے ہوئے بھی متضاد فتوے دیتے ہیں وہ یہ دعا نہیں بتاتے بھولتے کہ عورتوں کو مارنا ضروری ہے ورنہ اسلام خطرے میں ہو جائے گا اور حضرت عائشہ۔۔۔ خیر چھوڑئے۔۔۔ یہ ہماری اسلامی قابلیت کا لب لباب ہے آج کے انسانوں کو جن مسائل کا سامنا ہے وہ جن سوالات کی اذیت سے دوچار ہیں۔

وہ جہد بقا کے لئے کیسے ضمیر فروشی پہ مجبور ہیں ان کے لئے انہوں نے کبھی سنجیدہ فلسفیانہ فکر کا ثبوت نہیں دیا؟ یا تو یہ لوگ خود عقل سے پیدل ہیں یا پوری قوم کو گدھا سمجھتے ہیں۔ اور میں ان گدھوں میں نہیں ہوں شکریہ۔ وہ

غصے میں پھر واپس جاکر کمرے میں بند ہوگیا۔ اور میں اسکی غیر معمولی اور ذہانت بھر پور گفتگو سے چکرا گئی۔

شام کو میں نے اسکے کمرہ میں جاکر ادھر ادھر کی بات کرکے کہا .. بیٹا میں جلدی اسلام آباد چلی جاؤں گی کل چلو دراصل میں بھی لاہور گھوم لوں اور تم بھی باہر نکل کر دیکھو کیسا محسوس ہوتا ہے؟۔ کہنے لگا اچھا سوچیں گا وہ آرام کرتی میں تم دراز چھت کو تکتا رہا انتہائی بیزاری کے ساتھ۔ تھکا پریشان اور ترش لہجہ انداز گفتگو۔ دوسرے دن کافی ساز وسامان کے ساتھ ہم سب شالیمار باغ چلے گئے۔ اس نے بات چیت تو نہیں کی البتہ خاموشی سے لوگوں کو دیکھتا رہا میرے ماتر اور منظر کے پاس رہا اپنے ہم عمر خالہ زاد ماموں زاد کے ساتھ نہ بیٹھا، نہ کوئی بات چیت کی۔ جیسے بیا کے دو دوا جان ہیں۔ جیتا رہا گھر پہنچے پر ایک اور حادثہ ہوگیا بوٹ میں سے سامان نکالتے ہوئے منظر نے اطہر سے بھی مدد کے لئے کہا وہ سامان گردن اندر کرکے سمیٹ رہا تھا کہ بوٹ کا ڈھکنا اسکے سر پر گرا وہ ایک دم چکرایا ماتر کے بھائی نے اسے سنبھالا سامان اسکے ہاتھ سے چھوٹ کر گر اور بکھر گیا اسے لے جاکر کمرہ میں لٹا دیا گیا ماتر کی امی نے ہم سب کی خبر لی بڑی مشکل سے انہیں ہم قائل کرسکے کہ اس سے کام اسلئے کہا گیا تھا کہ اسے زندگی اور اسکے معاملات سے دلچسپی ہو۔ وہ نیم بیہوش سا تھا بہت اصرار اور بحث سے منظر نے اسکو ایک مگ دودھ پلا دیا۔ دوسرے دن پھر دو بجے تک سوتا رہا میرا دل سہے پہنچا۔ انسانی دماغ کا بھروسہ نہیں۔ کالج میں کیا ہوا ہے؟ چھوٹی سی رگ بھی پھٹ جائے تو انسانی دماغ یادوں کو ایسے مٹا جاتا ہے جیسے delete کا بٹن دب گیا ہو۔ اور اسکو تو پہلے ہی مسئلہ تھا۔

ہم لوگ دوپہر کے کھانے کے لئے کرسیاں سنبھال رہے تھے تو دیکھا وہ نہا کر باہر آیا تو لمبے سے بال ٹپکا رہا تھا جب ماتر کی امی نے آواز دی بیٹا اچھو ناشتہ کرو گے یا کھانا۔ انہیں اچھو کہنے کی عادت تھی اور ایک دن قبل وہ اچھو کہنے پہ جلا گیا تھا میں دل میں ڈری۔ اسنے آرام سے کہا اگر سب لوگ کھانا کھا رہے ہیں تو کھانا چلے گا۔ پھر کمرہ میں آکر اطہر سے پہلی بار براہ راست مخاطب ہوا۔ امی کہاں ہیں؟ انہوں نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگا مجھے بال کٹوانا ہے۔ پھر جتنا ہیں الگ رہا ہوں۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ اس سے قبل اپنی دراز زلفوں کے خلاف کچھ نہیں سن سکتا تھا۔ بہرحال۔ اطہر نے کہا چلو مجھے بھی بال کٹوانے ہیں ساتھ ہی چلتے ہیں منظر نے میرے اور ماتر کی طرف دیکھا ہم نے اثبات میں سر ہلایا۔ کھانے کے بعد دونوں بال کٹوانے چلے گئے۔ ہم سب اس نئی صورتحال سے گھبرائے دل میں دعائیں مانگتے رہے۔ جو دو برس سے ترش لہجہ دنیا بیزار بیٹھا اور اچانک عادات بدل رہا ہے۔ ماتر نے فوراً کراچی اطہر کے ڈاکٹر کو فون کیا کہ کہیں نازک صورتحال دوسری انتہا تو نہیں۔ ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ خاموشی سے مشاہدہ کرکے بتائیں۔ شام کو میں سو کر اٹھی تو اسے اسی کمرہ میں بیٹھا پایا۔ بال کٹا کر وہ بہتر لگ رہا تھا۔ خالہ بی مجھے یہ کچھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں اسکی الجھن پریشانی اور خیالات کے تسلسل میں وقت کیوں محسوس کر رہا ہوں؟ تیز تیز یہ دماغ میں آتے آتے بھاگ جاتی ہیں مجھے یہ یاد آرہا ہے کہ میری کلاس میں ایک لڑکا تھا دبلا پتلا اور گورا چٹا۔ وہ بھی میرے کالج میں کسی دوسرے اسکول سے میٹرک کرکے آیا تھا شاید وظیفہ بھی لیا تھا مگر اسکو چند لڑکے ہر وقت تنگ کرتے تھے کبھی کان نوچتے کبھی دھکا دیتے وہ ان سے ایسا خوفزدہ رہتا تھا جیسے باز سے کبوتر ڈرتا ہے بیچارہ چھپتا پھرتا مجھے ایک دن غصہ آگیا۔ میں نے جھاڑ کر ایک دن کہا تم ہیڈ ماسٹر سے شکایت کیوں نہیں کرتے۔ وہ مجھے خاموشی سے دیکھتا رہا اسکی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اسنے معصومیت سے آنسو پونچھے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا'' تم نہیں سمجھ سکتے''۔ اسکا نام تابا الفت خان تھا۔ شروع میں وہ خوش رہتا تھا ہر ایک سے ملتا تھا ہنستا بولتا تھا پڑھنے میں تیز۔۔۔ پھر ڈرا ڈرا نظر آنے لگا۔ میری اس ذہنی کیفیت سے اسکا تعلق ضرور ہے کل خواب میں مجھے الفت خان کے علاوہ تین چہرے اور نظر آئے اور میں چیخ کر اٹھ بیٹھا۔ پھر فلیش کی صورت میں کچھ مناظر آتے رہے جس نے مجھے پریشان کردیا ہے سوچتے رہو مگر زیادہ دماغ پہ زور نہ دو۔ اور کچھ اور سنجیدہ باتیں سوچو تم کالج جانا کیوں چھوڑ دیا؟ جس کالج کے نام سے مجھے خوف محسوس ہوتا ہے لیکن یہاں آکر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں کالج جاسکتا ہوں۔ میں ماموں کے کالج میں داخلہ لے لوں گا۔ اور امی نے مجھے بتایا کہ میں کس حال میں آیا اس سے زیادہ وہ بھی نہیں جانتیں علاوہ اسکے کہ کسی لڑکے کا جنازہ فون آیا۔ اور امی نے کہدیا کہ اسکی یادداشت کھو گئی ہے بزنس ٹرپ آیا تو امی نے مجھے دکھایا اور میں نے اسے دیکھا تک نہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہورہا ہے کہ میں گزشتہ دو سال سے سو رہا تھا۔ اور مجھے واقعی یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم کراچی سے یہاں کیسے آئے اور کب؟۔ کل ہم کہیں باہر گئے تھے۔ البتہ میرے سر میں درد بہت ہو رہا ہے اسی لئے میں نے بال کٹوائے ہیں کہ شاید۔۔۔ لمبے بالوں کی وجہ سے ایسا ہو۔

آج کھانا کھا کر جلدی سو جانا شاید آرام اور ذہنی سکون سے کچھ مدد ملے پروگرام کے مطابق ہمیں کل شام یا پرسوں صبح اسلام آباد واپس جانا ہے اگرچہ اسکا انحصار زیادہ تمہاری طبیعت پہ ہے۔ دوسرے دن اتوار تھا کچھ سردی بھی زیادہ ہوگئی ہم دیر تک بستروں میں گھسے رہے۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ لاہور میں اتنی سردی ہوگی۔ ناشتے کے وقت اطہر خاموش اور اداس نظر آیا اور بس چائے کا کپ لیکر چلا گیا۔ مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ۔۔۔ وہ بہتر نظر آرہا تھا میں نے اسکے پاس جاکر پوچھا کیا بات ہے؟ کہنے لگا مجھے کچھ واقعات یاد آرہے ہیں کچھ بے ربط سے۔ شاید کہ ایک دن الفت خان کی ناک سے خون بہہ رہا تھا اس ظلم کے خلاف میں اور ناصر الدین ثنائی ہیڈ ماسٹر کے آفس میں کھڑے تھے اور غصہ ہو رہے تھے اور ہیڈ ماسٹر صاحب فرما رہے تھے شکار کرنے والے پرندوں کی چونچیں شکار کے لہو سے سرخ رہتی ہیں۔ انکا کام شکار کرنا ہے تم انکے خلاف کوئی قانون نہیں بنا سکتے۔ یہ فطرت کا قانون ہے اور شکاری پرندوں کی ہر وقت خون میں تر چونچوں کی وجہ سے شکار بننے والے

پرندے ختم نہیں ہو گئے ہیں۔ یہ جو تم شیخی کی مزاحیہ مناجات پھر بھی شکار
بچنے والے پرند سے زندہ ہیں وہ اپنا دفاع خود کر لیتے ہیں" تو آپکا رول کیا ہوا؟
میں نے پوچھا "مجھے رول سمجھانے والوں کو میں black list کر دیتا
ہوں۔ لیکن میں ان تینوں سے دشمنی نہیں لے سکتا۔ گزشتہ سال ایک ٹیچر کا قتل
اسی گروپ نے کیا تھا اور میں انکا ضرور ساتھوں گا انکا باپ ہے ۔۔۔ خیر چھوڑو
میرا تم سے مشورہ ہے کہ ان سے دور رہو اس گروپ سے کہ پیچھے اپنا مستقبل خراب نہ
کرو اپنی ذہانت اور علم کی وجہ سے داخلہ ملا ہے کیا یہاں میں انکی جگہ لڑنے
کے لئے تیار نہیں ہوں نہ تم ایسی کوئی کوشش کرو۔ ہم اپنا سا منہ لیکر واپس
آ گئے۔ ہمیں انکی زبان سے لفظ ہیجڑا کسی کے لئے استعمال کرنا بہت بازاری
لگا۔ یہ کسی ہیجڑے خاندان کا ہم نے آپس میں کہہ کر غصہ اتار لیا۔
یہ تینوں لڑکے پرویز راجپوت، سی پی۔ سہگل، وراٹھل، ورما۔ تینوں کے
باپ ۔۔۔ لکھ پتی تھے، کیسے کیسے بن گئے یہ پوچھنے کا کسی کو حق نہیں تھا سہگل کو
سارے لوگ جانے کیوں بوس کہتے تھے۔ ایک دن میں اور عثمانی اوپر کلاس روم
میں کچھ امتحان کے بارہ میں باتیں کر رہے تھے کہ ہم نے دیکھا سی۔ پی۔ سہگل
الفت کی پٹائی کر رہا ہے اور دوسرے دونوں دوست خوب زور زور سے ہنس رہے
تھے ہم نہ چاہتے ہوئے بھی دوڑ کر باہر آ گئے اور لڑکوں سے کہا کہ چھوڑو ورنہ قتل
ہو جائے گا۔ ہمیں واقعی اس بیچارے ادھیڑ عمر کے الفت خان کی زندگی کا خطرہ
پیدا ہو گیا تھا ہم بھول گئے کہ شکار کرنے والے پرندوں کی چونچ خون سے تر ہی
رہتی ہے سارا اسکول اسی طرف بھاگا۔ اسکول کے پچھواڑے والے میدان کی
طرف ہم میں سے ایک لمبے چوڑے لڑکے نے کہا اس مریل لڑکے سے کیا
مقابلہ کر رہے ہو؟ کسی برابر والے کو اس نے فوراً جیب سے چاقو نکال لیا
اور بھیانک تیور سے کہا تم برابر کے ہو تم کرو گے مقابلہ؟ اور یہ جو بیچ تم نے
ہمارے خلاف اکٹھے کیا ہے اسکا خیازہ ۔۔۔ عثمانی نے کہا تم تو ۔۔۔ لڑائی ۔۔۔ وہ
گر جا پھر ۔۔۔ گالی ۔ کہ یہ لڑائی تو نہیں یہ تو مزاحیہ کھیل ہو رہا تھا ہم سے ساتھ کچھ اور
بھی سنجیدہ لڑکے آگے بڑھے۔ اور بہت نرم لہجے میں کہا "یار چلو معاف کرو غلطی
اور غلط فہمی ہو گئی۔ آئندہ ہم احتیاط کریں گے۔ الفت زمین میں سکڑا سہا بیٹھا
تھا۔ میں نے انکی طرف دیکھا مجھے لگا انکی نظریں کہہ رہی ہیں "میں نے نہ کہا تھا
میں مجبور ہوں"۔

اسکے بعد رفتہ رفتہ انکے رویہ میں کچھ تبدیلی آئی۔ وہ تینوں ہم پر
مہربان ہو گئے۔ الفت خان کی اب کھچائی بھی کم ہوتی۔ اور وہ ہمارے ساتھ بھی
کبھی کبھی مل بیٹھتا۔ انکی ایک حرکت سے مجھے اور چند دوسرے دوستوں کو بہت
کوفت ہوتی کہ وہ ہر ایک کی خوشامد کرنا کسی کا اسکول کا کام کر رہا ہے کسی کو سینڈ
وچ دے رہا ہے اس پر ساتھی لڑکے لڑکا تو وہ مستقل اسکول کا کام کرتا اور کان نیچا تا
ہم سب نے سمجھایا۔ کیوں ایسی خوشامد کرتے ہو مگر وہ ہمارے مشورے پر کوئی توجہ
نہیں دیتا جبکہ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ پہلے وہ اس سے ڈر کر خرچہ دینے کو کہتے تھے اور
اب مفت دے رہے ہیں۔ اور بھی عجیب عجیب مطالبے کرتے ہیں۔ یعنی ۔۔۔

اسکا چہرہ سرخ ہو گیا۔

وہ سمجھتا تھا کہ اس کا کیس ہم سے مختلف ہے اسلئے اسکا دوستیاں اور
خیر سگالی کا طریقہ بھی دوسرا ہے مگر ہم اپنی طرف سے اسے سمجھاتے رہے۔ ہم
امتحان کی تیاری اگر اسکول میں کر رہے ہوتے تو وہ تینوں بھی آ جاتے۔ پہلا تھوڑا
ہمارا بھی فائدہ ہو جائے گا۔ یہ تینوں ملا کا عرصہ بس اس طرح گزرا کہ ہر ایک
سمجھے لگا ہمارے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ عثمانی ہر بار کہتا۔ شکاری پرندہ کی
چونچ اگر لہو رنگ نہ ہو تو یہ نہیں سمجھنا کہ وہ بھگت ہو گیا ہے یا Vegitarien
تم۔ بہ accentric ہو۔ مجھے تھوڑی حیرت بھی ہوتی۔ ان تینوں شکاری پرندوں
نے کئی بار ہمیں سامنے والے ریسٹورنٹ میں مدعو کیا لیکن ہم ٹال گئے کہ امتحان
کے بعد دیکھیں گے یہ اتفاق تھا کہ انکا امتحان ہم سے پہلے ختم ہو گیا ہم سب
مطمئن ہو گئے کہ اب وہ ہو نہیں کریں گے ہم اپنے گروپ کے ساتھ امتحانی پرچے
پر بات چیت کر رہے تھے کہ وہ تینوں آ گئے ایک منٹ ۔۔۔ "ہم نے کسی ہوٹل میں
کینگ کروائی ہے کل شام کو کئی دوست آ رہے ہیں تم دونوں نے ہماری اتنی مدد
کی ہے تم بھی ضرور آنا "ہم تمہیں بھی مزہ کروائیں گے۔ ہاں تم دونوں اپنے فون
نمبر بھی دے دینا تفصیل بعد میں طے کر لیں گے۔ عثمانی نے گھر کا فون دے دیا میں
نے اپنا موبائل دیا۔ یہ ساری بات چیت پرویز راجپوت اور وراٹھل ورما نے کی
سی۔ پی۔ سہگل دور سگریٹ پھونکتا رہا۔ شام کو باری باری تینوں کا پھر فون
آیا۔ مستقل اصرار کرتے رہے کہ بہت سے دوست ہوں گے۔ اور یہ ہوگا وہ
ہوگا۔ اسنے یہ بھی کہا "تمہیں ہم خود آ کر لے لیں گے" کاش کاش ۔۔۔ میں نے
فوراً منع کر دیا ہوتا بلکہ ۔۔۔ وہ خاموش ہو گیا تو مجھے گھبراہٹ محسوس ہوئی مگر گھڑی
کی ٹک ٹک اور دل کی دھڑکن ساتھ ساتھ چلتی رہی ۔۔۔ صبح صبح انکا باری باری فون
آیا ۔۔۔ پھر الفت کا فون آیا ۔۔۔ "طہر تم آ رہے ہو پارٹی میں؟"
میں نے تو ابھی سوچا بھی نہیں ۔۔۔ "پلیز تم ضرور آنا ۔۔۔ اسنے تقریباً
گڑگڑا کر کہا مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے کہیں جاتے۔ میرا کوئی بھائی نہیں کوئی مستقل
دوست نہیں۔ جانے کیا بات ہے؟ میں نے پھر اس سے کہا تم۔ لوگوں کے پیچھے
بھاگنا چھوڑ دو۔ ہاں ضرور مجھ میں ہی خرابی ہوگی لیکن میرا کوئی ایسا مخلص دوست
نہیں تھا اور میرے لا بیٹھ مجھ سے بات کرتے کتراتے نہ جانے کیوں؟ میں
محبت کا بھوکا ہوں۔ جہاں ذرا سی گرمی نظر آئی پگھل کر راستے میں بچھ جاتا
ہوں۔ ایک دادی تھیں جب وہ محبت سے مجھے گلے لگاتی تھیں روتی تھیں جب میں نے بھی
نہیں پوچھی۔ بس میری بھی خوب دعا خیر کچھ بچے۔ خالہ بی انکی دو بیٹیاں دیکھی تھیں
میں نے میرا دل بھی پگھل گیا۔ وہ کہتا تھا اسے یاد نہیں کبھی انکی ماں نے پیار کیا
ہو۔

پھر ۔۔۔ عثمانی کو میں نے فون کیا۔ اسنے پہلے تو صاف انکار
کر دیا۔ پھر میں نے الفت کی روداد سنائی وہ بھی پگھلنے لگا ۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے
ابھی تو پورا دن پڑا ہے۔ وہ تم رضا لگ رہا تھا۔
گرمیوں کے دن تھے سب لوگ کھانے کے بعد سو جاتے ہیں میں

بھی بس الگ رہا تھا، کیونکہ اتنا فون مجھے سونے نہیں دے رہا تھا جیسے انہیں ہم سے کتنی محبت ہے اور انکی زندگی ہمارے بنا سونی ہے یا ہماری دوستی انکے لئے بہت بڑا اعزاز ہے میں ان سے کوئی چیز نہیں چھپاتا اور اس دن بھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔

''لگتا ہے لاشعوری طور پر تم چاہتے تھے کہ انہیں نہ معلوم ہو'' میں نے تبصرہ کیا۔ لگتا ہے بہر حال میں سو کر اٹھا تیار ہوا تو ابھی اور رات بھی ہو رہے تھے میں باہر نکلا شام ہو گئی تھی پیلی دھوپ اور نیچے درختوں پہ سرخی مائل تھی اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی میں چونک پڑا راحیل کہہ رہا تھا کہ تم بڑی سڑک پہ بینک کے سامنے کھڑے ہو جانا میں تمہیں لے لوں گا۔ میں نے پوچھا اور کون کون ہے اس نے کہا سب ہی دوست۔۔۔ تم ہی سب سے دور ہو بس صرف تمہارے لئے ادھر آنا پڑ رہا ہے۔ میں بڑی سڑک کی طرف چل پڑا۔۔۔ ایک نمبر و کھڑی تھی پرویز گاڑی چلا رہا تھا۔ راحیل ساتھ بیٹھا تھا بوبی اپنی موٹر سائیکل پہ تھا اس نے پوچھا کسی کے پاس موبائل فون ہے؟ میں نے کہا کیا تمہارے پاس نہیں؟ اس نے کہا ہاں ہے لیکن گھر والے مجھے ڈھونڈ رہے ہیں وہاں پہنچ کر وائرلیس دے دوں گا میں نے فون اسے دے دیا اس نے عثمانی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

تمہیں پتہ ہے یار کہ میں غریب والدین کا بیٹا ہوں۔۔۔ بوبی نے کہا ہمارے ساتھ دوستی نبھاؤ تو ہم تمہیں بہتر ین فون خرید کر دیں گے۔

اب سورج غروب ہو چکا تھا شام کی سیاہی تیزی سے پھیل گئی تھی اور ہماری منزل کا پتہ نہ تھا۔ یکا یک گاڑی ایک سنسان جگہ پہ رک گئی۔ پھر کچے راستے پہ چلتے گئی گاڑی سمندر کے قریب ریت پہ کھڑی ہو گئی بوبی نے کہا ''لو تو ہماری منزل آ گئی'' وہ تینوں اتر گئے عثمانی نے مجھ سے کہا۔ مروا دیا تم نے اب خدا کے لئے ہوشیار رہنا۔ وہاں روشنیاں نہیں تھیں۔ ہم حیران و پریشان کھڑے تھے۔ انہوں نے ایک چھوٹا سا قالین زمین پہ بچھایا پھر بوتلیں اور گلاس نکالے پھر بوبی نے میرے کندھے پہ ہاتھ مار کر کہا یار آج ہم تمہیں مرد بنا دیں گے یہ دیکھو کتنی اچھی شراب ہے۔ عثمانی نے کہا ہم نے تو کبھی نہیں پی۔ تو اب پی لو اسنے جواب دیا۔ یہ تو اب زندگی کا جزو۔۔۔ ہوگا۔ میرے طبقے میں نہیں۔ تم خود کو بہت اہم سمجھے ہو آج تو تمہیں پینا ہی ہوگا۔ عثمانی نے کہا۔

سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔۔۔

زیادہ بکو اس کی تو ہم تمہاری پارسائی کا بھرکس نکال دیں گے۔ یہ اسکول نہیں کہ تم اپنا قبیلہ جمع کر لو۔ تم اگر نہیں پیو گے تو ہم چاقو کی نوک پہ تمہیں پلانا جانتے ہیں۔ راحیل آگے بڑھ کر کہنے لگا بوبی سو دامت خراب کرو انہیں سیٹ ہونے دو۔ بوبی نے الفت کی طرف اشارہ کر کے کہا اسکو دیکھو۔ یہ پیسے تو ہمارے پیچھے پھر رہا تھا اس کو sex چاہئے تھا۔ مگر اس سے پوچھا اسکو ہم نے کتنی عیاشی کروائی سب کچھ پنج ستارہ ہوٹل میں اب دیکھنا لڑکی اور شراب کے لئے یہ ہمارے جوتے چاٹے گا۔ اور تم بھی۔

اس دوران وہ دونوں چسکیاں لے رہے تھے اور میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ اور اس لمحے کو۔ ہم تمہیں ناک تک شراب پلا کر یہاں چھوڑ جائیں گے۔ اور اگر ہمارے ساتھ مل جاؤ گے تو ہمارے پاس پیسوں کی کمی نہیں ہمیں تمہارے جیسے اخلاقیات کے لٹے پوٹوں سے نفرت ہے ہمیں مزے کرو بڑھاپے میں جو غم کرنا بیٹھ جانا۔ سب یہی کرتے ہیں۔ اور آگے ہیڈ ماسٹر کو درست کرنا۔ عثمانی نے گلاس اٹھایا مجھے بھی اشارہ کیا پھر کھڑا ہو گیا پھر گلاس زمین پہ پٹخ کر بھاگا۔ میں بھی شاید اسکے پیچھے بھاگا۔ پھر پرویز اور راحیل اسکو پکڑنے دوڑے۔ بوبی وہیں بیٹھا رہا۔ وہ دونوں طاقتور بھی اسکو بمشکل پکڑ پائے۔ بوبی کے ہاتھ میں بڑا سا چاقو تھا اور اسکے تیور خطرناک تھے۔ اب وہ عثمانی کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ گاڑی سے رسی لاؤ سالے کی باندھ کر دھنائی کریں۔۔۔ اسکا جملہ ختم ہونے سے پہلے عثمانی اسکے اوپر جھپٹا سر سے اسکی ناک پہ مارا اور پھر چاقو چھین کر دور سمندر میں پھینک دیا ان تینوں نے اسکے اوپر گھونسوں کی بارش شروع کر دی میں بھی ان سے گتھ گیا کسی نے ایک زبردست لات مجھے ماری اور میں زمین پر گرا میرا ایک پتھر پہ پڑا اس نے پتھر اٹھا کر میرے سر پہ دے مارا میرا ہاتھ پھسل گیا اسی وقت شاید عثمانی بھی گر گیا۔ اس وقت وہ دونوں کو گالیاں دے رہا تھا پھر میں اندھیرے میں ڈوب گیا۔ یہ کہانی آخر کار ختم ہو گیا آ گئی۔ مگر خالہ بی میں کیسے اپنے گھر پہنچا انھوں نے اور اسکول والوں نے پوچھا کیوں نہیں کیا اور جانے عثمانی بچا کہ نہیں اور الفت کا کیا بنا؟ اور جو کچھ وہ بک رہے تھے اس کا کیا مطلب تھا؟ جانے یہ کہانی کیسے سلجھے گی؟

چھوڑو ان باتوں کو اسکا کہ مطلب کوئی نہیں بس دھیان سے لکھ کر پڑھنے کی کوشش کرو اور مجھے فون کرتے رہنا میں بھی پوچھتی رہوں گی۔ ٹھیک؟ جی۔ اسنے گرم جوشی سے جواب دیا۔ اور اس شام میں اسلام آباد چلی گئی اور پھر واپس لندن آ گئی۔۔۔ آج تین برس ہو گئے اسنے مجھے گزشتہ ایک سال سے فون نہیں کیا حالانکہ ضرور کرتی رہتی چونکہ طاہر پڑھائی میں مصروف تھا اسلئے مجھے بھی فکر نہیں تھی مگر جب طاہر کبھی کبھی بہت خاموش ہو جاتا اور کئی کئی دن ایسے ہی رہتا۔

جانے مجھے کیوں فون کر رہا ہے؟ میں ٹیلیفون ہی کے پاس بیٹھی انتظار کرتی رہی۔۔۔ خدا خیر کرے فون کی گھنٹی بجی تو میں چونک گئی۔ میں نے فون اٹھایا اس دفعہ آواز صاف تھی وہ دوسری طرف طاہر ہی تھا خالہ بی میں نے گریجویشن کر لی اور ایم اے میں داخلہ بھی مل گیا آپکا شکریہ اور۔۔۔ خالہ بی میری یادداشت نے تو مجھے دھوکہ نہیں دی تھی میں نے آپکے مشورے پہ عمل کرتے ہوئے اس کہانی کو وہیں چھوڑ دیا تھا مگر میرا احساس جرم مجھے اس کے دکھ کا تھا اب میری پریشانی ختم ہو گئی۔ میری ملاقات یونیورسٹی میں عثمانی سے ہوئی۔ میرے سر کا جو مستقل درد تھا اسکی صورت دیکھ کر ختم ہو گیا۔ اسنے جب اس واقعہ کی تفصیل بتائی تو محسوس ہوا کہ میں شکاری پرندوں کی یلغار چونچوں کے حملوں کے جان لیوا خوف سے آزاد ہو گیا میرا اللہ کیا خون بہا بند ہو گیا۔ عثمانی نے بتایا کہ وہ جب مار کھا کر گر گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ختم۔ مگر چند لمحوں میں مجھے ہوش آیا وہ تینوں کچھ دیر تک کہہ رہے تھے کہ ہم مر گئے۔ شاید نشے کی وجہ سے انہیں پتہ نہیں چلا کہ ہم زندہ ہیں۔ وہ کچھ دیر گالی گلوچ کرتے رہے پھر بوبی نے موٹر سائیکل اٹھائی اور جانے لگا ان

باقی صفحہ نمبر 30 پر

# مکڑیاں اور چوہے

شمشاد احمد
(کراچی)

اچانک دماغ کی نچلی سطح پر ایک ٹیڑھی ٹانگوں والی بدصورت مکڑی اُبھری' پھڑپھڑائی اور غائب ہوگئی۔ ہوا اپنے پیچھے ایک بدمزہ' مکروہ سرسراہٹ چھوڑ گئی۔

میں نے قہقہہ لگایا۔

"بھلا کیسے ہوسکتا ہے ـــــ ناممکن ـــــ"

بدمزہ سرسراہٹ ہلکی پڑ گئی اور پھر ختم ہوگئی۔

میں نے اپنی فتح پر ایک اور قہقہہ لگانے کا سوچا لیکن ایک تیز طرار چوہا بڑے اعتماد سے پھدکتا ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچا۔ وہاں دم ہلا کر مڑ کر مجھ پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پھینکی اور چلتی بنی۔

میری رگ رگ میں ایک انتہائی بدبودار جھلاہٹ دوڑنے لگی۔

قہقہہ اندر ہی کہیں کسمسا کر مرجھا گیا تھا۔

پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ مکڑیوں اور چوہوں کا آنا جانا لگ گیا۔ آہستہ آہستہ انہوں نے میرے اندر مستقل ڈیرے ڈال دیے۔

میں ایک ڈراؤنے خواب میں جینے لگا۔

"میں ـ میں درندوں کی طرح اپنے جیسے انسانوں کو چیروں پھاڑوں گا۔ خوبصورت جسموں کے چیتھڑے اڑاؤں گا۔ رحم ـــــ یا اللہ رحم ـــــ"

میں نے عمر کے کسی حصے میں کبھی ایک لمحے کے لیے بھی کسی کی جان لینے کا نہیں سوچا۔ ساری عمر لکھنے پڑھنے میں اور خوبصورت خواب دیکھنے میں گزری ہے۔ اور اب اس آخری عمر میں یہ عذاب!

"ہوش کرو۔ تمہارے ہاتھوں میں خطرناک ہتھیار۔ ہر طرف خون اور لاشیں۔ پہلے کیا کم ہیں؟"

دم بھر کو جنون سست پڑتا ہے لیکن اگلے ہی لمحے مزید گھن گرج کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے اور مجھے بے بس کر ڈالتا ہے۔

میں اپنے سلگتے بدن پر ٹھنڈے چھینٹے مارتا ہوں۔

"کسی سے دشمنی ہو۔ کسی نے نقصان پہنچایا ہو' حق تلفی کی ہو۔ چلو آدمی اس کی جان لے لے۔ انتقام کی آگ ٹھنڈی کرے۔ لیکن بلاوجہ بغیر جان پہچان کے کسی کا قتل۔ انسانیت کا قتل ـــــ"

میں پاگل ہوگیا ہوں۔ پاگل ہو چکا ہوں۔ میرے اندر کسی شکاری کا بھوت گھس گیا ہے۔ مجھے فوری طور پر کسی ماہر نفسیات سے رجوع کرنا چاہیے۔ لیکن ـــــ لیکن اگر وہ ماہر نفسیات بھی میرے والے مرض میں مبتلا ہوا تو ـــــ

اپنی زندگی بھر کی ساتھی ہوتی تو اسے اپنا حال سناتا۔ شاید اس گندے بخار میں کچھ کمی آ جاتی۔

یہ سب میرے بوڑھے اعصاب کی جھنجھلاہٹ تو نہیں؟ لیکن نوجوان بچے تک۔ کیا ہر کوئی وقت سے پہلے بوڑھا ہوگیا ہے۔

میں اس وحشی جذبے کے سامنے بڑے بڑے پتھروں کے بند باندھتا رہتا ہوں۔ لیکن پتھر ریت ہوجاتے ہیں اور سرخ آندھی انہیں اڑا لے جاتی ہے۔

ایک طویل عرصے سے گلیوں' بازاروں میں' عبادت گاہوں میں ـــــ ہر طرف خون اور لاشیں ـــــ گھر دروں سے روٹی کی خوشبو کی بجائے آہوں اور سسکیوں کا کڑوا دھواں اٹھ رہا ہے۔

بے حسی کہیں اندر سے اندر چاٹتی رہی۔ کہیں احساس تک نہ ہوا۔ پھر اچانک کوکھ پھٹی تو اس میں سے ہزاروں لاکھوں مکڑیاں اور چوہے بلبلاتے ہوئے نکلے اور ہر سو پھیل گئے۔

میں سوچنے پر مجبور کیوں ہوں؟ میرے خدا مجھے پتھر کردے۔

خدا میری مدد کو نہ آیا۔ شیطان نے مجھے سینے سے لگا لیا۔

میں سب سے بڑا اور سب سے تباہ کن ہتھیار خریدنا چاہتا تھا تاکہ لوگوں میں کشتوں کے پشتے لگ جائیں۔ میری مکڑیاں اور چوہے مطمئن ہوجائیں۔ میرا گندا بخار اتر جائے۔

ہتھیار کہاں ملتے ہیں؟ کیسے خریدے جاتے ہیں؟

اب یہ بھی تو نہیں کہ راہ چلتوں سے پوچھا جائے۔ کسی غلط شخص سے مڈبھیڑ ہوگئی تو ایک نیا عذاب ٹوٹ پڑے گا۔ ہمیشہ کے لیے کسی گمنام عقوبت خانے میں زندہ موت ـــــ

"چاقو۔ لمبے پھل والا تیز دھار چاقو۔ آسانی سے مل جائے گا۔"

"چاقو سے کتنے آدمی مارو گے؟ دو چار۔ وہ بھی مریں یا نہ مریں۔"

میں سر سے پاؤں تک شرم سے تر بتر ہوگیا۔

پستول مناسب رہے گا۔ پستول کہاں ملے گا؟

چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے انگلیاں مروڑ مروڑ کر غور کرتا رہا۔ کوئی راہ سجھائی نہ دے رہی تھی۔ مایوس ہوکر طوعاً و کرہاً چھری پر اکتفا کرنے کا طے کرنا پڑا۔

گھر سے تھوڑے فاصلے پر بستی کے بازار میں ایک دکان تھی۔

وہاں سے لوگ بالک عید قربان پر چھریاں خریدتے اور تیز کرواتے تھے۔ میں وہاں پہنچ گیا۔

دکاندار ایک چمکتی ہوئی چھری انگوٹھے کے ناخن پر پھیر پھیر کر اس کی دھار جانچ رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس نے چھری ایک طرف رکھ دی۔

''آیئے آیئے۔ کچھ تیز کروانا ہے یا۔۔۔''

لکڑی کی لمبی بینچ پر چھوٹی بڑی چھریاں، چاقو ترتیب سے سجے تھے۔

دکاندار اپنی بھوری آنکھیں سکیڑ کر میرا جائزہ لے رہا تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے اندر اتر گیا ہے اور سب کچھ جان گیا ہے۔

وہ میرے کان پر جھک گیا۔

''یہاں ہر چیز ملتی ہے بغیر کسی قلت کے، اپنی ضرورت بتایئے۔''

میں نے چھری جیسے گھٹیا ہتھیار کا خیال ترک کر دیا۔ لیکن دوکاندار کو اپنا فیصلہ سنانے کی ہمت نہ پڑ رہی تھی۔

دکاندار نے ایک ننھا قہقہہ لگایا۔

''خودکش حملے کا جیکٹ، مکمل تیار۔۔۔ اسٹیل کی گولیوں اور کیلوں سے لدا۔۔۔''

میں جھٹکے سے پیچھے ہٹا اور گرتے گرتے بچا۔

دکاندار نے مجھے لپک کر سنبھال لیا۔

اُس نے میری بزدلی کا اندازہ کر لیا تھا۔ اس نے جھٹ سے بولا۔

''آپ فی الحال چھری ہی لے لیں۔''

اُس نے جھل مل کرتی چھریوں کی طرف انگلی اُٹھائی۔

''پسند کر لیں۔''

میرے پاؤں زمین میں گڑے دیکھ کر وہ آگے بڑھا اور ایک فٹ بھر لمبی چھری اُٹھا کر میری آنکھوں کے سامنے لہرائی۔

''منٹوں میں کشتے کے پشتے لگا دے گی۔''

میرے تذبذب نے اُسے پریشان کر دیا تھا۔ وہ شاید میرے جیسے بزدل گاہکوں کا عادی نہ تھا۔

اُس نے ایک اچھے دکاندار کی طرح چھپا گُر آزمایا۔

''خودکش جیکٹ آپ کے لیے بڑا ہے، چھری آپ کی خواہش سے چھوٹی ہے، ایک درمیانی چیز میرے پاس ہے، آپ کو یقیناً پسند آئے گی۔''

وہ اپنی تاریک سرنگ دکان میں غائب ہو گیا۔

جب وہ برآمد ہوا تو اسکے ہاتھ میں ایک پستول تھا۔

اس نے پستول کو اپنی شلوار پر رگڑا اور میری طرف بڑھا دیا۔

میرے جسم کا دھاگہ دھاگہ تھرتھرا رہا تھا۔

میں نے پستول پکڑنے سے پہلے چلتے بازار کا جائزہ لیا۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ معمول کا لین دین جاری تھا۔ گاڑیاں ہارن بجاتی ہجوم کو ڈرا دھمکا کر راستہ بنا رہی تھیں۔ گوشت کی دکانوں کے سامنے چیلیں غوطے لگا رہی تھیں۔

میں خواہ مخواہ پریشان تھا۔ ہر کوئی اپنے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کسی کے پاس مجھے دیکھنے جاننے کا وقت نہ تھا۔

دکاندار نے مجھے مطمئن دیکھ کر قہقہہ لگایا اور میرے کندھے پر بڑی نرمی سے تھپکی دی۔

''ہم سب ایک ہیں، کوئی غیر نہیں ہے۔''

میں بھاؤ تاؤ کیا کرتا۔ اس نے جو مانگا دے دیا۔

میں چلا تو اس نے سرگوشی کی۔

''آتے جاتے رہیے گا، دکان آپ کی ہے۔''

میں خاص طور پر لمبا کرتا پہن کر آیا تھا۔ میں نے پستول نیفے میں اُڑس لیا۔

پستول ٹھنڈا تھا۔ میرے گرم جسم نے احتجاج کیا۔ میں نے اُسے کھینچ کر کرتے اور بنیان کے بیچ میں رکھا اور دبا لیا۔

میرا فوری طور پر کارروائی کا ارادہ نہ تھا۔ موقع محل دیکھنا، جانچنا ضروری تھا۔

اچانک پستول بنیان اور کرتے کے بیچ اچھلنے لگا۔ پستول زندہ تھا!

سورج ڈھل کر بلند و بالا عمارتوں کے پیچھے چلا گیا تھا۔ بازار میں چلتے پھرتے آتے جاتے انسان زرد مردہ روشنی میں سایہ ہو کر رہ گئے تھے۔

اگر گلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہو کر ایک میگزین خالی کر دیا جائے تو ایک تسلی بخش تعداد میں مرنے اور زخمی ہونے کے روشن امکانات تھے۔

کھمبے کے دائیں طرف گندی گلی تھی۔ تنگ، گندی گلیاں اچھی پناہ گاہیں ثابت ہوتی ہیں۔ ادھر سے بچ کر نکل جانا آسان ہوگا۔

میرا ہاتھ نیفے کے نیچے پہنچا۔ پستول دہک رہا تھا۔

میں کھمبے کے پیچھے ہو گیا اور پستول نکال کر تان لیا۔

میرے بالکل سامنے عین سڑک کے بیچ ایک چھ سات سال کی بچی اپنی سرخ زبان باہر لہرا کر آئس کون چاٹ رہی تھی۔ اسکے بالوں میں الجھا سرخ رنگ کا ربن گرم ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔

بچی بہت پیاری تھی۔ میں نے اسکا نشانہ لیا۔

عین اس وقت اسکی ماں سبزی کا تھیلا لئے اس کی طرف لپکی۔

میں اندر ہی اندر تلملا اُٹھا۔

باقی: صفحہ نمبر 86 پر

# جشنِ زندگی

فیروز عالم (یو ایس اے)

موسم بہار کی ڈھلتی شام کا وقت تھا۔
میرے سامنے شمال کی جانب کیلی فورنیا کے بلند و بالا پہاڑ تھے جن کی چوٹیاں اب بھی برف سے ڈھکی تھیں اور ان پر ڈوبتے سورج کی کرنوں نے سنہرا اجالا سا بکھیر دیا تھا۔ ایک بل کھاتی سڑک سے موڑ کاٹتے ہوئے میں نے اس کے گھر کے سامنے اپنی ٹویوٹا ایسپورٹس کار پارک کی۔ یہ ایک چھوٹا سا ہسپانوی طرز کا کاٹیج تھا جس کا محراب دار برآمدہ بوگن ولا کی کاسنی پھولوں سی لدی بیل سے ڈھکا تھا۔ صدر دروازے تک چند سیڑھیاں تھیں جو سرخ اینٹوں کے بنے پہلو دار فرش سے مزین تھی۔

میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے ایسا پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ میں اپنے مریضوں سے صرف پیشہ ورانہ تعلق رکھتا ہوں اگرچہ میں بہت ہی قریبی اور انتہائی ہمدردانہ احساسات بھی رکھتا ہوں مگر میں نے کبھی ان سے کسی قسم کے سوشل تعلقات نہیں رکھے تھے۔ مجھے ایسے دعوت نامے پہلے بھی کئی دفعہ ملے تھے مگر "کسوئیلہ" نے کچھ اس انداز سے اصرار کیا تھا کہ میں مجبور ہو گیا تھا۔ میں کوشش کے باوجود اس کی یہ خواہش کہ میں ایک شام اس کے ساتھ چائے میں شریک ہوں رد نہ کر سکا تھا اور میں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا۔ آج جب کہ میں خوش قسمتی سے اپنی جاب سے فارغ تھا میں نے سوچا کہ یہ وعدہ پورا کر ہی دوں۔

اس کی ہدایت کے مطابق میں ایک چھوٹی سی روش سے ہوتا ہوا بغلی دروازے سے اس کے پائیں باغ میں داخل ہوا۔ وہ سر سبز لان کے آخر میں ایک کونے میں بے گزیبو میں بیٹھی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ اٹھی اور میرا استقبال کیا۔ اس کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ بکھر گئی اور اس نے اپنے کمزور اور کسی قدر سرد ہاتھ میں میرا ہاتھ تھام کر کہا بڑی خوشی ہے کہ تم آ گئے۔ میں نے کہا مسز سانچیز تم نے اصرار ہی اتنا کیا تھا کہ میں انکار نہیں کر سکا۔ اس نے اپنے خاص انداز سے انگلی ہلا کر کہا "نو نو، صرف کسوئیلہ۔ میرا نام کسوئیلہ ہے" اس کے قریب ہی کھڑی خادمہ نے اس سے ہسپانوی میں کچھ کہا شاید اس نے چائے لگانے کی اجازت چاہی تھی۔ ہم دونوں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میرے سامنے نیلے ٹائیلوں سے سجا سوئمنگ پول تھا جس کے ایک کونے سے پانی آبشار کی طرح گر رہا تھا۔ شام کی روشنی تیزی سے سرمگیں اندھیرے میں بدل رہی تھی اور روشوں کے کنارے لگی مالیبو (MALIBU) لائٹس جل گئی تھیں۔

کسوئیلہ سانچیز کو میں نے پہلی دفعہ کوئی چار ماہ پہلے اپنے کلینک میں دیکھا تھا۔ وہ بانوے سال کی ایک بظاہر تو مند اور ہوش مند ہسپانوی نژاد خاتون تھی۔ اسے میرے پاس اس لئے بھیجا گیا تھا کہ اس کے جنرل ڈاکٹر کو اس بات کا شبہ تھا کہ اس کے گردے صحیح کام نہیں کر رہے۔ میری یہ ذمہ داری تھی کہ میں مکمل طور پر اس کے ٹیسٹ اور سائنیز کر کے اس بات کا تعین کروں کہ آیا یہ شبہ صحیح ہے اور اگر صحیح ہے تو اس کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی نواسی جو کہ تقریباً بیس بائیس سال کی تھی کے ساتھ آئی تھی۔ اس کی نواسی کو اس پورے معاملے سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ پورے انٹرویو کے دوران مستقل چیونگ گم چباتی رہی اور بار بار اپنے ہونٹوں پر چیونگ گم کے غبارے بنا کر پھوڑتی رہی۔ آخر کار میں نے کچھ سکون اور توجہ کے لئے کسوئیلہ سے اجازت لے کر اس سے کہا کہ وہ ویٹنگ روم میں بیٹھے۔ اس پر اس نے اپنا بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور گردن کو ایک جھٹکا دے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ میرے پوچھنے پر کسوئیلہ نے بتایا کہ اسے تو کوئی تکلیف نہیں مگر اس کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں اس کی طرف سے بہت تشویش میں مبتلا ہیں اس لئے وہ ان کی ضد پوری کرنے آئی ہے۔ میں نے اس کا معائنہ کیا۔ وہ حیرت انگیز حد تک اچھی صحت میں تھی۔ پھر بھی میں نے اس کے تمام متعلقہ ٹیسٹ آرڈر کر دئے۔ وہ بے حد خوش مزاج، مثبت سوچ رکھنے والی اور پیاری فطرت کی عورت تھی۔ میری گفتگو کے دوران وہ کسی نہ کسی طرح مزاح کا پہلو نکال لیتی تھی۔ اگرچہ وہ کیلی فورنیا ہی میں پیدا ہوئی تھی مگر اس کے لہجے میں ہسپانوی انداز نمایاں تھا اور وہ "ٹ" کو ادا نہیں کر سکتی تھی اس لئے اس کا انداز گفتگو مجھے بڑا دلنواز لگا۔

دو ہفتے بعد وہ پھر مجھے دکھانے آئی۔ ٹیسٹوں کے رزلٹ آ چکے تھے۔ کوئی خاص تشویش کی بات نہیں تھی۔ سب ہی نیا دہ تر ٹیسٹ حیرت انگیز طور پر اچھے اور نارمل تھے۔ گردے کا فعل بھی کوئی معیاری نہیں تھا۔ اس کے گردے تقریباً بیس فیصد کام کر رہے تھے۔ اس درجے خرابی سے زندگی کو فوری کوئی خطرہ نہیں ہوتا، بس غذا اور دواؤں میں احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ گردے کا کام رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے اور اس بات کا قوی امکان ہوتا ہے کہ چند سالوں میں گردے مکمل طور پر کام کرنا چھوڑ دیں گے اور زندہ رہنے کے لئے اسے ڈائیلیسس کا سہارا لینا پڑے گا۔ مگر ایک تو یہ کہ وہ پہلے ہی بانوے سال کی تھی اور ابھی اس کے گردے کئی سال کام کر سکتے تھے دوسرے اگر ڈائیلیسس کرانی ہی پڑی تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا کیوں کہ آج کل امریکہ میں یہ طریقہ علاج اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ ڈائیلیسس پر بیس تیس سال تک زندہ رہا جا سکتا ہے۔ اس لئے میں اس سلسلے میں بالکل فکرمند نہ تھا۔ وہ بھی مسکرا مسکرا کر یہی کہتی رہی کہ مجھے کوئی فکر نہیں ہے اور یہ کہ مجھے ڈاکٹروں کے پاس آنا بالکل اچھا نہیں لگتا۔ اس پر میں نے ہنس کر کہا کہ مسز سانچیز اب تو تمہیں میرے پاس ہر چھ مہینے بعد آنا ہی پڑے گا۔ اس نے اپنی انگلی گھما کر کہا "کسوئیلہ۔ میرا نام کسوئیلہ ہے۔ سانچیز تو میرے شوہر کا نام تھا وہ تو مجھے پندرہ سال پہلے دغا دے گیا" میں نے پوچھا "کیسی دغا؟؟" کہنے لگی "ہم نے ایک ساتھ ہاتھ میں ہاتھ دے کر مرنے کی قسم کھائی تھی مگر وہ پہلے ہی کھسک گیا۔ دھوکے باز۔ خیر میں بھی وہاں جا کر اس کی خوب خبر لوں گی۔" میرے پاس کھڑی نرس نے پیار سے کہا "لیکن ہم تمہیں اتنی جلدی وہاں نہیں

جانے دیجئے" کسوئیلہ نے مسکرا کر کہا "ڈاکٹر یوں تو مجھے ڈیٹنگ کیے ستر سال ہو گئے ہیں مگر ایسا لگتا ہے تم نے مجھے پھانس لیا ہے اور میں تمہارے جال سے نہیں نکل سکوں گی۔" "تو پھر اس ڈیٹ کو یادگار رکھنا" میں نے مسکرا کر کہا اور اسے چھوڑتے ہوئے رخصت کیا۔

میری کلینک میں پہلے سے اپائنٹمنٹ لینے کے باوجود بہت بھیڑ ہوتی تھی اور مریضوں کو ایک گھنٹے انتظار کرنا ہوتا تھا۔ امریکہ کے ماحول میں یہ ممکن نہ تھا کہ وہ جیسے ہی آئے میں اسکو پہلے سے بیٹھے مریضوں سے پہلے دیکھ لوں مگر جب میں نے محسوس کیا کہ اتنے لمبے انتظار سے وہ تھک جاتی ہے اور اسکے چہرے کی شگفتگی ماند پڑ جاتی ہے تو میں نے اپنی سکریٹری سے کہا کہ اسے کلینک شروع ہونے سے بھی پہلے کا ٹائم دو اور میں اسکی خاطر کلینک پندرہ منٹ پہلے شروع کر کے سب سے پہلے اسے دیکھ لیا کروں گا۔ اب وہ اپنی بڑی بیٹی کے ساتھ آتی تھی جو اسکا بہت خیال رکھتی تھی۔ میں اس سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ ایک دن میں نے اسکے ہاتھوں کا معائنہ کرتے ہوئے اس سے کہا کہ تمہارے ہاتھ بہت کھردرے ہیں اور ان پر جگہ جگہ گٹھے پڑنے کے علاوہ کچھ تازہ خراشیں بھی ہیں کیا کرتی ہو؟؟ اس نے اپنی انگلیوں کو دیکھا اور کہنے لگی "ڈاکٹر میرے ماں باپ میکسیکو کے مزدور پیشہ لوگ تھے جو اچھے مستقبل کی تلاش میں امریکہ آ گئے تھے۔ میرا باپ مٹی اور گارے کا کام کرتا تھا اور میری ماں ایک فیکٹری میں سلائی کرتی تھی۔ میں سب سے بڑی تھی اور گھر کا خرچہ پورا کرنے مجھے بھی کھیتوں میں کام کرنا پڑتا تھا۔ پھر شادی کے بعد بھی روپے کی قلت رہی اور کام کرنا پڑا پھر ان دو ہاتھوں نے دو بیٹے اور تین بیٹیاں پالی ہیں تو یہ اسکے تحفے ہیں۔ یہ کوئی بڑی قیمت تو نہیں۔ اور اب، اب میرا ایک ہی شوق ہے میں اپنے پائیں باغ میں گلاب اگاتی ہوں۔ طرح طرح کے گلاب، رنگ برنگ۔ بس یہی میری خوشی ہے جب میرے لگائے ہوئے پودوں میں پھول کھلتے ہیں تو مجھے ایسی خوشی ہوتی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ مجھے لگتا ہے کہ میں تخلیق کے عمل میں سب سے بڑے تخلیق کار کی شریک کار ہو گئی ہوں۔ میں ان پودوں کی دیکھ بھال کرتی ہوں، باسی پھولوں اور زرد پتوں کو بھی بڑے پیار سے تراش کر علیحدہ کرتی ہوں یہ خراشیں اسی کا نتیجہ ہیں۔" اس کے بعد جب بھی وہ آتی میرے لئے اپنے گلابوں سے کچھ پھول توڑ لاتی اور بڑے چاؤ سے مجھے انکے بارے میں بتاتی۔ اب تو ایسا لگنے لگا تھا کہ ڈاکٹری سے زیادہ اسکا وزٹ صرف سوشل اور دوستانہ گفتگو کے لئے مخصوص ہو گیا تھا۔ پھر اسکی صحت بھی ابھی تک بہت اچھی تھی اور اسکے ٹیسٹ اپنی جگہ پر مستحکم اور قائم تھے۔ جب ایک وزٹ پر وہ نہیں آئی تو مجھے تشویش ہوئی مگر دوسرے ہی ہفتے وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ لئے میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے کہا "کسوئیلہ تم پچھلے ہفتے نہیں آئیں میں نے تمہارا انتظار کیا" شرارت بھرے لہجے میں کہنے لگی "اوہو، تو تم اب میرا انتظار کرتے ہو!! ڈاکٹر ایسا لگتا ہے تم مجھ سے محبت میں مبتلا ہوتے جا رہے ہو۔ ایسا ہرگز نہ کرنا، تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں تمہیں بہت ہی جلد چھوڑ جاؤں گی" "نہیں کسوئیلہ ایسا نہ کہو ابھی تک تو تمہارے سارے ٹیسٹ بہت اچھے ہیں"۔ میں نے اسکا معائنہ کیا اس سے پوچھا کہ پچھلے ہفتے کیوں نہیں آئی تھیں اور کیسا محسوس کر رہی ہو۔ کہنے لگی کچھ تھکن ہو جاتی ہے۔ معائنے میں مجھے لگا کہ اسکے چہرے اور ہتھیلیوں کی سرخی میں کچھ کمی ہے۔ میں نے جانچ کے لئے اسکا خون لیا اور دو ہفتے بعد اسے واپس آنے کے لئے کہا۔ اسکی بیٹی پریشان تھی مگر میں نے اسے تسلی دی۔

اس دفعہ اسکے خون کے ٹیسٹ کے نتائج خراب آئے تھے۔ نتائج سے ظاہر ہوا کہ اس میں خون کی شدید کمی ہے اور اب گردے کا فعل بھی بہت تیزی سے کم ہوا ہے۔ ڈاکٹری اصولوں کے تقاضے تھے کہ اب میں اسے نہ صرف خون دوں، کچھ نئے ٹیکے شروع کروں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ڈائلیسس کی تیاری کے لئے اس کے بازو پر ایک معمولی سا آپریشن بھی کروں۔ میں نے اسے یہ سب کچھ بتا دیا۔ وہ کہنے لگی ڈاکٹر تم وہ کرنا جو تمہارا پیشہ تم سے کہتا ہے اور میں وہ کروں گی جو میرا دل مجھ سے کہے گا۔ میں نے کہا کہ تمہارا دل کیا کہتا ہے۔ اس نے جیسے میرا سوال سنا ہی نہیں۔ مجھے گلاب کے تازہ اور بہت شگفتہ پھول دے کر کہنے لگی "تم نے میرا باغیچہ تو دکھا ہی نہیں تم میرے ساتھ ایک شام چائے پیو، میرے سینچے ہوئے پھول دیکھو پھر ہم اس موضوع پر بات کریں گے تو آج شام میں کسوئیلہ کی ضد پر اس سے ملنے، اسکے پھولوں کو سراہنے اور اسکے مستقبل پر بات کرنے اس کے پاس آیا تھا۔

سفید رنگ کے جالیوں دار گزیبو کے نیچے بیٹھ کر میں نے "ٹوبلی" اور چائے سے لطف اٹھایا۔ اس کے بعد کسوئیلہ نے مجھے اپنے گلاب کے پودے دکھائے۔ وہ ایک ننھی سی بچی کے جوش و خروش سے مجھے اپنے پھولوں کی تفصیل بتا رہی تھی مگر مجھے احساس ہو رہا تھا کہ بار بار اسکا سانس پھول جاتا ہے اور وہ بار بار رک کر اپنا سانس بحال کرتی ہے۔ کہنے لگی تھکن ہو جاتی ہے۔ میں نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا ڈائلیسس شروع ہو جائیگی تو سب ٹھیک ہو جائیگا۔ مسکرائی۔ پھر کہنے لگی "میں نے اور پیٹروں نے فیصلہ کیا تھا ہم زندہ رہنے کے لئے مصنوعی چیزوں کا سہارا نہیں لینگے۔" میں نے کہا یہ مصنوعی سہارا نہیں، یہ تو مروجہ طریقہ علاج ہے "ہاں یہ سچ ہے مجھے غلط نہ سمجھو۔ زندگی بہت پیاری چیز ہے اور میں نے ہمیشہ اس بات کی قدر کی ہے کہ خدا نے مجھے اچھی اور صحت مند زندگی دی، ایک طویل زندگی۔ مگر ہر اچھی چیز کا اختتام ہوتا ہے۔ "nothing lasts for ever" مگر کسوئیلہ تم ابھی بہت اچھی حالت میں ہو۔ ڈائلیسس تمہیں ابھی کئی سال مزید دے سکتی ہے۔" وہ کہنے لگی "کتنے سال، دو تین یا پانچ، مگر یہ بھی تو دیکھو میرا طرز زندگی بدل جائیگا، تباہ ہو جائیگا۔ میری زندگی مشین سے بندھ جائیگی۔ میں زندہ رہوں گی مگر لاچار ہو کر میں اپنے پھولوں کی دیکھ بھال نہیں کر سکوں گی۔ وہ میرے سامنے مرجھا جائینگے۔ زندہ تو ہوں گی مگر زندگی کا لطف، اسکی مسرت اور اسکی روح میرا ساتھ چھوڑ

جانگی۔ڈاکٹر میں نے ایک بہت دلکش زندگی گذاری ہے۔ابھی اسکی دلکشی باقی ہے میں اسکے آخری منظر کو بھی دلکش رکھنا چاہتی ہوں۔میں زندگی کے قدرتی انجام کو مسکراتے ہوئے اور خوش دلی سے قبول کرنا چاہتی ہوں۔موت تو زندگی ہی کا ایک حصہ ہے۔زندگی نے مجھے کیا نہیں دیا۔میں نے چاندنی راتوں میں بحرکاہل کے ساحل پر پیاروں کیساتھ ننگے پاؤں گھنٹوں چہل قدمی کی ہے اور اپنے پیروں تلے دو بھیگی ریت کی ٹھنڈک محسوس کی ہے۔موسم سرما میں پہاڑی جھیل کے کنارے بنے کاٹیج کی کھڑکی سے ٹنڈ منڈ درختوں پر برف کے گالے گرتے دیکھے ہیں اور ریگستانوں میں کھلے آسمان کے نیچے کیمپنگ کی ہے۔میں نے اپنے بچوں کو ڈگمگاتے پیروں سے پہلا قدم اٹھاتے ہوئے دیکھا ہے اور انکی توتلی زبان سے ماں ماں کہتے ہوئے سنا ہے۔یہ سب قدرت کی نوازشیں تھیں۔کیا میں اب قدرت کو اس بات کا تاثر دوں گی کہ میں زندگی کے معاملے میں لالچی ہو گئی ہوں۔کیا میرا دل اس دنیا سے کبھی بھی نہیں بھریگا۔میں اپنے آپ سے، اپنی زندگی سے نہ صرف بہت خوش اور مطمئن ہوں بلکہ میں اس سے بالکل سیر ہو چکی ہوں۔اب میرا بلاوہ ہے تو میں اس پر لبیک کہتی ہوں۔میں چاہتی ہوں میرا سوگ نہیں میری زندگی کا جشن منایا جائے۔پھول کے مرجھا جانے کے بعد بھی کچھ دیر اسکی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے۔سورج ڈوبنے کے بعد بھی افق پر ایک تابناکی سی باقی رہتی ہے۔میں بھی چاہتی ہوں میرے بعد میرے بچے میری پرمسرت زندگی کی گرمی اور حدت محسوس کریں اس لئے کہ میں مر رہی نہیں بلکہ یوں سمجھو ایک لمبے سفر کے بعد سمندر کے اس پار ایک دوسرے ساحل پر اتر جاؤں گی"۔میں اسے ڈایالیسس کے لئے کسی طور قائل نہیں کر سکا۔ایک عجیب بوجھل سا دل لئے گھر آیا۔رات کو عجیب بے چینی رہی۔ذہن میں کئی سوال اٹھ رہے تھے۔اسکا پیارا مسکراتا چہرہ بار بار نگاہوں کے سامنے آتا تھا۔کیا یہ خودکشی نہیں؟؟ یہ خوبصورت چہرہ یہ روشن سیاہ آنکھیں چند دنوں میں خاک میں مل جائینگی۔پھر میرا دل یہ پوچھتا تھا کہ کیا کسی انسان کو اس بات کا اختیار نہیں کہ وہ اپنے آخری سفر کو اپنے اصولوں کے تحت طے کرے۔اسکا یہ کہنا صحیح تھا کہ ڈایالیسس کے ظالم اوقات سے اسکی زندگی درہم برہم ہو جاتی۔وہ ایک صبر آزما دور سے گزرے گی اور زندگی صرف سانس کی آمدورفت کی حد تک جاری رہیگی اور ایک طرح یہ زندگی کو طول دینا نہیں بلکہ موت کے مرحلے کو طول دینا ہوگا۔وہ اپنے فیصلے سے قطعی طور پر مطمئن ہے اسے فیصلہ کرنے کا حق ہے اور مجھے اسکا طبیب ہونے کے ناطے اسکا مکمل ساتھ دینا چاہئے۔پھر اسکے بچوں کے ساتھ کی ملاقاتوں میں یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ اسکا کنبہ بھی اس فیصلے میں اسکے ساتھ تھا۔وہ اس بات پر تیار تھی کہ ڈایالیسس کے علاوہ جو بھی علاج کیا جا سکتا ہے وہ ضرور کروں۔میں صرف یہ کرتا رہا کہ وقت ضرورت اسے خون چڑھا دیتا، اسکی غذا اور تقویت کو بحال رکھتا اور چھوٹے موٹے مسئلوں میں اسکو وقتی طور پر سہارا دیتا رہا۔اب وہ اسقدر کمزور ہو گئی تھی کہ وہ میری کلنک نہیں آتی تھی میں ہی اسکے گھر چلا جاتا تھا جب اس سے ملنے جاتا وہ اپنے پھولوں کے پاس بچھی ہوئی کرسی پر ہوتی اور اپنی خادمہ سے بڑی توجہ سے پودوں کی تراش خراش کروارہی ہوتی۔ہمیشہ میرا استقبال بہت گرمجوشی اور دلفریب مسکراہٹ سے کرتی اور کسی نہ کسی طور پر مجھے جتلانے کی کوشش ضرور کرتی۔وہ کہتی "زندگی ایک کارنیوال ہے اور اسے ہنستے کھیلتے گزارنا چاہئے میں اس سے مسرت کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لونگی" اس کے لواحقین اس کے سامنے ایک بارونق میلہ سا لگائے رکھتے اسکے پوتا پوتی اور نواسا نواسی اس کے لئے غبارے اور نہ جانے کیا کیا لا لاتے اور اسکے پاس ہی ٹینس کھیل رہے ہوتے۔اسکے بیٹے سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھ کر گٹار بجاتے۔کبھی کبھی وہ اس کے قریب ایک پرانا ریکارڈ پلیئر رکھ دیتے اور اس کی جوانی کے زمانے کے ہسپانوی ریکارڈ بجا کر اسکا دل خوش کرتے۔موسیقی کی تان پر کبھی وہ خود بھی اٹھ کر ناچ شروع کر دیتی مگر پھر جلدی تھک کر بیٹھ جاتی۔ایسے میں اس کے چہرے پر ایک بھرپور طمانیت کا نور ہوتا۔وہ آخر تک پرسکون رہی اور نرسوں کی اس ٹیم نے جو امریکہ میں ایسے مریضوں پر مقرر کی جاتی ہے اس بات کو یقینی بنا دیا تھا کہ وہ بہت آرام سے رہے اور کسی تکلیف سے نہ گذرے۔موسم سرما کی ایک دھند آلود صبح ہاسپس نرس نے مجھے کال کر کے بتایا کہ وہ رات نیند میں اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئی۔نرس کی ہدایت پر میں نے اسکی موت کے تصدیق نامے پر دستخط کر دئے۔

جب میں اسکی آخری رسومات میں گیا تو چرچ کے بڑے ہال میں اسکا تابوت کے چاروں طرف اس قدر پھول تھے کہ سارا اسٹیج اس سے بھر گیا تھا۔دونوں طرف بارہ بارہ موٹی شمعیں روشن تھیں اور ہال ایک بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔چرچ کی اونچی کھڑکی سے جس میں رنگین شیشے لگے تھے سورج کی ایک شعاع نے عین اس کے تابوت پر منعکس ہو کر اسے جیسے نور کے حلقے میں لے لیا تھا۔لوگ اپنے بہترین لباس پہن کر اسے خراج تحسین پیش کرنے آئے تھے۔میں اسکے لئے گلاب کے اسی پودے کی نو شگفتہ کلی جو اس نے مجھے دیا تھا لیکر آیا تھا۔میں نے اپنی باری آنے پر اسکے تابوت پر زرد رنگ کی یہ کلی رکھ دی۔اسی لمحے گانا کی لے پر ایک دلنشیں آواز نے ایک گیت چھیڑا جس کا مطلب کچھ یوں تھا

جب میں دعاجات کے اختتام پر پہنچوں  
تو میرے دوست مجھے مسکرا کر رخصت کرنا  
یہ وہ سفر ہے جو ہمیں سب ہی کو اختیار کرنا ہے۔۔اور تنہا ہی اختیار کرنا ہے  
میری روح کا پنچھی آج آزاد ہو کر بیکراں فضاؤں میں پرواز کریگا  
پھر غم کیسا۔۔مجھے یاد کرنا مگر بس کچھ ہی دیر

چرچ کا پادری اپنے خطبے میں کہہ رہا تھا "ہم آج کنسوئیلہ سانچیز کا سوگ منانے نہیں بلکہ اسکی بھرپور زندگی کا جشن منانے آئے ہیں آئیے آپ اس جشن میں میرا ساتھ دیں۔یہ سن کر میں نے بھی اپنا سر جھکا دیا مگر نہ جانے کیوں میری آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے میرے گالوں پر ڈھلک آئے۔

# دوسری سوچ

آنند لہر (جموں کشمیر)

لوگوں کے گھروں میں کام کرتے کرتے اُس کا بدن تقسیم ہو گیا تھا کسی گھر میں اگر ہاتھ اچھے طریقے سے کام کرتے تو دوسرے گھروں میں پاؤں۔ کسی گھر میں پورا جسم بھی کرتا تھا۔ سامنے والی پڑوسن کے برتن گھر دور تھے اور سخت بھی اور لوگ کہتے بھی ان میں تھے سب کی صفائی لازمی تھی۔ اس لئے یہاں اُسکے ہاتھ پیارے تھے اور پھر دوسرے گھر میں بہت کرتے تھے سب کی صفائی لازمی تھی اس لئے یہاں اُس کے پاؤں پیارے تھے اور تیسرے گھر میں رہنے والی بیوی مر چکی تھی اور بچے چاہتے تھے کہ ان کا باپ دوسری شادی نہ کرے اسلئے یہاں اُسکا جسم پیارا تھا۔ وہ بٹ گئی تھی اور اُسکے بچے بٹ گئے تھے۔ دال اگر ایک گھر کی کھاتے تو چاول دوسرے گھر کے اور سبزی تیسرے گھر کی۔ غریب انسان کا بدن بٹا ہوا رہتا ہے مگر اُسکی روح ہمیشہ قائم و دائم ہوتی ہے کیونکہ وہ ہمیشہ محبت کی تلاش میں ہوتی ہے پھر کیا اُنکی بھی تو تقسیم ہو کر رہ گئی تھی۔

کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ پانی کا گھر والا ایک مزدور تھا۔ اُن کا ایک چھوٹا سا گھر تھا اور گھر کے اندر ایک چھوٹا سا آنگن۔ اُس آنگن میں نہ جانے کیوں بہت سبزی پیدا ہوتی تھی وہ سبزی ہی اُن کا گزارا تھا۔ بس ایک بیج اور سینکڑوں پھل اور جوائے یہ روز کی مزدوری کا روپیہ ملتا اُس سے اُن کے گھر کا گزارا چلتا تھا۔ وہ اُسی سے اپنے ماں باپ کی سیوا کرتا تھا۔ اس طریقے سے وقت بیت رہا تھا۔ وہ بچے تھے نہ کوئی شکوہ نہ کوئی شکایت۔

ایک دن وہ بازار جا رہا تھا کہ ایک جلوس حکومت کے خلاف تھا یا یوں کہا جائے کہ سخت خلاف تھا اور مہنگائی کے خلاف نعرے لگا رہا تھا۔ وہ ایک دیوار کے ساتھ کھڑا تھا چپ چاپ، لوگ نعرے لگا رہے تھے حالانکہ یہ جلوس مہنگائی کرنے والوں نے ہی نکلوایا تھا جلوس نکلوانے والے کچھ لوگ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ دیہاڑی داروں کو مستقل کرو۔ ان میں سے کوئی دیہاڑی دار نہ تھا وہ غریب نہ تھے پھر ایک شخص نے زور سے کہا رشوت کی سنگل کرو کو ان میں کوئی رشوتی نہ تھا غریب تو روٹی روزی کمانے میں مصروف تھے اور نعرے لگانے کے لیے اکٹھے کیے گئے وہ لاٹھی اور گولی کھانے کو کسی بھی صورت میں تیار نہ تھے اور جلوس کی خبر تب تک نہیں آتی جب تک اس پر گولی نہ چلے لاٹھی نہ چلے جلوس لوگوں کو خبر دیتا ہے۔ لیڈروں کو بیان دینے کا موقع دیتا ہے۔ جلوس کی وجہ سے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ لوگوں سے جوانی کی طرف بڑھتی ہوئی لڑکیوں کے جسموں کو چھیڑا جاتا ہے۔ لوگوں کو جلوس میں شامل کر کے ان کے گھروں میں چوریاں کرائی جاتی ہیں۔ وہ دیہاڑی داروں کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ رشوتیوں کے حق میں نعرے لگا رہے تھے اور لوگ یہ نعرے اس لئے لگا رہے تھے کیونکہ جلوس کے وجود کے لیے ضروری ہیں۔ جلوس آگے بڑھ رہا تھا کچھ لوگ رکتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے پولیس والوں کے اندر ڈر پیدا ہوا کہ کہیں یہ جلوس آگے نہ بڑھ جائے جلوس کے وجود کے لئے وجود ہی ضروری ہے جلوس میں لاٹھی چلتی ہے گولی چلتی ہے کچھ پولیس والوں کو میڈل ملتے ہیں۔ جلوس روکنے والے پولیس والوں کا نام آگے جاتا ہے وہ مشہور ہوتے ہیں۔ اُن کے بیان آتے ہیں مگر جلوس والوں میں سے لاٹھی گولی کھانے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ آفیسر نے دیکھا کہ ایک شخص ڈرا ہوا دیوار کے ساتھ کھڑا ہے اور غریب دکھائی دیتا ہے اُس کے لیے لوگوں نے جلوس نکالا ہے مگر وہ جلوس میں نہ ہے یہ نعرے اُس کے لیے ہیں مگر بدقسمتی سے وہ نعروں کا حصہ نہ ہے اور یہ سارا سلسلہ جب آگے چلنے لگا تو جلوس کو ڈرانے کے لیے گولیاں چلیں اور خبر بنانے کے لیے ایک گولی راجہ کو ماردی گئی۔ ایک معمولی سا واقعہ رونما ہوا کہ راجہ مر گیا۔ بھاگے والوں کو موقع مل گیا خبر ڈھونڈنے والوں کو خبر مل گئی لیڈروں نے خوب مذمت کی۔ پولیس والوں نے ضروری بتایا اور جلوس روکنے کے لیے کچھ لوگوں کی پروموشن کی سفارش بھی کی گئی۔ اگلے الیکشن میں اُس کی موت بھی چناؤ کا مدعا بنی مگر اُس کی بیوی بیوہ ہو گئی بچے یتیم ہو گئے ماں باپ بے سہارا ہو گئے اُس کے بعد اُس نے لوگوں کے گھروں میں کام کرنا شروع کیا۔ گھروں سے بچا ہوا کھانا و سبزیاں بچوں کو کھلاتی تھی اور پھر جب بجلی والا بجلی کا کرایہ مانگتا تو بوڑھے ساس سسر گھر سے چلے جاتے تا کہ اُن کی بہو الگ گھر میں رہ سکے اور جب راشن کا ڈیلر گھر آتا تب وہ ایسا ہی کرتے مگر ان سب چیزوں سے الگ وہ کرو اپنے بچوں کا پیٹ پالنے میں مصروف تھی ساس سسر کی خدمت کرنے میں کھوئی رہتی تھی اور یہ سلسلہ در سلسلہ قائم رہا۔ اب تک کئی تھی کئی برس ہو گئے تھے اور چہرے پر لگاتار کئی جھریاں پڑ گئی تھیں اور سچ یہ ہے کہ ایک وقت میں وہ سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔

پھر ایک دن راحت کا دن آیا اُس کے بوڑھے باپ کو پنشن کے کچھ روپے ملے اس نے ایک دم اُسے بلایا اور پیغام بھجوایا کہ اُسے ضرور ایک دن کے لیے آنا ہے وہ بہت خوش ہوئی کیونکہ اُسے چار دن کے لیے اُسے کوئی کام نہ کرنا تھا صبح اپنی مرضی سے اُٹھنا تھا اور شام کو مرضی سے سونا تھا دن کو جس وقت چاہے کھانا کھا سکتی تھی اور پھر اپنے باپ کے گھر دیکھ کے وہ تمام کپڑے پہن سکتی تھی جو ابھی خراب نہ ہوئے تھے۔ اگلے روز صبح اس نے اچھا سوٹ پہن کر تیاری کی اور بچوں و ساس سسر سے کہا کہ "میں چار دن کے بعد آؤں گی" بوڑھے سسر نے حیرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "جاؤ بیٹی چار دن کے لیے آرام کرو"

اِن ہی خوابوں کے ساتھ وہ تیار ہوئی تھی۔ اُس نے ایک تانگہ کیا اور اپنے میکے کے گھر چلی گئی جوں ہی گھر کے دروازے کے قریب پہنچی اُسے دھکا لگا کہ اُس کا بھائی اپنی بیوی یعنی اُس کی بھابھی سے کہہ رہا تھا "مگر فرصت مجھے معلوم ہے کہ تم کام کرتے کرتے تھک گئی ہو میری بہن آ رہی ہے وہ لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہے اُسے کام کرنے کا خوب تجربہ ہے۔ چار دن وہ سارے کام کرے گی تم آرام کر لینا اگر ہو سکا تو سینما دیکھنے بھی جائیں گے"
یہاں پہنچ کر وہ جان کر حیران ہوئی کہ یہاں تو سوچ ہی دوسری ہے

# گل و گلزار کی باتیں

## محمود الحسن
(راولپنڈی)

دلِ ویراں سے دلداروں کی باتیں
بیابانوں میں گلزاروں کی باتیں

شہنشاہوں سے ناداروں کی باتیں!
بہت دلچسپ ہیں یاروں کی باتیں

ہنسی آتی ہے جب بے دست و پا لوگ
کیا کرتے ہیں تلواروں کی باتیں

مریضِ عشق اور ہوگا شفا یاب
یہ سب باتیں ہیں غمخواروں کی باتیں

شکستہ پا سہی لیکن ہمیں سے
سنیں گے لوگ کہساروں کی باتیں

برائے مصلحت لوگوں سے کب تک
کریں گے آپ انگاروں کی باتیں

کبھی اہلِ جنوں کے سر بھی دیکھو
کیے جاتے ہو دیواروں کی باتیں

تمہارے بعد اے محمودؔ کن سے
سنیں گے لوگ غمخواروں کی باتیں

○

## سید مشکور حسین یاد
(لاہور)

ہم کب یہ کہہ رہے ہیں کہ باہر کرو ہمیں
غائب اگر ہوئے ہیں تو حاضر کرو ہمیں

اک سانس کی مثال ہمارا وجود ہے
سوچو کبھی نہ شاذ کہ نادر کرو ہمیں

باطن ہمارا دید کے قابل نہیں رہا
جو کچھ بھی چاہتے ہو بظاہر کرو ہمیں

کیا جانے انتظار میں ہیں کتنی منزلیں
یعنی سفر سفر کا مسافر کرو ہمیں

کیسے چلے گا کوئی ہمارے بغیر کام
ہم حکمِ ناگزیر ہیں صادر کرو ہمیں

ایسی نہیں ہے بات تو ایک ایک سے ملاؤ
قلت میں آ گئے ہیں تو وافر کرو ہمیں

جیسی ہماری حیثیت بے مثال ہے
یادؔ اس طرح بھی حاضر و ناظر کرو ہمیں

○

## محمود شام

(کراچی)

کوئی دستار سلامت نہ گریباں اب کے
کیسے آغاز ہوئی صبحِ بہاراں اب کے

روز ملتا ہے نیا رقصِ جنوں دیکھنے کو
فارغ اک لحظہ نہیں دیدۂ حیراں اب کے

وحشتیں توڑ کے ہر بند نکل آئی ہیں
نادم انسان کی حرکت پہ ہے حیواں اب کے

فیصلے زور سے اور جبر سے کرتے ہیں ہجوم
یہ ہے سلطانیٔ جمہور کا عنواں اب کے

سننے والوں کی سمجھ میں نہیں آتا کچھ بھی
ہے بیانات سے مفہوم گریزاں اب کے

عشق دوکانِ وفا کھول کے رہ سکتا ہے
حسن بازارِ ہوس میں ہے غزلاں اب کے

○

## شبنم شکیل

(اسلام آباد)

میں جو چپ ہوں تو یہ مت پوچھ کہ قصہ کیا ہے
اب زمانے کا کسی سے کوئی ناطہ کیا ہے

اب کوئی کام نہیں جیسے کسی کے بس میں
سب ہی دیکھتے رہتے ہیں کہ ہوتا کیا ہے

ہم مگن رہتے ہیں بس آپ ہی اپنی دھن میں
کوئی پڑھتا نہیں دیوار پہ لکھا کیا ہے

یہی انداز ازل سے ہے ابد تک جاری
مانگتے کیا ہیں مگر بخت سے ملتا کیا ہے

یہ بتا سکتے ہیں بس کربلا والے شبنم
پیاس کہتے ہیں کسے پیاس کا بجھنا کیا ہے

○

## عبدالعزیز خالد

(لاہور)

زندگی جو ایک شے تھی بے بہا
ہوگئی نذرِ غمِ برگ و نوا

آسماں کو فرصتِ ماتم کہاں
اک ستارہ ڈوبے ابھرے دوسرا

انتظامِ دہر ہے کس کے سپرد؟
اے خدا! اے قادرِ مطلق خدا!

بات بھی دل کی وہ کہہ سکتا نہیں
کس قدر مجبور ہے انساں ترا

ہم نہیں تیرے کبھی دھارے کے ساتھ
اور قیمت اس کی کرتے ہیں ادا

برگِ گل سے کم نہیں ہیں خاروخس
ان کو بھی کرتا ہے مس دستِ صبا

وہ بھی ہیں جزوِ خمیرِ رنگ و بو
رزقِ خاکِ زرنگارِ گل کدہ

صاحبِ حرفِ ہوں لیکن خوشہ چیں
ہے کوئی تکمیلِ فن کی انتہا!

ہے کہاں ملکِ شبابِ جاوداں؟
ہے کہاں سرچشمۂ آبِ بقا؟

کس سے لیں خالدؔ سراغِ رفتگاں؟
ہے عدم کی رہگزر بے نقشِ پا!

## فقاش کاظمی

(کراچی)

ساری خشکی اور سمندر آنکھوں میں
ڈوبے گا اب کون سا منظر آنکھوں میں

کوئی اس کو ہجر کہے یا محرومی
کاٹا ہم نے عمر کا چکر آنکھوں میں

آڑی ترچھی شکنیں ڈسنے لگتی ہیں
چبھتا ہے اب خالی بستر آنکھوں میں

راتوں میں ہیں موتی شبنم، تارے، پھول، لہو
مٹی، ریت اور دھوپ ہے دن بھر آنکھوں میں

ہم جھیلوں کی گود میں بسنے والے لوگ
کیسے اتریں اس کی سمندر آنکھوں میں

دائرے کھینچنے والا شخص نہیں مانا!
پھینک رہا ہے چُن چُن کنکر آنکھوں میں

دفتر جاؤ تو بیوی بچے اور مسائل
گھر میں رہو تو سارا دفتر آنکھوں میں

بینائی کا کوئی محرک ہو فقاشؔ
دید اُگے گی کیسے بنجر آنکھوں میں

○

**مامون ایمن (نیویارک)**

عشق کی منزل میں ہیں رستے بہت
ہم تلاشِ دوست میں بھٹکے بہت

زندگی کس پر ہوئی ہے مہرباں
شہر میں ہیں موت کے چرچے بہت

دسترس میں تھی کوئی تعبیر کب
زندگی نے خواب تو دیکھے بہت

خواب سے آنکھیں ہوئیں گویا کہ ہیں
پتھروں کے دل میں آئینے بہت

میری تنہائی بھی تنہائی نہیں
ساتھ رہتے ہیں مرے چہرے بہت

آرزو کی جستجو تازہ رہے
حبس کے صحرا میں ہیں جھونکے بہت

آگہی کا ایک رُخ ہے خامشی
ہاؤ ہو کی دھوپ میں سائے بہت

اپنی آنکھوں میں بھی روشن تھے دیے
ہم نے بھی دیکھے ہیں دن اچھے بہت

بات دل کی دل ہی میں پنہاں رہی
راز گرچہ آنکھ نے اُگلے بہت

ہم رہے محروم دونوں ہی طرح
پیار میں ہارے بہت، جیتے بہت

حُسن کا در بند تھا' ایمنؔ! مگر
سرگراں پیغام بر پہنچے بہت

**ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی**
**(دربھنگہ بھارت)**

وہ جو اک ہے عصری حسی آگہی کا آئینہ
اب تو گدلا ہو گیا اس کیفیتی کا آئینہ

بڑھ گئی ہے خوب آبادی اس مخلوق کی
اپنے ہاتھوں میں جو رکھتی تیرگی کا آئینہ

دیکھنے کا حوصلہ اس میں نہیں کچھ رہ گیا
زندگی بھر جس نے دیکھا بے کسی کا آئینہ

ظلمتوں کے شہر میں جانے سے پہلے رکھ بھی لو
کام آئے گا میاں کچھ روشنی کا آئینہ

رہزنوں کے درمیاں ہے مانگ اس کی بڑھ گئی
ان کے فن کی ہے ترقی رہبری کا آئینہ

کام یہ شہرِ وفا میں کر دے کوئی سنگ دست
توڑ دے گر ہو سکے آزردگی کا آئینہ

متبادل اب مناظرؔ تم بھی کوئی ڈھونڈ لو
کام کیا آئے صحافت شاعری کا آئینہ

○

## ڈاکٹر خالد حمید شیدا

(یو ایس اے)

دل کو وہ توڑ کر جو ہمارے چلے گئے
سارے وہ لے کے ساتھ سہارے چلے گئے

کالی گھٹا ہے شب ہے اندھیرا ہے ہر طرف
لے کر وہ ساتھ چاند ستارے چلے گئے

آنکھوں کی نیند اُڑ گئی اور ساتھ ساتھ اب
تھے جس قدر بھی خواب پیارے چلے گئے

دل جل کے خاک ہو گیا آتش کے ساتھ سب
شعلے ہوئے تمام شرارے چلے گئے

جاتی رہیں ادائیں وہ غمزے نہیں رہے
عشوے چلے گئے وہ اشارے چلے گئے

شیدا کو دیکھئے کہ محبت میں عمر بھر
تارے وہ آسماں سے اتارے چلے گئے

○

## انوار فیروز

(راولپنڈی)

میں اندھیروں میں بھی سنورتا ہوں
میں کہاں تیرگی سے ڈرتا ہوں؟

میں بڑی احتیاط کرتا ہوں
پاؤں جب سیڑھیوں پہ دھرتا ہوں

حق کا پرچم اٹھائے پھرتا ہوں
میں کہاں بات سے مکرتا ہوں

اس کی پرواز آسماں کی طرف
میں تو پاتال میں اترتا ہوں

میں کسی کو برا نہیں کہتا
میں تو انساں سے پیار کرتا ہوں

میرا سایہ ہی میرا دشمن ہے!
اپنے سائے سے میں تو لڑتا ہوں

میری ماں کی دعا ہے میرے ساتھ
کب جہاں میں کسی سے ڈرتا ہوں

میں ہوں انوار روشنی کا نشاں
نور بن بن کے میں بکھرتا ہوں

○

## ولی عالم شاہین (کناڈا)

بجلیاں سی لفظ کی رگ رگ میں بھر دیتا ہوں میں
ظلمت سے پھر انہیں آزاد کر دیتا ہوں میں

دکھ کے سامانِ جراحت طشت میں ترتیب سے
زخم کو پھر اپنے ہونے کی خبر دیتا ہوں میں

آنکھ میں جشنِ چراغاں دل میں اندوہ نہاں
پھر کوئی شہرِ غزل آباد کر دیتا ہوں میں

بات رکھتا مختصر لیکن میں ہوں کم حوصلہ
ایک مستانہ صدا ہر سانس پر دیتا ہوں میں

ڈوبتی سانسیں، گھٹی آہیں، سلگتی سسکیاں
زندگی تجھ کو سجا کر اپنا گھر دیتا ہوں میں

میں نہیں ہو جس کی ہے تجھ کو گلستاں میں تلاش
دل کو اندیشوں کے پت جھڑ کی خبر دیتا ہوں میں

جب بقا ہی مسئلہ ہو، کیا خوشی؟ کیسی خوشی؟
ہاں دعا سب کو خوشی کے نام پر دیتا ہوں میں

اپنی محرومی کا مانگوں بھی تو میں کس سے صلہ
اپنے ماتم میں کسی کے زخم بھر دیتا ہوں میں

عہد تازہ باندھتا ہوں عمر کے ہر موڑ پر
رخشِ جاں کو پھر کہیں اذنِ سفر دیتا ہوں میں

جب کبھی شاہینؔ موسم کی جفا کیشی بڑھی
دوستوں میں جشن کا اعلان کر دیتا ہوں میں

○

## پروفیسر خیال آفاقی
(کراچی)

نہ دل میں کوئی خلش تھی، نہ تھیں پہلے
نہیں تھی کوئی ہمیں ایسی بے کلی پہلے

ہزار جینا بھی چاہیں تو جی نہیں لگتا
حیات ایسی بھی مشکل نہ تھی کبھی پہلے

سبھی کو جانا ہے اس بزمِ ہست سے اُٹھ کر
بس اتنا ہے کہ کوئی بعد میں، کوئی پہلے

چراغ بجھنے کے منظر سے کیا کوئی سمجھے
اندھیرا ہوتا ہے پہلے کہ روشنی پہلے

ہزار پیشہ ورانہ تھیں چشمکیں لیکن
تعلقات میں آتی نہ تھی کمی پہلے

جہانِ عشق کا دستور عقل سے ہے ورا
خودی ہے بعد میں، لازم ہے بیخودی پہلے

بجا ہے خود کو سمجھنا خلیفۂ ارضی
مگر بنے تو یہ ''انسان'' آدمی پہلے

غزل بھی کیا ہے مرے دل کا مرثیہ گویا
یہی غزل تھی کبھی رنگِ زندگی پہلے

نہ جانے کیوں نہیں اب ہوتی کیا سبب ہے خیالؔ
وہ شعر کہنے پہ ہوتی تھی جو خوشی پہلے

○

## غلام مرتضیٰ راہی
(فتح پور بھارت)

کہیں ٹھیک ہے سب، کہیں گڑبڑی ہے
ہمیشہ سے دنیا ادھوری پڑی ہے

بہت خون اس میں بہا خواہشوں کا
عجب جنگ اک میں نے دل سے لڑی ہے

تعلق کی زنجیر پر زور مت دیں
کڑی اس میں نازک سے نازک پڑی ہے

میں تصویر بن کر اُسے دیکھتا ہوں
جو دیوار میں کیل خالی گڑی ہے

مثال اُس کی شہرت کی ایسی ہے جیسے
مرے قد سے پرچھائیں میری بڑی ہے

میسر تھا جس کو کبھی چھت کا آنچل
وہ دیوار اب سر برہنہ کھڑی ہے

تلاش و تجسس کے دیوانو! ہشیار
مری خاک بھی چھاننے کو پڑی ہے

جو میں آستیں میں چھپائے ہوں راہی
نہیں اور کچھ بیش قیمت گھڑی ہے

○

## سید ضیا ہاشمی
(ملتان)

وہ خوابوں میں بھی اب ملنے لگی ہے
وہ کیا عشق فرمانے لگی ہے

جسے چھیڑتی ہمارے نام سے بھی
ہمارا ہی وہ دم بھرنے لگی ہے

اکیلے گھر کے سناٹوں میں وہ اب
اکیلے پن سے گھبرانے لگی ہے

تصور میں وہ میرا قرب پا کر
تصور ہی میں شرمانے لگی ہے

کوئی تو ہے جو میرے ساتھ شب بھر
ستاروں کی طرح جلنے لگی ہے

کتابِ عشق کے اسباق پڑھ کر
وہ آئینے سے بھی جلنے لگی ہے

محبت بھی تو مچھلی کی طرح ہے
بنا پانی ضیاؔ مرنے لگی ہے

○

## محبوب ظفر
(اسلام آباد)

یہ جانتا ہوں وفا کرے گا جہان کیسی
سجائے بیٹھا ہوں پھر بھی دل کی دکان کیسی

یہ بات الگ ہے کہ اب پلٹ کر نہ آسکیں گے
مگر تھی اس بار پنچھیوں کی اُڑان کیسی

کئی برس سے ہم ایک ہی آنگن میں رہ رہے تھے
یہ آج دیوار آ گئی درمیان کیسی

محبتوں میں چھپائے پھرتے ہیں نفرتوں کو
گھرے ہوئے ہیں منافقوں میں امان کیسی

نہ پوچھ میرے بدن پہ آئے ہیں زخم کتنے
یہ دیکھ مسمار کی ہے میں نے چٹان کیسی

ظفر جب اپنے عدو سے ہم خود ملے ہوئے ہیں
تو جنگ کیسی، شکار کیسا، مچان کیسی

○

## شگفتہ نازلی (لاہور)
(فرازؔ صاحب کی رحلت پہ کہی گئی)

وہ شاعروں میں خوش نوا احمد فرازؔ تھے
ہر دلعزیز بھی سدا احمد فراز تھے

ایسے سُخن تراشے کہ سب کو لُبھا گئے
اسلوب بھی تو خاص تھا احمد فراز تھے

جالبؔ ہی تھی مزاحمت اور رنگ فیضؔ بھی
کچھ بھی کہیں پہ برملا احمد فراز تھے

دیکھا نہ جائے پھر بھی اُنہیں دیکھتے رہے
عالم تھا اُن کے شوق کا احمد فراز تھے

سارے ہی سلسلوں کو وہ تو توڑتے گئے
تھے سب کے بیچ بھی جدا احمد فراز تھے

کہنے کو دل کی بات بہانہ غزل ہوئی
تھا نام سوچے تو کیا احمد فراز تھا

○

## ضمیر نوری
(کراچی)

وسعتِ دشتِ سیہ میں وہ بھی رہتا تھا کبھی
آج قطرہ ہوگیا ہے کل جو دریا تھا کبھی

اس طرح کا خواب میں نے آج تک دیکھا نہ تھا
اپنی ہی آواز پر خود میں بھی چونکا تھا کبھی

آگیا وہ دن، تمھیں جس کی خبر پہلے سے تھی
وقت کا شاید جو لمحہ آ کے ٹھہرا تھا کبھی

یہ جو ہم صورت ہے میرا، کس قدر معصوم ہے
ایسے ہی لوگوں پہ مجھکو بھی بھروسہ تھا کبھی

دھوپ کا نیزہ لئے سورج بھی تھا سر پر سوار
رہنے والو کے لیے گلشن یہ صحرا تھا کبھی

اس کی آنکھوں میں تھی گزری ساعتوں کی اک جھلک
ایسا لگتا تھا کہ وہ میرا شناسا تھا کبھی

سخت نفرت ہو رہی ہے دیکھ کر تم کو ضمیر
اپنے سائے میں سمٹ کر میں بھی رہتا تھا کبھی

○

## حنیف نجمی
(چنئیر گڑھ مہارت)

گزر کر حد غفلت سے خبر داری میں رہتا ہوں
کہ میں آنکھوں پہ پھر مرنے کی تیاری میں رہتا ہوں

خدا وندا مرے پیکر میں ہے جب روح لاہوتی
تو ہر دم مبتلا پھر کیوں سیہ کاری میں ہوتا ہوں

سنا ہے خوش بہت رہتا ہے بیماروں سے وہ اپنے
سو میں بھی پُر سکوں ہر رنج و بیماری میں رہتا ہوں

زمیں سے آسماں تک ہے عمل میری محبت کا
جہاں رہتا ہوں میں اپنی عملداری میں رہتا ہوں

وہ خوشبو ہے مگر اس کو بھی چھو لیتا ہوں میں اکثر
کہ پاکیزہ بہت میں اس گنہگاری میں رہتا ہوں

میں وہ پاگل ہوں کہ ہجرت در چمن جس کا مقدر ہے
کسی کیاری میں کھلتا ہوں کسی کیاری میں رہتا ہوں

اُدھر وہ بے دھڑک آرے چلاتا ہے درختوں پر
اِدھر میں منہمک ہر دم شجر کاری میں رہتا ہوں

یہ دنیا کچھ کہے پروا مجھے بالکل نہیں نجمی
کہ میں کھویا ہوا اپنی قلم کاری میں رہتا ہوں

○

## ڈاکٹر جواز جعفری

(لاہور)

اک ایسی کیفیتِ ذات سے گزر رہا تھا
چمکتی دھوپ میں برسات سے گزر رہا تھا

نہ اس کے وصل کی خواہش نہ اس کے ہجر کا غم
عجب صورتِ حالات سے گزر رہا تھا

چمکتی راتیں سیہ دن تھے میرے چاروں طرف
میں کیسے ارض و سماوات سے گزر رہا تھا

اُفق کے پار کوئی دنیا منتظر تھی مری
میں آسماں کے مضافات سے گزر رہا تھا!

پسِ غبار کہیں رہ گئی مری تقویم
میں اُس گھڑی نئے اوقات سے گزر رہا تھا

نجانے کیوں دلِ بے برگ و بار یاد آیا
میں جس گھڑی ترے باغات سے گزر رہا تھا

وہ آنکھ کر گئی روشن مرا بجھا ہوا دن
وگرنہ میں تو سیہ رات سے گزر رہا تھا

مہک سی آنے لگی ہے جوازؔ لفظوں سے
یہ کون تیرے خیالات سے گزر رہا تھا

○

## صفوت علی صفوت (نیوآرک)

مشتعل، اوباما پر رقص میں ہیں پروانے
اِس جنوں کے پیچھے کیا ہے بس خدا جانے

ہم بھی اِس کی حدت سے اب لگے ہیں گرمانے
ڈر ہے سب کی مستی میں ہو نہ جائیں مستانے

سلسلہ تعصب کا ختم ہو رہے شاید
قرنِ وحدِ انسانی پھر لگا ہے آکسانے

ذہن میں غلامی کے ہے اُمیدِ نو ایبکؔ
بن گئی حقیقت تو ہم لکھیں گے افسانے

نصف خونِ مسلم ہی ابتدا میں ہے کافی
صبر کرنے والوں میں ہم گئے ہیں پہچانے

اے خدا تری خاطر ہم چلے ہیں اس جانب
صدر کے پڑاؤ میں اپنا ووٹ گنوانے

آپ کی نظر صفوتؔ مظہر کواکب ہے
اس لئے اوباما کے ہم ہوئے ہیں دیوانے

دو ہزار نو کا ہے آج بیسواں سورج
قاضی عدالت ہیں تاج صدر پہنانے

قدر اوجِ انسانی ماپنے کو ہے راوی
ساقیِ اوباما نے بھر دیئے ہیں پیمانے

نعرۂ مبارک میں ہم ہوئے ہیں سنجیدہ
اہلِ عقل چلتے ہیں گتھیوں کو سلجھانے

ایبکؔ: ہندوستان کا پہلا مسلمان بادشاہ قطب الدین ایبک، خاندانِ غلاماں

# بوڑھی گنگا

طاہرہ اقبال (فیصل آباد)

اسٹیمر کے دائیں بائیں چھٹتے جھاگ دار بلبلے دولی کے خیالات کی طرح بوڑھی گنگا کے سینے میں ڈوبتے ابھرتے تھے۔ دولی کے پراگندہ دل و دماغ کی طرح چنگھاڑتے کراہتے احتجاج کرتے اور پھر مقدر کی طرح بے بس ہو جاتے۔ پرانا روغن اترا اسٹیمر کنارے چھوڑ رہا تھا۔ جس کے دروازوں کے قبضے، کھڑکیوں کے شیشے، فرش کے پھٹے اور کیبنوں کی دیواریں دولی کے وجود کی طرح چیختی حال دُہائی مچاتی گنگا کی کثافتوں میں غرق ہو جاتی تھیں۔ کیلوں کے تنے، پتے، ناریل کے خول، باسی گلی سڑی سبزیاں ایک پوری تہہ تھی جو فرشِ آب پر بچھی تھی اور کشتیوں اور اسٹیمروں کے سنگ تیر رہی تھی۔ جیسے پانی کے اوپر اِک شہر آباد ہو گیا ہو۔ اتنا ہی آلودہ جتنا کہ خود ڈھاکہ شہر اِتنا ہی گنجان جتنا بنگلہ دیش، جیسے یہ اسٹیمر نہ ہو ڈاؤن ڈھاکہ کی کھولیاں ہوں جن میں آدھا بنگال بند ہو گیا ہو۔ بوڑھی گنگا کے اس چھور پر کئی خالی اسٹیمر لنگر ڈالے کھڑے تھے جن کے کیبن صرف تل تل کے دھوئے جا رہے تھے۔ زنجیروں سے بندھی بالٹیاں بھر بھر ملاح عرشے پر کھینچتے۔ سیاہ کیچڑ پانی سے نہاتے ایک دوسرے پر اُلٹاتے بنگلہ گیت گاتے ننگے بھوکے موج مستی کرتے۔ دولی نے سوچا پتہ نہیں یہ ملاح اِتنے خوش خوش کیوں رہتے ہیں۔ شاید پانی کی سنگت میں کوئی خوشی وہ تعویذ گھلا ہے یا شاید مچھلیوں بدہم جنسوں کی محبت دیوانہ بنا دیتی ہے۔

مخالف سمت سے گرتی ہوا کا تھپیڑا ناریل کی گھاس جیسی جھلسی ہوئی خشک جلد پر اس نے سہارا۔

"یہ مرد جات تو سدا کا لاپرواہ بے ایمان ـــ میلا کا شر جیسے چاہے نوچے چڑیاں بچ رہیں تو کسی ڈھاکہ میں کسی جھونپڑے میں چھوڑ خود ناریل کے پیڑوں کی گودی میں بھرے سیلاب لیے بندر سا چڑھ جائے۔ سارے ڈکیتی داری جات کے لیے بوڑھی گنگا جیسے پرانے اور تعفن چھوڑتے ہوئے"

دولی کا کم عمر ناشی چپ مار رہا۔

آلودہ پانیوں پر تیرتا یہ گنجان آباد شہر لنکی سی ڈکھی بھری عورتوں کی قسموں سے کراہتا تھا۔ السی کی تیلیوں جیسی پسلیوں اور بھات سے خالی تھالی جیسے پچکے ہوئے پیٹ والی زیادہ تر اِن عورتوں کو دولی جانتی تھی۔ یہ سب وہی تھیں جو ڈھاکہ کے پاش علاقوں کے جدید فلیٹوں میں دو تین ہزار ٹکا کے عوض بوا کا کام کرتی تھیں۔

شام ڈھلے جب سورج کی کرنیں بوڑھی گنگا کے کثیف پانیوں میں منہ چھپا رہی ہوتی ہے تو گلشن اور گلشن ٹو کی بالکونیوں میں ہوائیں اُن بچوں کے یونیفارم استری کر رہی ہوتی ہیں جنہیں کل صبح انگریزی طرز کے مہنگے سکولوں میں پڑھنے جانا ہے۔ ان پاش علاقوں میں ناریل کے اونچے لمبے پیڑوں کی گودیوں میں بھرے کچے ڈاب اور کیلوں کے بڑے بڑے گچھوں کی بغلوں میں رنگ بدلتے چتری والے گچھے دیکھ کر انہیں اپنے بچوں کا دھیان بار بار ستاتا ہے جو دور کسی برساتی جھیل کے پانیوں میں گھری بانسوں کی جھونپڑی میں نانی کے گرد جمع بھات پکنے کا انتظار کرتے ہیں جن کے خالی پیٹوں کے مقابلے میں بھات کی یہ مقدار بہت کم ہو گی، جس سے ان کا آدھا پیٹ بھر سکے گا آدھا خالی رہ جائے گا۔ جب کہ اُن کی ماں اُن سے بہت دور کسی بڑے گھر کے صحت مند بچوں کے لیے اس وقت بریانی یا چو چا رہی ہوتی ہے اور باپ نجانے ڈھاکہ چٹاگانگ راج شاہی کس بڑے شہر کی کس سڑک پر سائیکل رکشہ چلا رہا ہو گا اور روز کا جو ٹکا کمائے گا تو پچاس دوسرے شوہر کے بچوں کی ماں اپنی تیسری بیوی کی ہتھیلی پر رکھے گا تو پچاس ٹکہ داروں میں اُڑ ہو سکے گا۔

اسٹیمر لکڑی کے جھولتے ہوئے پل کی بغل سے گزرا جس کی ریلنگ سے کتنے شخص مدہوش لٹک رہے تھے۔ اکڑے ہوئے جسم ٹھہری ہوئی پتلیاں، سانس جلد نیلے پھر ہونٹ جیسے موت کا عمل گزرے کئی گھنٹے بیت چکے ہوں۔ دولی نے پڑیوں کی مٹھ بے ریلنگ سے آدھے لٹکے ہوئے گچھوں بھرے چہرے والے شخص کو دیکھا تو ڈر کے سوچا شاید اس کے دونوں بڑے بچے یتیم ہو چکے ہیں۔ دولی کو جب کبھی کچھ یاد کرنے کی فرصت ملتی تو اُسے اپنے تینوں شوہروں کی یادگار چار بچوں میں اپنے پہلے شوہر کی شبیہ رنگتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے بانسوں پر کھڑے پھوس کی چھت والے جھونپڑے میں پہلی بار اس کی گہری گلابی رنگ ساڑھی کا پلو اس کے سیاہ چکنے بالوں سے سرکایا، تب پلاؤ ذم سے جھانکتے پیٹ کی پلیٹ میں جیسے بنگالی چیرو پیا آ کھڑی تھی چکنے گالوں سے ناریل کا تیل ٹپکتا تھا اور اس کے بدن کی رنگت اور ملائمت پر رہو مچھلی کا گمان ہوتا تھا اور اس کے لبوں کی ساخت میں بتاشا پایا گھلے تھے۔ بنگالی آنکھوں کے جادو میں اسرار کا رس بھرا تھا۔ ان تمام ملائمتوں، رنگوں، چکناہٹوں اور رسوں کو پہلی بار چکھنے والا یہ تو تھا جس کا وجود ٹکا (Store apple) جیسا سخت لیکن اندر سے ویسا ہی نرم اور میٹھا جیسا ٹکا کا اندرونی گودا۔ آم جیسا نرم پیلا اور مزے دار جس کا شربت بنا کر پیا اُن کی بڑی عیاشی تھی لیکن تو اُسکے بدن کا یہ شربت نشے کی کڑواہٹ میں یوں زہر ہوا کہ چھت کی طرح وجود کے چیندے میں بیٹھتا چلا گیا کہ دولی کو لگتا کہ اگر کبھی اس کی کوئی نس کہیں سے پھٹ گئی تو خون کی بجائے پاؤڈر باہر چھلکنے لگے گا۔

اک رات وہ اُسے جھونپڑے میں مدہوش پڑا چھوڑ کر ڈھاکہ جانے والے اسٹیمر میں سوار ہوئی بلبلے اُڑاتے دھوئیں مارتے غلیظ کیبنوں والے اِسی اسٹیمر میں اُسے اپنا دوسرا شوہر بخش ملا جس نے اُس کے سنگ اگنی کے پھیرے لیے تھے اور ایک لڑکی کی سوغات پکڑا کر اِک رات کھولی میں سوتے ہوئے اُسے یوں چھوڑ گیا جیسے وہ کبھی جھونپڑے میں تو الوہا چھوڑ آئی تھی۔ اُسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کھولی کا چھ ماہ کا کرایہ بھی اب اُسے اپنے بدن کے رس میں سے چکانا ہے کرایہ تو رہٹ نے کمشن ادا کر دیا لیکن اُسے چھ بچے لے کر

کبھی نہ گیا۔ البتہ چھ مہینے کے کرائے کے عوض اُسے اِک لڑکا دیا۔ دو سال بعد دولی کو بڑے شہروں کی ہوشیاری کچھ آنے لگی تو احساس ہوا کہ روز روز آنے والے یہ مہمان جو کچھ دے جاتے ہیں وہ اس کھولی کے کرائے اور اُس کے حصے کے بھات سے کہیں زیادہ ہے تو بس اُس نے اس درمیانی واسطے سے نجات کا سوچا اور بوڑھی گنگا کے برساتی دریا کو پرانے اسٹیمر کے غلیظ ترین غسل خانوں والے تھرڈ کلاس کیبن میں چاروں بچوں کو بھر کر دھان کے کھیتوں میں گھرے اپنے گاؤں میں واپس لوٹی لمبے بانسوں پر ٹنگی جھونپڑی میں ماں کے پاس انہیں چھوڑا جہاں کیلے کے باغات بانسوں کے جنگل ناریل کے پیڑ جھیلوں میں تیرتے تھے لیکن یہ دھان، کیلے اور ناریل ان کھیت مزدوروں سے ایسے ہی اُچک لیے جاتے ہیں جیسے باڑھ ان کے جھونپڑے پل بھر میں کہیں بہالے جاتی ہے۔ چند جھونپڑوں پر مشتمل اس کے گاؤں میں داخلے والی جس جھیل پر دو بانس باندھ کر پل بنالیا گیا تھا یہی جھیل جب بارشوں میں بھرتی تھی تو سارے کھیت سارے باغ جنھیں سیراب کرتی انہیں خود ہی نگل جاتی ہے اور جب باڑھ اترتی تو بانسوں پہ ٹنگے گاؤں بھر کے جھونپڑے جھیل میں بچھے ہوتے، جہاں کبھی کوئی ٹوکا زندہ یا مردہ لاشوں کو اٹھانے نہ پہنچ پاتی۔ کیا بڑا کیا بچّہ کیکڑوں کی شاخوں سے لپٹے ڈھانچے وہیں لٹکے رہتے اور بھوکے گدھ کوّے سانپ پیٹ بھرتے۔

اب کی بار باڑھ گزر چکی تھی۔ جھیل کے گدلے پانیوں میں کنول ٹہنیاں لمبی ٹہنیوں کی گردن پر کھلے تھے۔ چوڑے پات جھیل کے پانیوں کو ڈھکے تھے جن کا کاہی زدہ سکوت اب تک دیسیکیو کی کسی ٹوکا نے نہ چھیڑا تھا اُس کی ماں کی آنکھوں میں بہتا آنسوؤں کے ماتم تھا اُن کا جن جسم باڑھ اپنے ہمراہ لے گئی اُن کا جن کے پیٹ پسلیوں سے نیچے اتر کر ریڑھ کی ہڈی میں دھنس گئے تھے بنا بلاؤز کے چار گز کی سوتی دھوتی کا پلّو گر کر ڈھلکا تو سینہ ننگا ہو جاتا سینہ ڈھکا تو کمر کی ریڑھ کی ابھری ہڈیاں کھل جاتیں جو جھریوں کا گچھا تھیں اب ستر چھپنے کی ضرورت سے ہی عاری تھا۔ وہ پانی سے بھرے کھیتوں جیسی آنکھیں جن کی ساری فصلیں باڑھ نگل گئی تھی۔ پلو میں نتھی لگے ہوئے ناریل کے بالوں جیسی جٹائیں کھچڑی، پسلیوں میں دھنسا پیٹ منہدم سینہ اور کمر کا بوسیدہ پنجر اکلا ہو جانا جیسے بھوکے گدھ کوّوں کے لیے دعوت عام ہو۔

اُس نے ماں کو جتن دیا وہ اس کے لیے بلاؤز دولی ساڑھی لائے گی۔ وہ اپنے ان چار بچوں کے لیے جو اس کے پاس چھوڑے جارہی ہے اتنا بھات کما کر بھیجے گی کہ اُن کا پیٹ بھر جایا کرے گا لیکن تھالی میں ابھی بھات بچا رہے گا اُن کے گالوں پر تلیا کھلیں گے اور بالوں سے ناریل کا تیل چوئے گا۔

دولی نے مٹھی بھر اُبلے ہوئے چاولوں سے چپڑا ہلکی سلوانڈ کی تھالی کی سمت ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ماں بھی بھوکی ہی رہ گئی۔ چاروں بچے نے ہوئے پنجے چاٹتے رہے۔ ان انگوری نہری کھیتوں کی بھوک سے تنگ آکر وہ واپس چلی آئی اگلے روز وہ پھر ڈھاکہ میں تھی۔ ڈھاکہ جہاں سلکنگ یونٹ بھرے ہیں اور دولی کے برابر تابانی لوگ بن کر پورے شہر میں اُڑتے پھرتے ہیں جہاں

کی جدید تعمیرات کے لیے مزدوروں کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ جہاں مغربی طرز کے بنگلے اور فلیٹ ہواؤں کو چھو رہے ہیں۔ جن کی چھتوں پر پھول پھلواری کھل رہی ہیں جن میں بڑے بڑے پنجروں میں پالتو شیر، ریچھ اور کتے بند ہیں۔ جن کے گیٹ کھولنے کھلوانے کا وردی کا روائیات ہیں۔ جنھیں ایک پہر کوکنگ کے بیٹھنا نصیب نہیں کبھی لیموزین فراری، کبھی مرسڈیز جتنا بڑا گیٹ کھولنا ہوتا ہے اتنا ہی بڑا سلیوٹ بھی مارنا ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد بنگال نے بہت ترقی کی ہے۔ بڑے محلات کی تعمیر میں بڑی گاڑیوں کی درآمد میں لیکن ان کے سامنے ابھی سڑکیں وہی ٹوٹی پھوٹی، گڑھوں بھری، تنگ موڑ کاٹتی گلیوں اور ڈھابوں میں گھستی ہوئیں، جہاں گھنٹوں ٹریفک جام رہتا ہے جو پنجروں اور فقیروں کی بھوک منڈی معلوم ہوتا ہے۔ دھان منڈی اور ڈاؤن ڈھاکہ کی چار چار ہاتھ کی گلیاں گلیوں میں گھسے ہوئے گھونگھے جیسے شہد کے چھتے کے بے شمار سوراخ جن میں کتنی مکھیاں بھری ہوں یہ ہزاروں انسانوں کی کترنیں بکھری ہوئی کہیں مانگنے کو بڑھے ہوئے ہاتھ معذور ٹانگیں کہیں بسورتے چہرے کہیں گھنے بالوں کی الجھی چوٹیاں، سائیکل رکشہ، ہتھ ریڑھیاں، جھوٹے چھابے خشتی۔ تاریکیوں میں کھڑکیوں پر کپڑا اٹکی ہوئی ڈھانچہ عورتیں، اردگرد پھیلے پانیوں میں اترتے دھان کے کھیت، ناریل، اناج کے پیڑ، جن پر بھوک بھوت کی طرح سوار ہے اور ایک یہ گلشن اور گلشن ٹو کے محلات ایک ہی شہر میں کتنی دنیائیں آباد ہیں۔ نیچے اور اوپر کبھی اس اسٹیمر کی منزلوں کی طرح دولی کو لگتا اوپر والوں کا سارا بوجھ ساری غلاظتیں ان نیچے والوں پر لدی ہیں۔

دولی نے انہی محلات میں پناہ لینا مناسب سمجھا۔ وہ کہیں بھی باہر کھولی آباد کرتی تو خرچہ ہوتی کھانا کوئی اوپر والا، عورت کی کمائی کے دعوے دار کتنے پیدا ہو جاتے ہیں۔ کھٹو شوہر کا مشغلہ ٹھیکیدار کرایہ دار اگرچہ ابھی دولی کے گالوں، بالوں اور آنکھوں سے ناریل کی چمک آب ابھی نہ گئی تھی لیکن اس نے ان محنت مند بیٹھے بچوں کے لیے ماچھ بھات چانے ہوناکا کا تجربہ بنانے کو ترجیح دی یہ جو اس ملک کی مخلوق معلوم ہی نہ ہوتے تھے۔ اور یہ پنجروں کی ہم شکل مخلوق کبھی کبھی کی بات تھی۔ چار خانہ بوسیدہ دھوتیوں پر ڈورے دار ٹی شرٹیں پہنے شاید کپڑے کی کمی نے جسامتوں کی کانٹ چھانٹ کر کاٹ لیا تھا۔ اسی لیے لمبا ٹک بھرا جیز چلنا، دوپہر ڈھلتے بھات کے پتلوں کی چپچپاہٹ موسموں کی سیلن، پانیوں کی تہہ ری ہوئی اُس شاید حرکات و سکنات کی کاہلی بن گئی تھی۔ جھیلیں، دریاؤں میں بھرا پانی آسمانوں سے برستا پانی ندی نالوں میں اترتا پانی اور بوڑھی گنگا کے پرآلائش سینے میں زہر بنتا اور ماچھ کی فصل قتل کرتا ہوا پانی۔ ارے بنگال میں تو پانی بھی عذاب کی شکل ہے خارج بھی اور بھیتر بھی فساد برپا کر رہا ہے۔

انہی نم موسموں کی کسمساہٹ اور بدن کی سیلن کی سستی بعض اوقات دولی کو بھی پچھاڑ دیتی وہ ہفتے میں ایک دو بار رعایت پر چلی ہی جاتی۔ ٹیکسی کی جیب میں جو اضافی روپے چھپا کر لاتی وہ مختلف شوہروں کے چاروں بچوں کے لیے لنڈا بازار سے کپڑے خریدنے میں صرف ہوتے۔ دولی کے لیے ہر شوہر سے

نفرت اور دوری کی اپنی اپنی حدیں تھیں لیکن بچاروں بچے اپنے اپنے باپوں کی شبیہوں کے باوجود اُسے یکساں ہی پیارے تھے۔ ان کے لیے کپڑے جوتے خریدتے ہوئے روہی کو کبھی احساس نہ ہوا کہ چاروں کس کس بیج، چار کی پیداوار ہیں اور جن کے خلیے ہیں وہ نجانے کتنے مزید کس کس کی کوکھ میں بھر چکے ہیں۔ بھلا کوکھ کو ملکیت کا دُکھ کیوں عطا ہو گیا۔ گیلی گوری کی تھیلی جیسی یہ میلا جات سب سمیٹ لیتی ہے کسی کو بھی زشت ترش کہہ کر جھٹکتی کیوں نہیں۔ حالانکہ انتقام لینے کو ہی تو وہ ظالم اپنی اولاد گروی رکھ جاتے ہیں لیکن بیاری جس نام پر تھوکتی ہے اسی کا تھوکا ہوا چاٹ چاٹ کر پالتی ہے۔

آج بھی وہ ایک بڑا ایک بھر کر بھر لا رہی تھی کہ اُسے علم تھا کہ ان تین چار جھتوں میں اس کے چاروں بچے کتنے پھل پھول چکے ہوں گے۔ جب تھالی میں بھات ختم ہونے کے بعد چپچپاتی ہوئی انگلیاں چاٹتے چاٹتے بوسیدہ چٹائی پر سو جائیں اور تھوڑی سے بدن رات بھر پھیلتے نہیں سکڑتے ہوں اس خوف سے کہ اس ننھی بھر جھونپڑے میں اگر ٹانگ کی سلاخ دوسرے کی پسلی کے چھاج سے ٹکرا گئی تو نجانے کتنی تیلیاں ٹوٹ جائیں گی۔ مچھلیں، جونڑوں، نالوں کی گدلی سطح پر پھسر کر سوتے مچھر ان جھونپڑوں میں آگئی بھوک میں سے بھی اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں۔ سوکھی ٹانگیں، موٹے سر اور باہر کو اُٹھے ہوئے پیٹ، مچھروں کی ہم شکل یہ مخلوق اپنا پیٹ کہاں سے بھر کے دھان تو باڑھ میں بہہ جاتے ہیں اور باپ نشے میں نجانے کن اجنبی سڑکوں کے ہجوم میں گم ہو جاتے ہیں۔

اسٹیمر اب رفتار پکڑ چکا تھا۔ سچ دریا پانی بتدریج شفاف ہو رہے تھے جھاگ برف سا گاڑھا اور سفید تھا۔ جس کی اچھال کے پیچھے نواب سلیم اللہ خان کے محل کی بلند محرابیں دھندلا رہی تھیں۔ جس کے برجوں اور دروں پر لکھے ہوئے سیاہ بنگلہ دیش کی آزادی کی داستان اس انجن سے سن رہے تھے جو ایک ہاتھ میں پکڑے ایک ری لائی تقریباً بار بار دہرا رہا تھا، جس کے سامنے لگے نشست میں بچھی ساری کرسیاں خالی تھیں۔ بوڑھی گنگا پر تنے طویل پل کے نیچے معمولی سی کچھ بھی تختے سے قاصر تھے اور موٹے موٹے ہندو بیٹھا ریل اور کیلوں کے ڈھیروں پر بیٹھے بانس کی تیلیوں جیسی پسلیوں والے اور چارخانہ لنگوٹوں والے کالے بھجنگ بنگالیوں کی پشت پر دھاریاں اُبھری ہوئی تھیں۔ مقرر کہہ رہا تھا آج کے دن بنگال آزاد ہے۔ بنگالیوں نے یہ آزادی بہت قربانیوں کے بعد حاصل کی ہے کتنے برسوں ہمارا لہو پاکستانیوں نے چوسا ہے ہمارے بھائیوں کا خون بہایا ہے ہمارا چیز چار کیا ہے لیکن اب ہم آزاد ہیں اور ترقی کر رہے ہیں۔۔۔

روہی نے سوچا: یہ کیا کم ترقی کی ہے کہ آزادی کے بعد یہاں پلاسٹک ہے یہاں تو یورپ کو بھی حاصل نہیں ہے کنڈوم کی مشینیں مفت لگی ہیں جتنے چاہو بیگ میں بھر لو اگر پھر بھی پھنس جاؤ تو این جی اوز پیریڈ ریگولر کرنے کو جگہ جگہ کیمپ لگائے بیٹھی ہیں۔

ملک کی آزادی کے بعد عورت کو بھی آزادی ملی ہے کہ وہ مرد کی غلامی سے نجات پاگئی لیکن یہ کیا کہ پیٹ کی غلامی میں جکڑی گئی۔ بے باپ کے بچوں کی زنجیروں میں بندھ گئی جن کے پیٹ کی آگ بچوں کی جدائی کی سلگن نے اور بڑھا دی ہے جسے میلا نجانے این جی اوز بھی سرد نہیں کر پاتیں۔ یہ میلا تو جیسے دل کے ریشے چھیل چھیل بہت ہی کڑی دن کی گدھ دی ہو اور پھر اسے گنگا کے آلودہ پانیوں میں پھینک دیا گیا ہو گلنے سڑنے ٹوٹنے اور راکھ ہو جانے کے لیے۔ نجانے یہ کوکھ کیوں سمیٹ لیتی ہے اپنے اندر ہر نیا دن، ناپسندیدگی، نامردی، مجبوری کو تخلیق بنا ڈالتی ہے اسے پسند، ضرورت یا خواہش کا اختیار کیوں نہیں ہے۔ یہ فطرت بھی عورت کے ساتھ زیادتی کر جاتی ہے۔ وہ ڈھاکہ کی سڑکوں پر چارخانہ دھوتیوں میں ستر لپیٹے سائیکل رکشہ کھینچتے سوکھے سڑے بنگالیوں کو دیکھتی تو سوچتی پتہ نہیں کہاں کہاں چھوڑ آئے ہوں گے اپنی اپنی غلاظت کس کس کوکھ کو پابند کر کے خود آزاد اور لاپروا گلی کوچوں میں نکل جائے نہ اُگل کر اپنی ماں بہو جیسے خود کی ہی کاشت چھانٹ کرنے کی آزادی تو لی لیکن اس دل کی تیلیاں وجود کے پت رکوکھ لگائی کیوں رہتی ہیں۔۔۔

اسٹیمر یک دم ہچکولے کھانے لگا۔ شاید کیلوں یا بہت ہی کی گلی سڑی کا نعش تہ سے اُبھر کر پہیوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اسٹیمر کے نچلے حصے میں مال ریل بھرے تھے۔ دوسری منزل میں انسان ٹھسے تھے اوپر کی منزل میں بنے چھوٹے چھوٹے کیبنوں کو تالے لگے تھے۔ پتہ نہیں کس میں کیا بھرا تھا پھر بھرنے کو بھی خالی تھے اُسے خود سے ان کی مماثلت لگی۔ منہ بند چھوٹے جیسے نجانے کتنا سوا بھرا ہو اندر بظاہر خالی خالی دماغ جیسے۔ تالا زدوں کے ذرا ہی صدری پہنے گھٹنوں سے ذرا نیچے چارخانہ دھوتی باندھے ملاح کشتیاں اور کینو کھے رہے تھے بیچ دریا اسٹیمروں اور بوٹوں سے چھٹے خالی پیٹ بلبلوں سے ملی تھی جن میں مچھلیاں اوندھے منہ غوطے لگاتی تھیں۔ ملاح گیت گاتے اور مسافر عرشے پر رقص کرتے تھے۔ اسٹیمروں کی بالیوں سے غلیظ سیاہ پانیوں کی جھاگ چھنٹی جیسے خوفناک تاریک جبڑوں میں سارے اسٹیمر بوٹیں کینو کشتیاں اور ناؤئیں نگل جائیں گے۔ روہی کو لگا اُس کی سوچیں بھی ویسی ہی پراگندہ ہو کر جھاگ اُڑانے لگی ہیں۔ اُس نے بغل میں پڑی اپنی پوٹلی کو ٹٹولا۔ سلے بسکٹ ہوا ڈپھوڑتے رہی۔ کچھ ہرا اور سیاہ نالے۔ جن کی بو کمک سیاہ کیچڑ پانیوں میں بہتی غلاظتی اوور کے نیچے کی سرنگ میں بھرے تھیوؤں کے گم مردہ جسموں کو چارخانہ دھوتیوں اور پھٹی شرٹوں والے نحیف نزار مزدور سلا گئے رہے تھے۔ کیلوں اور ڈاب کی ناشیں مثل مال ریل کے ڈھیروں سے ٹیک لگائے بیٹھے موٹے موٹے ہندو بیٹھا بھی بھولے ہوئے بیٹھے یوں میں اُسے اپنا تیسرا شوہر رمیش نظر پڑا اُس نے حقارت سے تھوکا جو بلبلے بھری پانی کی کثیف تہہ میں کہیں جذب ہو گیا اور رمیش کے ہم شکل بیٹے کی یاد میں وہ کراہی وہ چاروں بچوں میں سے زیادہ تنومند گردن اور کھلے ہاتھ پیر والا تھا۔ رمیش کی نفرت اس تیسرے بچے کی شباہت میں روہی پر کلبلائی تو وہ تلملا کر

فس دی۔ منظر بدلتے رہے۔ سرسبز رنگ کھیتوں کو بجلیوں سے پمپ کر کے پانی دیتے والے کسانوں میں اسے اپنے پہلے شوہر کی شبیہ دکھائی دی۔ نشے کی لت سے پہلے وہ ایسے ہی بنا آستینوں کے صدری پہنے اور چارخانہ دھوتی گھٹنوں سے اوپر کسے دو بیگھہ کاشت کرتا اور اس کے جھونپڑے میں باڑھ کے دنوں میں دھان بچا رہتا۔ اس نے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی شکنتلا کی پسلی کے گھیر کو شلپا کی تے سے ذرا پرے کھسکایا۔ شلپا کی اپنے دوسرے شوہر سے جلیبی کو سال سے اوپر ہو چلا تھا لیکن یہ آج ستلاری تھی۔ دولی نے شکنتلا کی ریشمی پسلی کو پہلوؤں میں مسلا "اتا کو تو کو دے۔"

"اری خود کہاں چڑھا مالکن نے دیا۔"

شکنتلا نے بوڑھی گنگا کے کثیف پانیوں میں بہتے بجروں میں کیلوں اور گلے ہوئے ناریل کو کھوتے ہوئے دیکھا، جیسے ابھی پر سوار ہو۔ "اس بار کتنے چڑھے۔"

"اری کیا چڑھنا، دو ہزار ٹکے سے ملتا ہے۔ ویٹ پر جانے کی چھٹی بھی مالکن ہفتہ بھر میں ایک بار ہی دیتی ہے۔ اس میں کتنا کما لو بھی دو چار سو ٹکے۔ اس میں سے بھی مستری سے چوکیدار تک کتوں کے منہ بند کرنا ہوتے ہیں۔"

"جب مال زیادہ ہوگا تو دام بھی ایسا ہی لگے گا۔ کبھی تو اٹھ کر ڈھاکہ چلی آئی ہیں جیسے باقی سارے بنگال میں تو بھکر سے بستے ہوں۔"

درگا دیوی نے اپنے موٹے موٹے ہونٹوں کو چبا ڈالا جیسے ان نوجوں کو چبا رہی ہو جنہوں نے ڈھاکہ کا مستری دیکھ لیا تھا۔ کتنی کسمپرسی زادی تھی کہ وہ جو خود اپنا اڈا چلاتی تھی آج کسی بنگلے میں برتن مانجھتی تھی۔

"ابھی آزادی کی بنگال کو ساری ہی دھند سے پر لگ گئیں۔ بھوک کی برداشت ہی ختم ہو گئی۔ پابندی تھی تو بھوک بھی کم ستاتی تھی۔ آزادی کیا ملی ہر ایک پیٹ کے بدلے لٹکنے لگی، پھول تو مال دیکھ کر ہی لگتا ہے۔"

کسی نے کھلانے والا زرد ڈبہ نمبری کا پانی رومال سے جلا کر کندھے پر پھینکا۔ سخت گندے آٹے کی سی رنگت والی پیٹ کی پلیٹ میں دھری ناف کی تھلی آ ٹکا کا دبایا۔ اشٹیمر میں موجود مردوں نے آنکھیں جھپکائیں اور چلا گئے۔

"آ ہا ہا آ کر بھالو باشی۔"

دولی کی ملاقات ہر چار چھ مہینے بعد ان بھی عورتوں سے اسی اشٹیمر میں ہو جاتی تھی۔ سب کی رام لیلا ایک۔ دو تین شوہر چھوڑ چکے ہیں۔ رکھے کی تلاش ہے تو کوئی ایک پر تلاش اب چھوڑ چکی ہیں۔ کئی شوہروں کی نشانیاں دور کسی گاؤں میں پٹ سن کے گھاس پھونس سے بنے جھونپڑے میں نانی کے پاس پل رہے ہیں کہ نانی کو کھانا چھوڑ گیا ہے۔ چھ شوہروں کی نشانیاں رکھنے والی سروجنی نے اپنی دھوتی نالی دار ملی مکھری ساڑھی کے بیچ کوٹ کے اندر سکی تھیلی کو باہر نکالا۔ "یہ لگے آخر چار چھ مہینے ان چھ کا پیٹ کیسے بھر پائے گے۔ اب تو دعوت بھی نہیں ملتی۔"

اس نے ماتھے کو دونوں ہاتھوں سے دھپ دھپ پیٹا۔ اری لگتا ہے اب تو بھیک ہی مانگنا ہوگی۔ یہ بنگالی سنتو بڑے کنجوس ایک ٹکا بھی تمیں پاؤں پر بجا کر دیں۔" سروجنی کی بنگالی آنکھوں کی بجھی جوت سے آنسوؤں کے گچھے ٹپ ٹپ چلے۔ کبھی یہی شلپا کے ہم شکل ہونٹ اور ناریل کے پیالوں سے رسیلے لب بازار میں پوری قیمت پاتے تھے۔ شاید زیادہ کے لالچ میں اچھا مال جلدی جلدی میں اٹھ گیا اور اب وہ گلشن نو کے ایک جدید فلیٹ کے باتھ روم صاف کرتے ہوئے کتنی بار پھسلتی دیوار کا سہارا لے کر کمر کے درد سے کراہتی اور اپنے چھ شوہروں کو کثرت سے بھی زیادہ غلیظ گالیاں بکتی جو اس کی ہڈیوں کا سارا گودا چاٹ گئے تھے۔ اب یہ بے رس دودھیری خشک بڑیاں کسی فٹ پاتھ پر بھیک مانگنے کو ڈال دی جائیں گی۔

اشٹیمر کی گھر گھراہٹ میں سروجنی کی کراہیں دب گئیں۔ یہ آج اشٹیمر میں ہنگامہ سا کیوں ہے۔

کسی مرد نے جواب دیا۔ "سوراج ڈے ہے آج۔"

آج بنگال نے پاکستان کے مظالم سے نجات حاصل کی تھی کیونکہ وہ بنگال کے پٹ سن کا سارا سونا، ناریل کا سارا تیل، سارا دھان بھات چھین کر لے جاتے تھے اور کہیں پٹ سن کی رسیاں بٹتے، کیلوں کے گچھے توڑتے اور باڑھ میں ڈوبنے کو چھوڑ جاتے۔ لیکن اب یہ سب کون لے جاتا ہے۔ گھاس پھونس کے جھونپڑوں کے ننگے باڑھ کے سامنے اتنے ہی بے بس ہیں جتنے پاکستان کے راج میں تھے۔ بھات کی تھالی اتنی ہی خالی ہے جس میں کتنے ہاتھوں کی انگلیاں یکبارگی ڈوبتی ہیں اور تھیلی کے پیالے میں چند چاول ہی بھر پاتے ہیں۔

دھکا کھا کر اشٹیمر کی چینی بڑھی۔ سروجنی نے اشٹیمر کو کئی گالیاں بکیں دبکے سے دوہری ہوئی کمر کی ہڈی کو سیدھا کیا۔

"ارے کیا سوراج ڈے کتنی امیدیں تھیں بڑھاپے کا سہارا بنے گی۔ ادھر سولہویں سال لگا ادھر سنگل ہو گئی۔ پاکستان ہی بھی جانا آئی اور دیس کے دیش میں تو نہ جاتی۔"

کسی ہنسی تو سارے مرد اس کے قہقہے میں شامل ہو گئے۔

تھی جہاں پاکستانی کا مقصد وہی پاک سرزمین کا کانا۔

"وہی ایک پاک سرزمین والوں کی تھی کیا ہزاروں نے ورکنگ جسے جو آج سوراج ڈے منا رہے ہیں۔ یہاں کوئی سندھی کلچر کی کم بخت کے بکنے کو۔" سروجنی نہا بلاؤز کے ساڑھی کا کثیف پلو سر پر لپیٹ کر سسکیاں لیتی گئی اور سطر سارا بچی کو کوستے دیتی رہی۔

بوڑھی گنگا کے چھوڑ بہت دور دور ہو گئے تھے نواب سلیم اللہ کے محل کے بلند بالا ستون اور برج جہاں دھندلاہٹ میں گم ہو چکی تھیں۔ جہاں کبھی مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تھی جس نے پاکستان بنایا تھا اور جہاں موجود بنگالی مقرر سامعین کو بتا رہا تھا کہ بنگال کی آزادی کی پہلی اینٹ پاکستان بنا کر رکھی گئی لیکن یہ پاکستان بھی ہم پر انگریزوں کی طرح مسلط ہو گیا جس سے آزادی کے لیے ہم

نے وطن کے بھائیوں کی قربانی دی، جن کے خون سے رنگین یہ دھرتی آزاد ہوئی۔ اسٹیمر کے عرشے پر دیش بھگتی کے گیت گائے جا رہے تھے رقص کرتے ہوئے نوجوان آزادی کا جشن منا رہے تھے جن کے بڑوں کی اجتماعی قبریں شہید مینار میں بدل چکی تھیں۔ اسٹیمر کے عرشے سے شہید مینار کی بلند گون دکھائی دے رہی تھی جو بنگلہ دیش کی آزادی کی علامت تھا جس کے گرد گھاس سے ڈھکے بڑے بڑے قطعات پر Grave Yard کی تختیاں لگی تھیں یعنی یہ بنگلہ دیش کی تحریک آزادی میں شہید ہونے والوں کی اجتماعی قبریں تھیں۔ شہید مینار کے گرداگرد چاروں طرف جھیلیں بنی تھیں جن کے گدلے پانیوں میں جابجا شاپلا کھلے تھے۔

شہید مینار کے نکونے ستون نظر آتے ہی آزادی کے نعرے پرجوش ہو گئے۔ شراب کی بوتلوں کے ڈاٹ کھل گئے۔ گنگا کی سطح پر بکھرے اسٹیمر اور ناؤوں پر برقی قمقموں میں کتنے رنگ جھلملا رہے تھے جیسے پانی کے اندر آگ سی لگی ہو۔ جب ملاح اور مسافر خالی بوتلیں دریا میں پھینک کر آزادی کے نعرے لگاتے لڑھکنے لگے۔ کئی وہیں ادھ موئے ہو گئے۔ آج آزادی کی رات ہے۔ سروجنی نے تیل چپڑے کالے اور سیاہ چمکیلے بالوں کے جوڑے سے ساری پلو والی ساڑھیوں میں ملبوس عورتوں پر نظر کی۔ آج پانچ سو نہ سہی ہزار تک ضرور بن جائے گا۔ کبھی لگتا ہے آئیں گے ایک ایک کے کان میں کچھ کہیں گے کبھی اتفاق میں سر ہلائیں گی کبھی قرار میں اور پھر چلو بانی پیچھے پیچھے نکل پڑیں گے۔

رات گنگا کے پانیوں جیسی سیاہ پڑ رہی تھی۔ اسٹیمروں کی روشنیاں حیرتھیں جیسے ستاروں بھرا آسمان پانی پر اتر آیا ہو۔

اب عرشے پر دھماچوکڑی کرنے والے نچلی منزل میں بیٹھی عورتوں کے کانوں کان گزرنے لگے۔ سب سے پہلے سروجنی اٹھ کے گئی اور فرسٹ کلاس والے کیبن میں گم ہو گئی جوان عورتیں تو بس ایک بلے میں ہی اپنی جگہیں خالی کر گئیں جیسے باڑھ کا ایک ہی ریلا پکی فصل بہا لے گیا ہو اور پھر یکدم ریٹ گر گئے اس تھرڈ کلاس کے کیبن میں عورتیں ناچنے والوں کی مسلی مسلی جسمی منڈے کی خبر دے رہی تھیں۔ اسٹیمر میں بیٹھی رہ جانے والی عورتیں اپنے گھروں کو جا رہی تھیں اور اپنی جمع پونجی میں جو اضافہ بھی ہو سکے اسے چھوڑنا نہ چاہتی تھیں اس لیے ریٹ مزید گر گیا۔ سو سودا طے کیے بنا ہی اٹھا اٹھا کر چلنے لگیں۔ دولی جس ناٹے قد کے آدمی کے پیچھے پیچھے چلی وہ اس کے دوسرے شوہر سے مشابہت رکھتا تھا وہ اس کے ساتھ کبھی نہ گئی لیکن یہ آخری پیشکش تھی ورنہ اسے رات پھر کیبن میں رہ جانے والی بوڑھی عورتوں کے خراٹے سن کر گزارنی پڑتی۔ نقصان صرف پیسے ہی کا نہ تھا اپنی ناقدری کا دکھ اس ایک رات میں اس کا کتنا رس نچوڑ کر ادھیل کے گھاس کی طرح کتنا خشک اور بدرنگ بنا جاتا لیکن ناٹے والے کیبن میں موجود شخص کو پہچان کے شعلے کی لپک نے اس خشک گھاس کو پکڑ لیا۔ وہ اس کا دوسرا شوہر ہی تھا جو اسے ڈھاکہ کی ایک مچھروں بھری کھولی میں سوتا چھوڑ کر چلا گیا تھا کیونکہ کچھ مہینے وہ اس کی بچی کو جنم دینے والی تھی اور کچھ وقت کے لیے بیکار ہو جانے والی تھی۔

اسٹیمر نے زور سے دھکا کھایا۔ شاید ریل کے کئی پودے غرق دیا تھے جو یکدم سیدھا پر ابھر آئے تھے۔ بخش اس سے یوں لپٹا جیسے برسوں کے بچھڑے پریمی اچانک کسی ایسے جزیرے میں مل گئے ہوں جہاں کی تمام آبادی کو کسی آفت نے نگل لیا ہو اور بس وہ دونوں ہی بچے ہوں۔ نفرت کی پوری طاقت سے دولی نے اسے پرے دھکیلا۔ وہ اس اچانک افتاد سے لڑکھڑا کر کیبن کے بند دروازے سے جا لگا۔ اسٹیمر کے انجن کا شور شب کی تاریکی میں خوفناک ہو کر گرجنے لگا اور ایک بار تو لگا کیبن کے سارے جوڑ جیسے کھل گئے۔ اس نے کیبن کی بند کھڑکی کے شیشے سے سر ٹکا کر جیسے خود کو اگباتی خوف کے حملے سے سنبھالا۔

"ویسے تو میں پانچ سو کا سوال کرتی ہوں لیکن آج سوراج کی رات ہے اس لیے ہزار ٹکا ہو گا۔۔۔ بول قبول کریں۔"

بخش زور سے ہنسا اوپر عرشے پر بجتے لاؤڈ سپیکر نے جیسے چیخ سی بن گئے تھے، جس میں اسٹیمر کے انجن کی آواز جیسے دھاریں مارتی گھل مل رہی ہو۔ تقریباً سارے کیبنوں کے بند دروازوں سے نسوانی اور مردانہ قہقہوں کی آوازیں چھت میں گھٹن پیدا کر رہی تھیں۔ بخش پھر دیوانہ وار آگے بڑھا "اری دولی تو قسم بھگوان کی کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تجھے۔ ہم آج بھی پتی پتنی ہیں۔ ہمارے درمیان طلاق تھوڑی ہوئی تھی۔ دولی تو آج بھی میری۔۔۔"

"تیری پتنی ہو گی تیری ماں، سودے کی بات کر ہزار ٹکا پھر دروازہ کھول کیبن کا۔۔۔"

بخش بے تحاشا پڑھ سا گیا۔ کیبنوں سے نکلتی مردوزن کی دبی دبی شہوت بھری آوازیں جیسے اسے نڈھال کر گئیں۔

"دیکھ کیسا اتفاق ہے آج یہاں کوئی بھی ایسا نہ ہو گا جو اپنی ہی پتنی کو لے کر آیا ہو۔ پر چل تیری مرضی۔۔۔"

بخش نے جیب سے نوٹوں کی گڈی کا کونا ابھارا "لے تو بھی پی۔"

"دولی نے بوتل پر ہاتھ مارا مجھے مت بہکا، مطلب کی بات کر ورنہ دروازہ کھول۔۔۔"

بوتل گری تو فرش پر سر سر جھاگ سی اٹھنے لگی۔

بخش کھڑا ہوا ٹوٹی ہوئی بوتل کو پیر مار کر اوپر اچھالا جھاگ بھرا پانی دولی کو بھگو گیا اس کے پچکے گال لالی مارنے لگے۔

"اری تو تو بڑی گھنی ہو گئی ری۔۔۔ یہ پکڑ گن لے پورے دس نوٹ ہیں۔۔۔ اب میرے بچے کا بول۔ یہ تو مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ لڑکی ہوئی ہے اب اتنی تو ہو گئی ہو گی۔"

بخش نے دونوں بالشت جوڑیں اور پھر بوتل کا ڈاٹ بک کر کے اٹھایا۔ جھاگ کا قطرہ اچھل کر دولی کی آنکھ میں آنسو سا اٹک گیا اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ بنگالی رس گلے سے ہونٹ رسنے لگے۔

بچے کا نام زبان پر مت لا تیرا کیا لگتا ہے سالے یہ کہہ کر دولی نے دس

نوٹ اُچک کر بیگ میں دھکیلتا لگایا——

"چپ کر کے گاہک بن اور اپنے پیسے پورے کر باپ کا انگ نہ کر مجھے اور بھی کئی کام ہیں۔" بنٹی کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں سب بند ہو گیا نوٹ بھی اور لڑکی بھی بس دولی سامنے تھی۔ اس نے بوتل دولی کے منہ سے لگائی۔

"یہ تو پی مجھے یاد ہے تو پی کر ہی مست ہوتی ہے ورنہ کھانے کو دوڑتی ہے" بنٹی نے بیئر کھول کر جھاگ اچھالی جو کیبن کے دودھیا بلب کو ڈھک گئی۔

"لے اب تو مجھے کاٹ لے مجھے——"

برانڈی کے کئی گھونٹ دولی کے تنگ حلق میں اتر گئے تھے اور اس کے بوسیدہ تھکے ہوئے جسم میں اک تازگی اور قوت آ گئی تھی۔

رات کالی تھی لیکن جشن آزادی کے قمقمے پورے اسٹیمر کو شہرِ چراغاں بنائے ہوئے تھے۔ تھرڈ کلاس کے کیبن میں رہ جانے والی عورتیں اونگھ گئی تھیں اور انہیں دیکھنے کو اب وہاں کوئی گاہک نہ بچا تھا۔ کیسی بدبوداری تھی۔

"کیسی آزادی ہے کہ میلا کا ارمان ہو رہا ہے ہمارا کار ہو گئیں جو کل تک—— پاکستانی فوجیوں سے بھی گلے ملے کرتی تھیں یہ کیسی سوراج ہے کہ اپنے ہی دھتکار رہے ہیں۔" وہ منہ پر ساڑھیوں کے پلو ڈالے کبھی روتیں کبھی بین ڈالتیں تو کبھی خراٹے لینے لگتیں۔ جو سب اسٹیمر کی گھڑگھڑاہٹ میں کہیں لپٹ جاتا۔

بوڑھی گنگا کے پانیوں میں رات گھل گھل کر ڈھل گئی تھی۔ کثیف پانیوں کی ساری آلائشیں تہہ میں اتر چکی تھیں۔ سطح آب پرسکون تھی۔ سورج سنہری گلابی متالی رنگ لہروں پر بکھیر رہا تھا۔ جس کی ننھی ننھی گلابی کرنیں پیالوں سے بھنوروں میں بھر رہی تھیں۔ دریا کے کنارے کیلوں کے ڈنٹھلوں ناریل کے چھلکوں اور سیاہ کیچڑوں سے بھرے تھے۔

اسٹیمر لنگر ڈال چکا تھا۔ کشتیوں کا جھولتا ہوا پل تختوں اور کھمبوں سے ملا تھا—— جس سے مسافر بیچ بیچ کر گزر رہے تھے۔

اب اسٹیمر کو سرف مل مل کر رات بھر کے جشن آزادی کی کثافتیں دھوئی جا رہی تھیں۔ دولی پر سرف ملے پانی کی بوچھاڑ پڑی تو وہ ہڑبڑا کر جاگی۔ اسٹیمر دھونے والے تھے۔

"اری تو ابھی آزادی کا جشن ہی منا رہی ہے۔ دُنیا اپنے گھروں کو بھی پہنچ گئی۔" اس نے ہڑبڑا کر اِدھر اُدھر ہاتھ مارا۔ بنٹی کے کپڑوں اور پیسوں والا بیگ کھانے کی اشیاء والی پوٹلی، دونوں چیزیں یکدم گم تھیں۔

"بنٹی"

اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ بوڑھی گنگا کے آلودہ پانیوں میں آلائش بن کر کہیں تہ میں اتر گئی۔ جہاں آزادی کے دن کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔

## نذرِ ڈاکٹر مظفر حنفی

انیس عظیم آبادی (کرہٹی کولکاتا)

اقدار کی پہچان بچائے رکھا
تعلیم کا عرفان بچائے رکھا
تولا نہ کبھی خود کو مظفر زر سے
اس دہر میں ایمان بچائے رکھا

تعلیم کے زیور سے سجانا تیرا
جینے کی صحیح راہ دکھانا تیرا
دنیا میں نہ جب ہوگا تیرا تن حنفی
ڈھونڈے گا ہر اک شخص ٹھکانا تیرا

اسلوبِ سخن فن میں ہے ندرت تیری
ہر صنفِ سخن پہ ہے قدرت تیری
افکار کے اظہار میں رغبت ایسی
ہر شخص کو بھا جاتی ہے رنگت تیری

ہر سمت سے گو تجھ پہ تنقید ہوئی
جو بات کہی تو نے تردید ہوئی
پھر بھی ترے شعروں کی خوشبو نہ گئی
ہر گام ترے فن کی تائید ہوئی

مانا کہ قبائل میں ہیں ممتاز نہیں
انداز سخن قوتِ پروانہ نہیں
تنقید سے آلودہ نہ کر حسنِ ہنر
یہ علم خدا داد ہے اعزاز نہیں

○

# بے باق

یٰسین احمد (حیدرآباد دکن)

میرا ایک پاؤں زمین پر تھا۔

دوسرا پاؤں زمین کے اوپر۔۔۔۔ چھ سات انچ کی بلندی پر جیسے معلق ہو کر رہ گیا تھا۔ پاؤں نیچے رکھتا تو گستاخی کا مرتکب ہوتا۔ کیونکہ میں نے اس مہاتما کی تصویر دیکھ لی تھی جس نے ہم کو آزادی دلائی تھی اور ہم نے اس آزادی کی مٹی پلید کر دی۔ جس نے ہم کو عدم تشدد کا گُر سکھلایا تھا اور ہم تشدد پر اتر آئے۔ اس کے علاوہ ہلکے سرخ رنگ کا وہ کاغذ کا ٹکڑا بھی عزیز تھا جس کے وجود سے ہماری زندگی میں رنگ و نور ہے جس سے ہمارے پیٹ کی آگ بجھتی ہے ہمارے تن کو کپڑا میسر آتا ہے، جو ہماری طاقت ہے اور کمزوری بھی۔۔۔۔!

میرے دوسرے پاؤں کے نیچے ایک ہزار کا نوٹ پڑا ہوا تھا۔

میں رکوع کے انداز میں زمین پر جھکا اور بڑی پھرتی سے ہزار کا نوٹ اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس عمل سے گزرتے وقت نہ میں جھجکا اور نہ شرمندگی کا احساس میرے اندر بیدار ہوا تاہم دیر تک میں وہیں کھڑا رہا کہ اس نوٹ کا کوئی وارث آ جائے تو نوٹ لوٹا دوں۔

نوٹ جیب میں رکھتے وقت مجھ کو کسی نے نہیں دیکھا تھا، اس کا مجھے یقین تھا اور دیکھتا بھی کون؟ وہاں جتنے لوگ نظر آ رہے تھے وہ سب مصروف تھے یہ وہ لوگ تھے جن کو دولت کی فراوانی، بےفکری اور آرام طلبی نے بدوضع بنا دیا تھا اور وہ سب ہوا بھرے غبارے بن گئے تھے، راتوں کو خواب آور گولیوں کا استعمال کرتے اور صبح صبح چہل قدمی کے لیے نکل جاتے۔ ان کے ساتھ ان کا کتا ہوتا، زنجیر تھامے کتے کے پیچھے پیچھے وہ دوڑتے رہتے۔ جن کے پاس کتا نہیں ہوتا، ان کی بیوی ہوتی، جن کے ساتھ کتے نہیں ہوتے بیویاں نہیں ہوتیں وہ اپنا کوئی نہ کوئی ساتھی ڈھونڈ لیتے کہ تنہا چہل قدمی بے مزہ ہوتی ہے کوئی ساتھی ہو تو چہل قدمی کا مزہ دوچند ہو جاتا اور دیر تک چہل قدمی جاری رہتی ہے۔

میں نے اپنی چہل قدمی بند کر دی اور وہیں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ نوٹ میری جیب میں تھا، میں نے جیب پر اپنا ایک ہاتھ رکھ دیا تھا، خدشہ تھا کہ کہیں نوٹ ایک پنچھی بن کر ایک تتلی بن کر میری جیب سے اُڑ نہ جائے۔ لیکن نوٹ اُڑا اور نہ کوئی دعوے دار آیا ہوا۔ لیکن اب میرے اندر کئی سوالات شور مچانے لگے تھے کہ ہزار کا نوٹ کا کیا کیا جائے؟ کس طرح اور کہاں خرچ کیا جائے؟

تیس دن تک صبح سے شام تک سخت محنت کرنے کے بعد جو تنخواہ ملتی اس کو پہلا ہفتہ کے دن بنیادی ضرورتوں کا اژدھا ایک ہی جھٹکے میں ہڑپ کر جاتا تھا۔ کبھی اتنی فاضل رقم نہیں بچتی تھی کہ تفریحات کی سوچتی۔ مگر آج غیر متوقع رقم ہاتھ لگی تھی۔ جس کو میں تفریحات پر صرف کر سکتا تھا۔ دوستوں کے ساتھ گل چھرے اڑا سکتا تھا۔ کسی شاندار ہوٹل میں [illegible] لے سکتا تھا۔ کسی سنیما ہال میں فلم دیکھ سکتا تھا۔ کلب میں بیٹھ کر رمی کھیل سکتا تھا یا پھر۔۔۔۔؟ جو پیسہ اچانک اور محنت کے بغیر ملتا ہے وہ ایسے ہی کاموں میں تو خرچ کیا جاتا ہے جس پیسہ میں محنت کے پسینہ کی بو کی آمیزش نہ ہو وہ پیسہ بے دریغ خرچ ہو جاتا ہے۔

لیکن اب میں کسی منطق میں الجھنا نہیں چاہتا تھا، جو نوٹ ہاتھ لگا تھا اُسے اپنی ذات پر خرچ کرنا چاہتا تھا اور نفس کی سننا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی نفس کی فتنہ سامانیاں اچھی لگتی ہیں، اس سے زندہ رہنے کا احساس روشن ہو جاتا ہے اور آج میں اس احساس کو روشن رکھنا چاہتا تھا۔ آج میں تو جیسے فضا میں اڑا جا رہا تھا۔ مگر پنچایت راج کا ایک سینئر کلرک اب انل امبانی بن گیا تھا۔

اس دن میں آفس نہیں گیا۔

یکسوئی اور اطمینان سے بیٹھ کر آج کا پروگرام بنانا چاہتا تھا کہ اتنے میں نعیم فاروقی کا فون آ گیا، میرے لکھنے پڑھنے کے سارے کام جو کمپیوٹر سے جڑے ہوئے ہیں یا اس کو نعیم فاروقی انجام دیتا ہے۔ شہر بازار کی ایک چھوٹی اور تنگ جگہ میں وہ صبح سے رات تک رزق کی جستجو میں بیٹھا رہتا ہے۔ ایک عدد جوان ہوتا ہوا بیٹا اور تین عدد بڑھتے ہوئے کمپیوٹر نعیم فاروقی کے معاون ہیں۔ میں نے کبھی اس کے چہرے پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ شادابی کے وہ رنگ بھی نظر نہ آئے جو خوشحالی کی دین ہوتی ہے۔ میں نے اس کو دیکھ کر اکثر سوچا ہے کہ محنت کے سوا اور چیز بھی ہوتی ہے جو انسانوں کے چہرے سے تازگی اور بشاشت [illegible] ہے ورنہ تعمیراتی کاموں، کارخانوں، ریلوے اسٹیشنوں اور بازاروں میں جتے ہوئے مزدوروں کے جسموں پر چیتھڑے نہیں جھولتے۔

نعیم فاروقی سے گفتگو کے دوران اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں نے فوراً اُس سے پوچھا۔ "فاروقی جی! اگر آپ کو کہیں سے اچانک ایک ہزار روپے کا نوٹ مل جائے تو آپ کیا کریں گے؟"

"ایک ہزار!" میں نے محسوس کیا کہ فاروقی کی آواز میں لرزش آ گئی ہے جیسے حقیقتاً ایک ہزار کا نوٹ اس کی جیب میں آ گیا ہو۔ کچھ لمحوں کے توقف کے بعد اس کی پرجوش آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "ہم لوگ عموماً 2.5% کے حساب سے زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ اگر مجھ کو ایک ہزار روپے مل جائیں تو دس فیصد روپیہ محتاج لوگوں میں بانٹ دوں گا اور باقی کی رقم سے اپنے بچوں کی فیس ادا کروں گا۔ آپ جانتے ہیں اس مہینے میں اسکولوں میں فیس اور ٹرم فیس کتنی سختی سے وصول کی جاتی ہے۔"

نعیم فاروقی اداس ہے۔ بچوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔ خون پسینہ کی گاڑھی کمائی لگانے کے باوجود ہماری اولاد تعلیم سے کترا رہی ہے اور وہ مال غنیمت کی رقم سے بچوں کو کیا تعلیم دلا سکے گا؟ آج ہم صرف تعلیم ہی نہیں، ہر میدان میں دنیا کی اور قوموں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ہمارے اسلاف نے ساحل پر اترنے کے بعد کشتیاں جلائی تھیں۔ ہم نے تو روانگی سے قبل ہی اپنی کشتیاں پھونک دی ہیں۔ فاروقی کی بات میرے حلق سے نہیں اتری۔

یکایک مجھ کو سلمیٰ کا خیال آیا جو میرے آفس میں کمپیوٹر آپریٹر تھی۔

اُس کی مخروطی انگلیاں جب ہارمونیم پر تھرکتی تھیں تو لوگ اپنا دل تھام لیتے تھے
اُس کے سلونے چہرے کی دلاویز مسکراہٹ اور انداز تکلم دیکھ کر لوگ طرح طرح
کے خواب بنتے رہتے تھے اور وہ بھی ـــــ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کب کھلتی
ہے اور کہاں چھلکتی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا ”سلمیٰ! اگر ایک ہزار روپے
تمہارے ہاتھ میں آ جائیں تو تم کیا کرو گی؟“

”ایک ہزار؟“ سلمیٰ نے حیرت سے دہرایا اور پھر میں نے چڑیا کی
سی آواز سنی لیکن بلبلوں کے چہچہے کی صدا نہیں تھی۔ اس نے تو رسید چوم لیا تھا۔
میرے سارے جسم میں سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔ گھڑی بھر کے لیے مجھ کو ایسا لگا کہ وہ
جیسے ہوا میں سے نکل کر میرے قریب آ گئی ہے۔ اس کی سانسوں کی خوشبو اس
کے رخسار کی تپش میں اپنے چہرے پر محسوس کرنے لگا۔ وہ بولی ”ہم آج کی شام
ہلدات شہر سے دور کسی Resort پر گزار سکتے ہیں۔ تم نے کبھی اس زندگی کا
مزا چکھا ہے؟“

سلمیٰ کی بات کا کیا جواب دیتا۔ دس سال کی ازدواجی زندگی میں
ایک عدد بیوی اور تین بچوں کا باپ بن کر میں نے بہت بڑا تیر مار لیا تھا۔ کبھی اس
کنویں سے باہر نکلنے کا سوچ لیتا تو دیکھتا کہ دنیا کتنی وسیع ہے کتنی رنگین ہے۔
میری زندگی میں بیوی آئی تھی محبوبہ نہیں۔ حالانکہ جانتا تھا کہ جوانی محبوبہ میں
ہوتی ہے وہ بیوی میں نہیں ہوتی۔ بیوی ایک سمندر کی طرح ہوتی ہے جو گہرا ہے
اور بیکراں ہے لیکن پُرسکوت ـــــ اس کی بے تابیاں بھی ساحل سے ٹکراتی
ضرور ہیں لیکن بے آواز ـــــ اور محبوبہ تو ایک پُرشور دریا کی طرح ہے جس میں
سیلاب آتا ہے تو خود بھی فنا ہو جاتا ہے اور سامنے والے کو بھی فنا کر دیتا ہے۔

لیکن میں بھی اپنے وجود کو فنا کی نذر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر آج نئے
نئے دو چار سامنے آ رہے تھے جن کی وجہ سے میں ایک حیرت انگیز کیفیت سے
دوچار ہو گیا تھا۔ مجھے مزید کچھ ذہنوں کو ٹٹولنے کی سوجھی۔ میں نے اقبال رنگ
والے کو فون کیا۔

اقبال رنگ والا۔ رنگ بناتا اور رنگ بیچتا تھا۔ وہ رنگ نہیں جو
دروازوں، کھڑکیوں اور دیواروں کے کام آتے ہیں۔ وہ رنگ بھی نہیں جو مصور
اپنی تصویروں میں بھرتا ہے بلکہ وہ رنگ جو عورتیں اپنے ہاتھوں اور لبوں پر پھیرتی
ہیں۔ عورتیں رنگ کی رسیا ہوتی ہیں اور اقبال عورتوں کا رسیا تھا۔ عیاشی کا عادی تھا
مگر نکاح کا قائل نہیں۔ وہ تو ایسا آدم خور تھا جو گوشت کھاتا ہے اور ہڈیاں اُسی
مقام پر چھوڑ جاتا ہے۔

میں نے اقبال رنگ والے سے پوچھا ”اگر تم کو ایک ہزار روپے مل
جائیں تو کیا کرو گے؟“

”ایک ہزار روپے!“ میں نے اس کی تمسخر آمیز ہنسی سنی۔ ”تم ایک
ہزار کا یوں ذکر کر رہے ہو جیسے ایک چٹکی یا ایک ٹھوکا ـــــ موجودہ گرانی میں ایک
ہزار کی کیا اہمیت ہے کوئی اچھی ٹائی تو کیا گریبان مال بھی نہیں مل سکے گا۔ ہاں ایک
ہزار ڈالر ہو تو کچھ سوچا جا سکتا ہے۔“

”بات روپے یا ڈالر کی نہیں۔“ میں نے اس کو سمجھایا۔ ”میں تو
صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جو پیسہ مال غنیمت کے طور پر مل جاتا ہے اس کا تم کیا
کرتے ہیں۔“

اس نے میری بات ان سنی کر دی اور بولا ”ایک بات بتاؤں اگر
تم کو ایک ہزار مل گئے ہیں تو میری مانو کچھ اعلیٰ قسم کے شیڈس بھابی کے ہاتھوں
اور لبوں کے لیے خرید لو۔ کئی ماہ تک کام آئیں گے۔ بھابی بھی خوش اور تم
بھی ـــــ!“

اقبال رنگ والا جس ٹائپ کا آدمی تھا اسی انداز کا مشورہ دیا تھا۔
میں نے فون رکھ دیا۔ عین اسی وقت ہیری سنگھ کا فون آ گیا۔ ہیری سنگھ میرے ہی
آفس میں کام کرتا تھا۔ جونیئر تھا لیکن مجھ سے بے تکلف تھا۔ خوف خدا رکھتا تھا اور
خیال دنیا بھی۔ گلے گلے تک کسی برائی میں ملوث نہیں تھا لیکن کبھی سوچ ـــــ
لب چھوٹی چھوٹی کمزوریاں کس انسان میں نہیں ہوتیں۔ میں نے اس کو سارا ماجرا
سنایا۔ پہلے وہ ہنسا اور پھر بولا ”آج میرا بھی آفس جانے کا موڈ نہیں تھا۔ سوچا
تھا کہ آپ کے ساتھ دن گزاروں۔ بھگوان نے میری سن لی۔ آ جائیے۔ میرا آپ
کا اور پروگرام اچھا رہے۔“

ہم خیال لوگ بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ میں نے ذرا سا بھی تامل
نہیں کیا اور فوراً گھر سے نکل گیا۔ پروگرام کے مطابق آئی میکس سینما ہال پر ہیری
سنگھ میرا منتظر تھا۔ اس کے ساتھ ایک دوست حیدر مرزا بھی تھا۔ وہ تین درجے
کا ٹکٹ لے کر ہم نے انگریزی فلم دیکھی۔ وقفہ میں مشروب سے بھی شغل کیا۔
تین سوا تین گھنٹے آسانی سے گزر گئے تھے۔ فلم دیکھ کر باہر نکلے تو شام ہو رہی تھی
اور میری جیب میں ابھی چھ سو روپے موجود تھے۔

وہاں سے نکل کر ہم تینوں ہانگ کانگ ریستوران چلے آئے۔ ہانگ کانگ
ایک چینی ریستورانٹ تھا۔ چھوٹا سا لیکن نہایت ہی خوبصورت ـــــ کھانے بھی
بہت عمدہ ملتے تھے۔ اس ریستورنٹ کا مالک لی چانگ ہم سے واقف تھا۔ کبھی اگر
وہ ہم کو دیکھ لیتا تو بل میں دس فیصد کا ڈسکاونٹ بھی کر دیتا تھا۔

مینو ہیری سنگھ نے دیکھا۔ کھانے پینے کا آرڈر بھی اسی نے دیا تھا۔
کچھ دیر بعد ہماری میز پر ٹھنڈی بیئر اور جوس کے گلاس نظر آئے۔ جوس کا گلاس میری
جانب بڑھاتے ہوئے ہیری سنگھ نے کہا۔ ”آپ تو دوسری نعمتوں سے محروم ہیں!“

میں نے مسکرا کر جوس کا گلاس اٹھا لیا۔ ہم نے اپنے اپنے گلاس کو
ٹکرایا۔ چیئرز کی صدا بلند کی اور پھر آج کی شام اس ان دیکھے شخص کی نذر کی جس کا
نوٹ مجھے ملا تھا۔ مشروب کے بعد سوپ آ گیا اور پھر گرما گرم ذائقہ دار چینی
ڈشیں ـــــ ہم تینوں نہایت اطمینان اور فرصت سے کھانا کھاتے رہے اور
اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ باہر شام رات کی زلفوں میں اپنا چہرہ چھپا چکی
تھی۔ کھانے کا بل ادا کرنے کے بعد بھی چالیس روپے باقی بچ گئے تھے جو میں
نے ٹپ اور پھر ریستورانٹ کے باہر کھڑے ہوئے سیکورٹی کے نوجوان کی نذر کر
دیے۔ ہیری سنگھ اور حیدر مرزا کے چہرے گہرے سرور میں ڈوبے ہوئے تھے۔

باقی: صفحہ نمبر 86 پر

# باندرہ سگنل

دیپک کنول (ممبئی بھارت)

باولی کی سزا پوری ہوئی تھی اور اُسے جیل سے رہا کر دیا گیا تھا۔ اُسے اپنی رہائی پر خوش ہونا چاہیے تھا مگر وہ خوش نہیں تھی بلکہ بے حد اُداس اور پریشان تھی۔ جیل سے باہر آ کر اُسے باہر کی دنیا بڑی بے مروت اور بیگانی لگی۔ یہ وہی باولی تھی جو باندرہ سگنل پر بھیک مانگا کرتی تھی۔ یہ وہی باولی تھی جس نے اپنی چھاتیوں کی نمائش کر کے باندرہ سگنل پر ایک ہیجان پیدا کیا تھا۔ اُسکی اس فاش حرکت پر کئی معزز شہریوں نے پولیس میں جب شکایت درج کرائی تب جا کے پولیس جاگی۔ پولیس نے باولی کو پکڑ کر آٹھ گھنٹے تھانے میں بٹھا کے رکھا اور پھر اُس کی نہ صرف سرزنش کی بلکہ اُسے متنبہ کیا گیا کہ وہ آئندہ اس قسم کی حرکتوں سے باز رہے ورنہ اُسے جنسی جذبات بھڑکانے کے سلسلے میں اندر کیا جائے گا۔ باولی خود ان حرکتوں سے آزردہ اور پشیمان تھی پر وہ کس کو اپنے دکھڑے سناتی۔ یہ سب کچھ وہ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اپنی ماں کے کہنے پر کر رہی تھی۔۔۔ اُسکی ماں بدرن، ماں نہیں ڈائن تھی۔ وہ اپنے زمانے کی ایک بدکار عورت تھی جس کی بدمعاشی کے چرچے آج بھی بازاروں میں عام تھے۔ اُس نے اپنی بیٹی کو بھی اُسی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی جس پر وہ خود کبھی چلی تھی۔ یعنی بدکاری اور بدمعاشی کا پیشہ جسے اپنا کر وہ فخر و انبساط محسوس کرتی تھی۔

باولی اس ذلت بھری زندگی سے خوش نہ تھی۔ وہ اپنے آپ کو اُس چڑیا کی طرح محسوس کر رہی تھی جسے کسی ظالم صیاد نے پنجرے میں قید کر کے رکھا ہو۔ وہ اس پنجرے کو توڑ کر نکل جانا چاہتی تھی۔ بس اسی کشمکش میں وہ ایک اجنبی کے پیار کے جھانسے میں آ گئی۔ باولی کو لگا کہ اُس کی سیاہ زندگی کا اب خاتمہ ہو گیا مگر ہوا اسکے الٹ۔ اُسکا عاشق ایک دلال تھا جس نے اُس کے جسم کا سودا کر کے باولی کے یقین کا خون کر دیا۔ باولی جسم فروشی کے الزام میں پکڑی گئی اور تین مہینے کی سزا ہو گئی۔ اس حادثے نے اُسکی زندگی میں ایک طوفان لا کر رکھ دیا۔ اُسے مرد ذات سے بے انتہا نفرت ہو گئی۔

گو کہ اب وہ آزاد تھی مگر یہ آزادی اُسے کوئی خوشی نہیں دے پا رہی تھی۔ زندگی کی ایک بھول نے اسے کتنی مشکلوں سے دوچار کر دیا تھا۔ وہ اپنے گھر والوں سے بچھڑ گئی تھی۔ پتہ ڈال سے ٹوٹ جائے تو راہگیروں کے بے رحم پاؤں اُسے روندتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ آج وہ ایک اجنبی شہر میں اکیلی اور تنہا تھی۔ اُسے کوئی راہ نہ کوئی راہ رو نظر آ رہا تھا۔ وہ جائے تو کہاں جائے؟ اُسکی کوئی منزل نہ کوئی مقام تھا۔ آخر وہ کیا کرے کس سمت چلے۔ یہاں رہے گی تو پھر وہی بھوکی نگاہیں اُسے گھورتی، بھنبھوڑتی رہیں گی۔ وہ پھر گل جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ اُسکے ماتھے پر جو بدنامی کا داغ لگا تھا اُسے لے کر وہ یہاں کیسے جی پائے۔ مردار خور گدھ اُسکی بو سونگھ کر اُسے نوچنے چلے آتے۔ وہ اپنی اُس عزت کو کھونا نہیں چاہتی تھی جسے وہ اب تک بچانے میں کامیاب رہی تھی۔۔۔ آبرو تو موتی کی آب ہوتی ہے ایکبار آب اُتر گئی تو پھر بے آبرو ہو کے جینے کا کیا فائدہ۔

اُسنے بہت سوچا۔ عقل کے گھوڑے اِدھر دوڑائے اُدھر دوڑائے۔ انجام کار وہ اسی نتیجے پر پہونچی کہ اُسے اپنے ماں باپ کے پاس ہی واپس چلا جانا چاہیے۔ اپنا مارے گا تب بھی چھاؤں میں ہی ڈال دے گا۔ بس یہی سوچتے سوچتے اُسکے قدم ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگے اور وہ ایک چالو ٹکٹ لے کر ممبئی جانے والی ٹرین میں سوار ہو گئی۔ راستے میں وہ اپنے ماں باپ اور بھائیوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ کیا وہ اُسے قبول کر لیں گے؟ یہ سوال من میں اُٹھتے ہی اُسکے دل میں ہول سا اُٹھنے لگتا تھا۔ ماں سے وہ اتنی خوفزدہ نہ تھی جتنی خائف وہ اپنے باپ سے تھی۔ نورا جب کبھی آپا کھو دیتا تھا تو وہ شرافت کی ساری حدیں پھلانگ جاتا تھا۔ کئی بار وہ اُسکے ہاتھوں چار چوٹ کی مار کھا چکی تھی۔ ماں اُسے مارتی تو وہ اُسے مار ہی ڈالتا۔ مار کا خیال آتے ہی اُسکا بدن کانپنے لگا۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے۔ اُسنے گھبرا کر اپنے پسینے پونچھ لئے۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ جب دل کو یہ اطمینان ہوا کہ کوئی اُسکی طرف نہیں دیکھ رہا ہے تو اُسنے راحت کی سانس لی۔

وہ جب گھر پہونچی تو گھر میں کہرام مچ گیا۔ بھائی تو اُسے دیکھ کر خوشی سے جھوم اُٹھے جب کہ نورا اور بدرن ایسے سیاپا کرنے لگے جیسے انہیں باولی نہیں بلکہ باولی کی مرنے کی خبر ملی ہو۔ بدرن اپنی چھاتی پیٹتے ہوئے بولی۔

"ہائے ہائے آ گئی اپنا منہ کالا کر کے؟ مرنے چلی تھی تو لوٹ کے کیوں آ گئی۔ وہیں کہیں بیٹھ کر دھندہ کرلیتی تو ٹھیک تھا۔ یہاں آ کر اب ہماری چھاتی پر مونگ دلنے کا ہے کو آ گئی؟ اتنا دکھ دے کے بھی دل بھرا نہیں جو منہ اُٹھا کے پھر چلی آئی۔ ہائے ہو ولا اسے موت کیوں نہ آئی۔"

بدرن اُسے کوستے دیتی رہی اور وہ آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی لگائی رہی۔ نورا اس دوران سمندر کے پانی کی طرح بس کھولتا رہا۔ باولی تو اس انتظار میں تھی کہ نہ جانے کب باپ کا قہر اُس پر ٹوٹے۔ وہ تو بس اُسے غصیلی نظروں سے گھورتا رہا اور بیچ بیچ میں بیڑی سلگاتا رہا۔ جب بدرن کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو باولی نے روتے روتے ہاتھ جوڑ کے ماں سے کہا۔

"اماں ہم سے بھول ضرور ہوئی مگر ہم تم سے قسم کھا کے کہتے ہیں ہم نے اپنی آبرو کو داغدار نہیں ہونے دیا۔ ہماری عزت آج بھی اُتنی ہی پاک ہے جتنی یہاں سے جاتے وقت تھی۔ ہاں ایک خطا ہو گئی ہم سے۔ ہم ایک بھڑوے کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گئے۔ ہم کو لگا تھا کہ وہ سالا حرامی ہماری نیا پار لگا دے گا مگر وہ تو دھوکہ باز نکلا۔ ایکدم نیچ اور کمینہ سالا۔ وہ ہماری عزت کا سودا کر کے بیٹھا تھا مگر مولا نے ہمیں عین وقت پر بچا لیا۔

اس سے پہلے کہ اُسکا ایک منصوبہ کامیاب ہو جاتا اُس ہوٹل پر پولیس کا چھاپہ ماری ہو گئی۔ سارے بھڑوے اور دلّے لوگ گرفتار ہو گئے۔ اُس چھاپے میں ہم بھی آ گئے اور ہمیں بھی تین مہینے کی جیل ہو گئی۔"

نورا جیل کی خبر سن کر پہلے چونکا پھر اپنی بیٹی کی جانب ایسی تعریفی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے وہ سزا کاٹ کر نہ آئی ہو بلکہ کوئی اولمپک کپ جیت کر آئی ہو۔ بہت دیر تک بیدن چیخ چیخ کر روتی رہی اور باولی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ ایک نورا تھا جو شانت ہو کے بیٹھا تھا۔ کافی دیر کے بعد وہ بیدن کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

"صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آ جائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔"

باپ کے منہ سے یہ بات سن کر باولی نے چونک کر نورا کی طرف دیکھا۔ نورا جیسے چند پل میں ایک مہربان باپ کا روپ دھارن کر چکا تھا۔ دراصل پچھلے ساڑھے تین مہینے سے انہیں جس تنگی اور تکلیف سے گزرنا پڑا تھا اُس کی یاد آتے ہی نورا کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ دو دو لونڈے تھے مگر وہ دونوں کمانے کو بھیڑ اور کھانے کو شیر تھے۔ یہ باولی ہی تھی جس کی کمائی پر وہ ٹھاٹ کرتے تھے۔ اُسکے بھاگ جانے سے وہ نکمے کے نکمے ٹکے ٹکے کو محتاج ہو کر رہ گئے تھے اسلئے نورا نے جب باولی کو دیکھا تو اُسے لگا کہ سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ حالانکہ اُسے دیکھ کر پہلی نظر میں اُسکا پارہ گرم تو ہوا مگر پچھلے دنوں کی سختیاں یاد آتے ہی اُسکا پارہ فوراً اُتر گیا اور وہ اُسے پیار کرنے لگا جس میں دکھ اور افسوس سے زیادہ خوشی شامل تھی۔ باولی کو دیکھ کر تو اسے ایسا لگا تھا جیسا اُسے اُسکا کھویا ہوا خزانہ واپس مل گیا ہو۔

دو چار روز گھر میں تناؤ کا سا ماحول رہا مگر جونہی گاڑی پھر سے پٹری پر دوڑنے لگی نورا اور بیدن کے مرجھائے ہوئے چہرے پھر سے کھل اٹھے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ دودھیل گائے کی لاتیں بھی بھلی اسلئے نورا نے باولی کے سارے خطا معاف کر دئیے نہیں کرتے تو وہ پھر سے پائی پائی کے لیے ترستے۔ باولی پھر سے اپنے کام دھندے پر کیا لوٹی، نورا اور بیدا کی شامیں پھر سے رنگین ہونے لگیں۔ رات کو پھر سے گھر میں میاں بیوی کی جھک جھک شروع ہو گئی۔ باولی کو تو ان ساری چیزوں کی ایسی عادت ہو چکی تھی کہ اُسے یہ سب کچھ اب اپنی زندگی کا حصہ لگ رہا تھا۔ اگر وہ کسی دن اپنے ماں باپ کو لڑتے جھگڑتے ہوئے نہیں دیکھتی تو وہ حیران و پریشان ہو جاتی تھی کہ کہیں دو میں سے کسی ایک کی طبیعت بگڑ تو نہیں گئی ہے۔

ایک دن باندرہ کے سگنل پر ایک فلم ڈائرکٹر نے باولی کو دیکھا تو وہ اُسے اپنی آنے والی فلم "فٹ پاتھ کے شہزادے" کے ایک رول کے لئے بڑی موزوں اور مناسب لگی۔ وہ جب اُسکے سامنے جھک کر کھڑی ہوئی تو ڈائرکٹر اشوکن نے اُسکی چھاتیوں کو کم اور اُسکے چہرے کو بڑی باریکی سے دیکھا۔ اسکا یوں گھور گھور کے دیکھنا باولی کو بڑا عجیب لگا۔ اُسکی نگاہیں جیسے اُسے چبھنے لگیں۔ وہ بڑی گستاخ اور زبان دراز تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اُسے کھری کھوٹی سناتی اشوکن نے جیب سے ایک سو کا نوٹ نکال کر اُسکی طرف بڑھایا۔ باولی سو کا نوٹ دیکھ کر پہلے اُچھلی اور پھر پھٹی پھٹی آنکھوں سے نوٹ کو دیکھنے لگی۔ اس اثنا میں ہری بتی جل اُٹھی اور اشوکن گاڑی لے کر نکل گیا۔ باولی ابھی تک مبہوت کھڑی تھی۔ اُسکے اس طرح بیچ سڑک میں کھڑا رہنے کی وجہ سے کئی گاڑیاں رکی ہوئی تھیں اور وہ مسلسل ہارن بجائے جا رہے تھے کہ تبھی بنے اور ننھے اُسے بیچ سڑک میں سے فٹ پاتھ کی طرف کھینچ کر لے گئے۔ وہ بھائیوں کی طرف سو کا نوٹ لہراتے ہوئے بولی۔

"سو کا نوٹ دے گیا سالا۔ میرے کو یہ بھڑوا کوئی ٹھرکی لگتا ہے۔ رات کو چاٹی پالی ہو گی جو ابھی تک اُتری نہیں پاگلی ہے۔"

"میرے کو لگتا ہے کہ یہ تیرے کو دانہ ڈال کے گیا ہے دیدی۔ وہ تیرے کو نوٹ دکھا کر پٹانا چاہتا ہے۔ دیکھ لینا کل وہ پھر آئے گا اور تیرے کو پھر ایک ہرا نوٹ دکھا کے رجھائے گا۔ اس حرامی کے چکر میں مت آنا۔ تو اگر پھر سے بھاگ جائے گی نا تو ہم لوگ بھوکوں مر جائیں گے۔" بنے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

باولی نے بنے کو سینے سے لگا کر پیار کیا اور پھر اُسے ڈھارس دیتے ہوئے بولی۔

"میں ایک بار ٹھوکر کھا چکی ہوں۔ اب میں کسی کے بہکاوے میں آنے والی نہیں۔ یہ مرد سالے سب کے سب ایک آوے کے برتن ہیں۔ میں اب ان کی باتوں میں آنے والی نہیں۔ کوئی لاکھوں بھی دے تب بھی میں تم لوگوں کو چھوڑ کے نہیں جاؤں گی۔" یہ کہہ کر اُسنے بنے کو زور سے اپنی بانہوں میں بھر کر بھینچا۔ وہ بہت دیر تک اُسکو اپنے سینے کے ساتھ لگا کر بھینچتی رہی۔ اُسکی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ پاس کھڑا ننھے بھی اپنی آنسو روک نہ سکا۔ وہ بھی بہن سے لپٹ کر رونے لگا۔

اگلے روز ایک آدمی باولی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اُس ریسٹورنٹ تک پہونچا جہاں باولی اپنے بھائیوں کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کر رہی تھی۔ اُسنے جب باولی کو دیکھا تو وہ اُسے فوراً پہچان گیا۔ وہ خوش ہو کر اُسکی طرف لپکا اور اُسکے بغل میں بیٹھ کر بولا۔

"ارے تم یہاں ہو؟ اپن تم کو کدھر کدھر نہیں ڈھونڈا۔ سب بولے تھے کہ تم سگنل پر ملو گی۔ وہاں پتا چلا تم کرشنا ریسٹورنٹ میں بیٹھی ہو۔"

باولی نے پہلے اُسکی طرف حیرت و اضطراب سے دیکھا اور پھر تھوڑی دیر تک وہ خاموشی سے اُسکی باتیں سنتی رہی۔ اس بیچ اسکے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک رنگ جا رہا تھا۔ جب اُس نے اپنی بات پوری کی تو باولی نے بے چین ہو کے پوچھا۔

"پہلے میرے کو یہ بتاؤ کہ تم ہے کون اور ادھر میرے بغل میں کاہے کو بیٹھ گیا؟"

''میرا نام سدھاکر ہے۔ میں مشہور فلم ڈائرکٹر اشوین جی کا اسسٹنٹ ہوں۔ وہ ایک پکچر بنا رہے ہیں جس کا نام 'تخت یا تختہ کے شہزادے' ہے!''

''تو میں کیا کروں۔ تیرے جیسے ڈائرکٹری آسانی کا نام روز کیا۔ سالا جس کو دیکھو انگلی پکڑتے ہی پونچا پکڑنے لگتا ہے'' اُسنے بڑی رکھائی سے جواب دیا۔ اُسکا جواب سن کر سدھاکر خفیف ہو کر اپنا پسینہ پونچھنے لگا۔ اُسے یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ چھوکری پانچ ہاتھ کی زبان رکھتی ہے۔ وہ تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ چھوکری فلم کا نام سن کر خوشی سے اچھل پڑے گی اور اُسے سر آنکھوں پر بٹھائے گی۔ یہ تو اتنی بے مروت اور بدزبان نکلی کہ چائے پلانا تو دور اُسنے اسے اب تک ایک گلاس پانی تک کے لیے نہیں پوچھا۔

باولی اُس پر ایک تحقیر آمیز نظر ڈال کر اُٹھی اور کاؤنٹر پر تل دے کر تن تناتے ہوئے اپنے بھائیوں کے ساتھ نکل گئی۔ ایک پل کے لئے سدھاکر سناٹے میں رہ گیا لیکن دوسرے ہی پل میں وہ غصّے سے اٹھا اور اپنے اصلی رنگ میں آکر باولی کے سامنے کھڑا ہو کر غصے سے اُبل پڑا۔

''اتنا بھاؤ کا ہے کو کھا رہی ہے تو؟ سالی تیری جیسی کتنی لونڈیں کے دائیں بائیں گھومتی رہتی ہیں۔ فٹ پاتھ کی اولاد تو لونڈیں کو اتنا کاہو سمجھتی ہے کیا جو لونڈیں تیرے جیسے گیدڑ کے آگے پیچھے کتے کی مانند گھومتا ہے۔ سالی میں ممبئی کا مالک ہوں۔ تیرے کو عزت سے ملنے کو آیا تھا میں خوشی نہیں آیا۔ میرے باس نے میرے کو تیرے پاس بھیجا۔ تیرے کو فلم میں کام دلانے کے واسطے۔ لیکن تیرے یہ تیور دیکھ کے میرے کو بھی لگتا ہے کہ تیرے نصیب کے لکھے کو پر ورما بھی نہیں بدل سکتا ہے میں کیا بولوں''

سدھاکر کی یہ چل کتی سن کر باولی کی گھگھی بند ہو گئی۔ جب سیر کو سوا سیر مل جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ سب کے باولی نرم پڑ کے بولی۔

''بات یہ ہے کہ ایک فلم میں تم کو ایک رول کرنا ہے روز کے ایک ہزار روپے ملیں گے۔ دس پندرہ دن کا کام ہے۔ یوں ہی پندرہ بیس ہزار کما لوگی۔ اگر کام کرنا منظور ہے تو ابھی میرے ساتھ چلو ہو چلنا ہوگا۔ وہاں پر ڈائرکٹر صاحب بیٹھے ہیں۔ وہ سب کچھ سمجھا دیں گے۔ بولو چلتی ہو کیا؟''

باولی کو لگا جیسے وہ کوئی حسین خواب دیکھ رہی ہو۔ بیس ہزار روپے کمانے کا خیال اُسے کبھی خواب میں بھی نہ آیا تھا۔ ایک غریب کے لئے بیس ہزار کی اہمیت وہی ہوتی ہے جو امیر کے لیے بائی پاس سرجری کی ہوتی ہے۔ وہ ابھی تک اس سحر سے باہر آ نہیں پا رہی تھی۔ بیس ہزار کے رنگین سپنے سجائے نہ جانے وہ کس دنیا میں پہونچ چکی تھی۔ سدھاکر نے اُسے اس طرح کھویا ہوا پایا تو اُسنے اسے ہلاتے ہوئے کہا۔

''اے کیا سوچنے لگی؟''

''ایک بات بتاؤ صاحب۔ کہیں تم مجھکو اُلّو تو نہیں بنا رہے ہو؟ یہ اسٹ ماسٹر کیا ایک آدمی پہلے بھی ایسے ہی خواب دکھا کر ٹھگ چکا ہے''

''تیرے کو میں ایسا اُلّو کا پٹھا لگتا ہوں کیا؟ تو ایسا کر میرے کو اپنے ماں باپ سے ملا دے۔ میں اُن سے ہی بات کر لوں گا۔ تجھے بھی اطمینان ہو گا اور مجھے بھی تسلی ہو گی''

وہ اُسے اپنی کھولی پر لے گئی۔ جب بدرن کو پتہ چلا کہ سدھاکر فلم والا ہے تو پھر کیا تھا۔ بدرن اور نورا نے سدھاکر کے آگے اپنی پلکیں بچھا دیں۔ سر آنکھوں پر بٹھایا اُسے۔ اُسکی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بدرن بہت پرانی گھاگ تھی۔ وہ اس سنہری موقع کو کھانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ ایک بار اگر اُسکی بیٹی فلمی دنیا میں چھا گئی تو اُسکے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ اُسنے آنکھ بند کر کے نہ صرف سدھاکر کی آفر قبول کی بلکہ اُسے اگلے روز آفس میں بھیجنے پر بھی آمادگی ظاہر کی۔ سدھاکر تو چلا گیا مگر بدرن اور نورا رات بھر سو نہ سکے۔ کتنے سہانے خواب اُن کی آنکھوں میں لہراتے چلے گئے۔ انسان تو اُمید فردا کے سہارے جیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بیشتر اُمیدیں پوری ہونے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ اُمید و بیم کا یہ سفر انسان کے ساتھ ہی چلتا رہتا ہے کیونکہ جب تک سانس ہے تو آس ہے۔ سانس ختم تو سب کچھ ختم۔

باولی کا اسکرین ٹسٹ لیا گیا جس میں وہ پاس ہو گئی۔ اُسکا کنٹریکٹ بنا جسمیں ساری چیزیں طے ہو گئیں۔ ڈریس مین بادشاہ سے کہا گیا کہ وہ اسے نئی ڈریس پہنا دے۔ بادشاہ بھائی اس کمپنی کا بہت پرانا ڈریس مین تھا اور بکا عاری کی باتیں کرنے میں ماہر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پروڈیوسر کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ فلم انڈسٹری میں چاپلوسی کرنا بھی ایک لازمی فن ہے جس کی بدولت نکمے، ناکارہ بھی پروڈیوسر کے سر پر بیٹھے رہنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ بادشاہ نے جب باولی کو نیا ڈریس دیا تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائی۔ آج کتنے سالوں بعد اُسے پہننے کو ایک نیا لباس ملا تھا جب کہ آج تک وہ اُترن پہترن سے ہی کام چلا رہی تھی۔ جب اُسنے پرانا لباس جسم سے اُتار پھینکا اور نیا لباس زیب تن کیا تو وہ اس لباس میں اپنے آپ کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے چاند بدلی کی اوٹ سے نکل آیا ہو۔ بنے ورنے بھی بہن کو اس لباس میں دیکھ کر آنکھیں پھاڑ کر رہ گئے۔ وہ واقعی اس لباس میں کافی حسین لگ رہی تھی۔

بادشاہ بھائی باولی کا یہ دلفریب روپ دیکھ کر اُس پر لٹو ہو گیا۔ اُس کی قربت پانے کے لیے وہ اُس پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہونے لگا۔ وہ اپنے دونوں بھائیوں کی دیکھ ریکھ میں تھی پھر بھی بادشاہ گھڑی گھڑی آ کر اُسکے پاس بیٹھتا۔ کبھی اُسکا ہاتھ دبا تا، کبھی اُسکے کپڑے ٹھیک کرنے لگتا۔ یہ ذرد کی سدھاکر کو کھلے جا رہی تھی۔ اُسکا یوں باولی کے قریب بیٹھنا اُسے کافی ناگوار گزر رہا تھا ایک دن اُس سے رہا نہ گیا، اُسنے بادشاہ پر جھوکیل اُتارنے کا فیصلہ کیا۔ جب لنچ کا ٹائم تھا اور سبھی

کھانا کھا رہے تھے تبھی سدھاکر نے بادشاہ پر فقرہ کسا۔

"ابے سالے تم طور طریقے سے نیچے پانی سے طور طریقے سے نیچے"

یونٹ کے سارے لوگوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ سدھاکر نے بادشاہ سے مخاطب ہو کے یہ کاوہ نہیں دہرایا مگر وہ مثل مشہور ہے کہ بازار کی گالی کس کی، جو پھر کے دیکھے اس کی۔ جب سدھاکر یہ کاوہ بیان کر رہا تھا تو سب سے پہلے بادشاہ نے چونک کے اُسکی طرف دیکھا اور پھر سب کی نگاہیں بادشاہ کی طرف اٹھ گئیں۔ بادشاہ یہ ذلت برداشت نہ کر سکا۔ وہ غصے سے تمتما اٹھا۔ زبان سے کچھ نہ بولا مگر آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ کھانا وہیں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ سدھاکر نے موقع غنیمت سمجھا۔ وہ باولی کے پاس چلا گیا اور ہمدردی کے انداز میں سمجھاتے ہوئے بولا۔

"اس آدمی کے ساتھ زیادہ میل جول مت بڑھا۔ یہ تیرے کو کہاں تک آئے گا تجھے پتا بھی نہیں چلے گا۔"

باولی سدھاکر سے کسی حد تک مرعوب تھی کیونکہ وہی اُسے یہاں لے کر آیا تھا۔ اسی کی بات تو اُسکے ماں باپ مانتے تھے۔ اگر اس نے اُسکی ماں سے شکایت کر دی تو اس پر ماں باپ کا قہر ٹوٹ سکتا تھا اس لئے وہ سدھاکر کی بات مان کر بادشاہ سے کنی کترانے لگی۔ جب بادشاہ نے اُسکی یہ بے رخی دیکھی تو وہ اُسکا یہ رویہ دیکھ کر چڑ گیا ہوا تھا۔ وہ سب کے سامنے باولی پر بڑی بے خوفی سے پھبتی کستے ہوئے بولا۔

"تو سوچ سمجھا کے ملی تج کو چلی گئی۔ کل تک باقاعدہ سگنل پر اپنا سب کچھ دکھاتی رہتی تھی اب ذرا سا عزت کیا ملی اپنے آپ کو رانی روپ متی سمجھنے لگی۔"

بادشاہ کا اتنا کہنا تھا کہ باولی غصے سے جھنجھلا اٹھی۔ وہ جارحانہ انداز میں بادشاہ کی طرف بڑھ کر چلائی۔

"کیا بولے رے تم؟ میں سگنل پر بیٹھ کر کوٹھی تھی کیا؟ دوسروں پر انگلی اٹھانے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ تو کتنا پاک و صاف ہے۔ میں مانتی ہوں کہ میں چھاتیاں دکھاتی تھی۔ یہ چھاتیاں کس نے نہیں دیکھی ہیں۔ آدمی کی پہلی پہچان تو ان ہی چھاتیوں سے ہوتی ہے تو جب پیدا ہوا تو کیا تم نے اپنی ماں کی چھاتیاں نہیں دیکھیں؟ تو نے کیا سب نے چھاتیاں دیکھی ہیں۔ میں نے اگر دکھائیں تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑا۔ میں نے اپنا انگ دکھایا تو گناہ ہو گیا۔ یہ جو تمہاری بیبی روشنی اپنا سب کچھ دکھاتی ہیں وہ جائز ہے۔ اُن کو تم کچھ کیوں نہیں کہتے؟ اتنے ایمان والے ہو تو جا کے کسی بڑی ہیروئن کو اس ننگے پن سے روک دو نا۔ میں سمجھوں گی کہ واقعی تو نے بہت بڑا کام کیا۔ غریب پر دولتی چلانا آسان ہے۔ میں تب مانوں جب تم کسی امیر زادی کو یہ غلط کام کرنے سے روک لو گے۔"

باولی کی یہ تکرار سن کر سب دم بخود کھڑے رہے۔ سب سے بری حالت تو بادشاہ کی تھی۔ وہ تو زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ چھوکری نے تو اُسے سب کے سامنے اس طرح ننگا کر کے رکھ دیا تھا کہ وہ مارے خفت کے کسی سے نظر بھی نہیں ملا پا رہا تھا۔

بادشاہ کو باولی کی نظروں سے گرا کر سدھاکر نے اپنا سکہ باولی کے دل پر بیٹھا لیا تھا کہ وہ اس سے پوچھے بنا اپنے ہونٹ تک نہ ہلاتی تھی۔ دراصل سدھاکر خود باولی کو دل ہی دل میں چاہنے لگا تھا، پر جگ ہنسائی کے ڈر سے وہ اظہارِ محبت نہیں کر پا رہا تھا کیونکہ سماج اُسے اس بات کی کبھی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ وہ ایک بھیک مانگنے والی لڑکی کو اپنی شریکِ حیات بنا لے۔ ابھی سماج اتنا ترقی یافتہ نہیں ہوا تھا کہ ایک بھکارن اونچے سماج میں پاؤں رکھنے کا تصور بھی کر سکے پر یہ جو عشق ہے یہ کسی کے حکم کا تابع نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں نا کہ پریت نہ جانے جات کجات۔ سدھاکر باولی کے عشق میں اس حد تک گرفتار ہو چکا تھا کہ وہ دن رات اسی کے خیالوں میں کھویا رہتا تھا۔ باولی ان ساری باتوں سے بے خبر اپنے بھائیوں کو کھلانے پلانے میں لگی رہتی تھی کیونکہ جس طرح کا کھانا انہیں یہاں فراہم تھا ایسا کھانا تو وہ کسی تہوار پر بھی نہ کھاتے تھے اسلئے وہ کھانے کو مالِ غنیمت کی طرح لوٹتے چلے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی سپاٹ بوائے اُن کو یوں کھانے پر ٹوٹ پڑتے دیکھ کر ان پر برس پڑتا تھا۔

"بھک منگے سالے کبھی کے کھانے پر یوں ٹوٹ پڑتے ہیں جیسے برسوں کے بھوکے ہیں۔ پتا نہیں ڈائرکٹر صاحب بھک منگوں کی یہ فوج کہاں سے اٹھا کر لائے ہیں۔"

وہ ان باتوں کا برا نہیں مناتے تھے پر سدھاکر کو یہ باتیں ناگوار گزرتی تھیں۔ وہ سپاٹ بوائے سے اُلجھ جاتا تھا۔ ایک دن اس نے ہمت کر کے باولی کو اپنے حالِ دل سے واقف کرنے کا فیصلہ کیا پر مسئلہ یہ تھا کہ اس سے کیسے تنہائی میں بات کی جائے کیونکہ اُسکے دونوں بھائی سائے کی طرح اُسکے ساتھ لگے رہتے تھے۔ سدھاکر نے اس مسئلے کا توڑ یوں نکالا کہ وہ سین سمجھانے کے بہانے باولی کو میک اپ روم میں لے گیا اور بے دھڑک اور بنا ٹال اس نے باولی کے آگے اپنا حالِ دل رکھا۔ باولی بت بنی بیٹھی رہی۔ اُسکا چہرہ ایک دم صاف سپاٹ تھا۔ نہ کوئی خوشی، نہ کوئی اچنبھا۔ دل کے سارے احساسات جیسے مردہ ہو چکے تھے۔ سارے جذبات جیسے شل ہو چکے تھے۔ وہ سدھاکر کی طرف پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر بولی۔

"جسے تم پیار سمجھ رہے ہو میں اُسے وشنا سمجھتی ہوں۔ یہ وشنا ہر مرد کے دل میں تب جاگتی ہے جب وہ ایک حسین لڑکی کو اپنے قریب پاتا ہے۔ میں نہ اپنی اوقات بھولی ہوں اور نہ ہی اپنی حیثیت۔ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتی ہوں کہ محل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگتا۔ کاہے کو میرے دل سے کھیل کر میرے سوئے ہوئے

جذبات کو جگانا چاہتے ہو؟ کاہے کو میرے ارادوں کو کمزور کرنا چاہتے ہو۔ میں ایک بار ٹھوکر کھا چکی ہوں۔ میں اب دوسری بار ٹھوکر کھانا نہیں چاہتی ہوں۔"

سدھاکر نے آگے بڑھ کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور پھر شدتِ جذبات سے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں جس راہ پر قدم رکھنے جا رہا ہوں، اس راستے پر کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس راہ پر چلنا آسان نہیں پھر بھی میں اس راہ پر نکل پڑا ہوں۔ مجھے تمہارا ساتھ چاہیے۔ میرا یقین کرو میں تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں۔ میں تمہیں کبھی دھوکہ نہیں دوں گا۔"

باولی کبھی جذبات کے ریلے کے ساتھ بہنے لگی تھی تو کبھی وہ سختی سے اپنے جذبات کو دبانے لگی تھی۔ کشش کا دیا ہوا درد وہ ابھی تک نہیں بھولی تھی۔ وہ پھر سے اُسی درد سے دوچار ہونا نہیں چاہتی تھی اسلئے اُس نے سدھاکر کی پیش کش کو سختی سے ٹھکرا دیا۔ سدھاکر اُسکے اس فیصلے سے سکتے میں رہ گیا۔

شوٹنگ ختم ہوئی۔ باولی پھر سے اپنے کام دھندے پر لگ گئی۔ اس بیچ سدھاکر نے اُس سے ملنے کی کوشش کی مگر اُس نے ہر بار اُسے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔ اُسے محبت کے لفظ سے ہی چڑ ہو گئی تھی۔ سدھاکر بھی اتنی جلدی ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ باولی سے ملتا رہا۔ اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے بالآخر اُسنے باولی کو پھر سے پرچا لیا۔ باولی ایک کمزور جان جو سہارے کے لئے کٹی پتنگ کی طرح اِدھر اُدھر بھٹکتی رہی۔ سدھاکر کے وعدے ارادے اور اُسکی دیوانگی دیکھ کر پسیج گئی۔ دونوں نے چوری چھپے شادی کر لی۔

وہ شادی کے بعد باولی کو رانی کی طرح رکھنے لگا۔ بدن کے یہاں بھی وہ ہر مہینے ایک موٹی رقم ڈال کر جاتا تھا تاکہ انہیں کسی قسم کا شک نہ ہو جائے۔ بدن اور منّے کو بھی اُس نے سپاٹ بوائے کے کام پر لگا دیا تھا۔ وہ تو راتوں رات بدن کے نظروں میں چھا گیا تھا۔ اُن کے لیے وہ کسی مسیحا سے کم نہ تھا جس نے نہ صرف اُن کے دکھ درد کم کر دیئے تھے بلکہ انہیں عزت سے جینے کی راہ بھی دکھائی تھی۔ اس بار باولی اپنے فیصلے پر نازاں و فرحاں تھی۔

ایک دن سدھاکر باولی کو سجا دھجا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ دونوں ہوٹل میں پہونچے۔ ہوٹل کے کمرے میں داخل ہو کر باولی نے سراسیمہ ہو کر سدھاکر سے پوچھا۔

"یہ تم مجھے ادھر کاہے کو لے کر آ گئے؟"

"دیکھو ابھی جو آدمی آئے گا وہ ایک فلم ساز ہے۔ اگر تم اُسے خوش کر لوگی تو وہ مجھے ڈائرکٹ کرنے کا چانس دے گا۔ بس ایک رات اور پھر ــــــ"

باولی کو لگا جیسے اُسکے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ اُس نے بڑھ کر ایک زناٹے دار تھپڑ سدھاکر کے گال پر رسید کیا اور پھر وہ اپنے ریزہ ریزہ دل کو لے کر ہوٹل سے نکل گئی۔ وہ پھر سے فٹ پاتھ پر کھڑی تھی۔

☆

۔بقیہ: مکڑیاں اور چوہے۔

"ایک ساتھ دو ــــــ"

میری انگلی ٹریگر پر تھی۔ اچانک ایک منی بس دوسری کو کاٹ کر دندناتی چلی آئی۔

جانے مجھے کیا ہوا! پستول کدھر گیا!

میں تیزی سے لپکا اور بچی کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

بچی کی ماں دھکے سے سڑک کی دوسری طرف لڑھک گئی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور بچی کو میرے ہاتھ سے لے کر کھینچ لیا۔

ہجوم دم بھر کو ساکت ہو گیا۔ منی بس والوں کی تیز رفتاری پر انہیں گالیاں بکیں اور پھر سے اپنے کام کاج میں مصروف ہو گیا۔

بچی ماں سے چپکی ہوئی اور بڑی حسرت سے اپنی آئس کون کو میلے کیچڑ میں گھلتے دیکھے جا رہی تھی۔

میری نگاہیں بھی آئس کون پر جمی تھیں۔ سفید ٹھنڈا دودھ دھیرے دھیرے میلے کیچڑ کو کھاتا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

میں گندی گلی میں سے ہو کر بڑی والی سڑک پر نکل آیا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرے ذہن میں پلنے والی مکڑیاں اور چوہے غائب ہو گئے ہیں۔

انہیں آئس کون کا سفید دودھ نگل گیا۔

۔بقیہ: بے باق۔

مجھے بھی ایسی ہی خوشی محسوس ہو رہی تھی جیسے سقا کو ایک دن کی بادشاہت میں چمڑے کا سکہ جاری کر کے محسوس ہوئی ہوگی۔

رخصت ہوتے وقت حمید مرزا نے میرا شکریہ ادا کیا اور بیری سنگھ بولا "مجھ کو وہ جگہ بتا دیجئے جہاں آپ کو ایک ہزار کا نوٹ ملا تھا۔ میں کل وہاں اپنی قسمت آزماؤں گا۔"

ہم تینوں کھلکھلا کر ہنس دیئے اور اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے گئے۔ گھر پہنچتے تک رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ گھر کا ماحول کچھ بدلا بدلا سا نظر آیا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میری نو سالہ بیٹی ثمرہ کا چہرہ فق تھا۔ میری دس سالہ دلہن نے معمول کے مطابق میرا استقبال نہیں کیا تھا۔ میں نے فوراً پوچھا "آپ لوگ سست دکھائی دے رہے ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہے نا؟"

بیٹی نے ماں کا چہرہ دیکھا اور ماں نے میرا چہرا دیکھا۔ اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ بولی۔ "آپ کی بیٹی نے ۲۲ سو روپے جو اسکول کی فیس ادا کرنے کے لیے آپ نے دیئے تھے کہیں کھو دیئے ہیں۔"

میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا کرسی پر بیٹھ کر میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کا نصف حصہ چھپا لیا تھا۔

☆

# یُوسفِ بے کاروار

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

پرانے وقتوں میں موسم اور ہواؤں کے ساتھ کچھ لوگوں کی پرانی چوٹیں اور زخم ہرے ہوجایا کرتے تھے جن کا زیادہ تعلق انسانی جسم کے سخت ترین حصے یعنی ہڈیوں سے ہوا کرتا تھا۔ مگر دلوں کی چوٹ پروائی ہواؤں کی محتاج ہوتی ہے نہ کبھی اور نہ موسم سے متعلق جن کی قسمت میں درد کی پوٹ بنا لکھ دیا گیا ہو وہ ہر حال میں قسمت کا لکھا بھوگنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ایک دکھ ایک بیماری ایک روگ نہ جانے کتنے موسموں اور نسلوں سے ہمارے نصیب میں چلا آرہا ہے جس کا کوئی علاج ہے اور نہ حل۔ اکثر جی چاہتا ہے شفا مقدر میں نہیں نہ سہی اس جرم کی بابت تو کچھ معلوم ہو جس کے عوض قرنوں سے ہم سزاوار چلے آرہے ہیں۔

زمانہ بدل گیا، سائنس نے بے پناہ ترقی کر لی، انسان کی ہر ابتلا کا کوئی نہ کوئی علاج دریافت ہو چکا مگر ایک وقت پھر بھی ہے جب بھی مسیحائی کی امید لے کر کوئی مریض معالج یا طبیب کے روبرو حاضر ہوتا ہے تو سب سے دشوار گزار مرحلہ مرض کی تفصیل اور اس کی علامات کا بیان ہوتا ہے۔ کچھ نروس مریض کو ماحول کی نامانوسیت کر دیتی ہے کچھ معالج کا کروفر اور اس کی ڈگریوں کا شمار۔

یہ کلینک بھی صفائی ستھرائی اور نفاست میں دیدنی ہے۔ سرسبز و سبز لان، جدید راہداریاں، رنگ برنگے خوشنما پھول، سرو قد پودوں کے درمیان کشادہ کار پارکنگ میں جدید ماڈل کی بیش قیمت گاڑیاں میری وحشت میں اضافہ کا باعث بن رہے ہیں۔ میں کلینک کے صدر دروازے پر ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا ہوں۔ بیماری اور اس کے اثرات کا تعین کرنے میں مجھے دشواری پیش آرہی ہے۔ ایک مسئلہ زبان و مکان کا بھی ہے۔ بیماری کا سرا ڈھونڈتے، تلاش کرتے دس بیس پچاس کبھی سینکڑوں سال پیچھے بھی جانا پڑتا ہے۔ سردست سب سے اہم مسئلہ کلینک کے اندر جانا اور ڈاکٹر کے سامنے حالِ دل بیان کرنا ہے۔ سنا ہے سائنس والے دل کی دلیل کے قائل نہیں ہوتے۔ اپنی توجہ ہٹانے کے لئے کلینک میں چاروں طرف نظریں دوڑا رہا ہوں۔ سب چہرے متفکر، پریشان اور ناآسودہ ہیں۔ جب بھی ڈاکٹر کی خوش شکل پی اے کا انٹرکام بجتا ہے میرے دل کی دھڑکن تیز تر ہو جاتی ہے میرے گرد و پیش بیٹھے ثروت مند مریضوں کے چہروں کا تناؤ کم ہونے لگتا ہے سب کے سب امید افزا نظروں سے دھان پان پی اے کی جانب دیکھنے لگتے ہیں حالانکہ سب کا وقت اور باری مقرر ہے یہاں سب میں شاید واحد مریض میں ہوں جسے ڈاکٹر کے پاس جانے کی قطعاً کوئی جلدی نہیں میرے دل میں اس وقت شدید خواہش ہے کہ ڈاکٹر کو ارجنٹ کام پڑ جائے یا ہسپتال سے ایمرجنسی کی اطلاع پا کر فوری طور پر تمام مریضوں، کم از کم مجھے میرے حال پر چھوڑ کر چلا جائے۔ ان خیالات کے باعث میں کسی قدر شرمندگی کا شکار ہوں کیونکہ میرے اہل خانہ اور دوست میری روز بروز گرتی صحت کے باعث بہت متفکر اور پریشان ہیں۔ ان لوگوں کی یہی فکرمندی مجھے شہر کے مہنگے ترین ہسپتال تک لے آئی ہے۔

گھر والوں کو سمجھایا اور منایا بھی جا سکتا ہے کسی حد تک وہ میری نازک حالت سے باخبر بھی ہیں مگر دل کے ہاتھوں مجبور! میرے دوست اس باب میں کچھ بھی سننے کو تیار نہیں۔ سب کے سب میرے لئے ڈھیروں پھل پھول لے کر آئے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ میں ان کے لائے پھل ضرور چکھوں اور پھولوں کے خوبصورت گلدستوں سے دل بہلاؤں اور ہر قسم کی فکروں سے دور رہوں۔ کتنے سادہ ہیں میرے دوست! بلی کی آمد پر چوہے کو آنکھیں بند کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ ان کی معصومیت، بے خبری اور لاچاری پر مجھے! کبھی پیار کبھی غصہ اور کبھی رونا آتا ہے۔ کتنی محبت کرتے ہیں یہ سب مجھ سے اور اسی محبت میں اندھے ہو کر یہ میرے لئے منہ مانگی قیمت پر شفا خریدنے کے آرزومند ہیں۔ میں جانتا ہوں! میرے مرض کا علاج ہرگز اس ہسپتال میں دستیاب نہیں، یہاں بیٹھنے والا شہر کا قابل ترین ڈاکٹر انسانی جسموں کا ماہر ہے جبکہ میری روح زخمی ہے۔ ان زخموں کا علاج وہی کر سکتا ہے جس نے یہ زخم لگائے ہیں مگر وہ انسانی عارضوں کی نسبت اپنے مفادات کا اسیر ہے۔

ایسا پہلے بھی کئی بار ہوا ہے کئی بار میرا وجود مہلک و موذی امراض کا گڑھ بنا ہے۔ کئی بار میرے وجود کے قیمتی حصے ایک دوسرے سے جدا کئے گئے ہیں۔ کئی بار مجھے اپنے ہی خون سے غسل کرایا گیا ہے اور نہ جانے کتنی بار مجھ پر زمین تنگ کی گئی ہے۔ میرے جذبات امڈ رہے ہیں۔ میں آپ کو گواہ بنا کر بہت کچھ کہنا اور سنانا چاہتا ہوں مگر وہ دیکھئے اپنے گرد و پیش سے بے نیاز خوش شکل پی اے کا انٹرکام پھر بج اٹھا اس بار ڈاکٹر کے کمرے سے ایک چاق و چوبند نرس برآمد ہوئی ہے لگتا ہے اب کی بار اس کا نشانہ میں ہوں۔ وہ سیدھی میری جانب بڑھی چلی آرہی ہے۔

میرے بائیں جانب بیٹھے لوگوں میں ہل چل ہو رہی ہے۔ ادھیڑ عمر اور ناتواں جسم کا مالک مریض ان کے رحم و کرم پر ہے۔ وہ اسے سہارا دے کر ڈاکٹر کے کمرے سے برآمد ہونے والی نرس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ نرس نے اپنا مونڈھا مریض کی بغل میں دے کر اس کا ہاتھ اپنے دوسرے کاندھے پر رکھ لیا ہے۔ اب وہ آہستہ آہستہ ڈاکٹر کے کمرے کی جانب گامزن ہے۔ مجھے نہیں یقین کہ یہ بے چارہ اپنوں کی محبت یا ڈاکٹر کی چارہ گری کے سہارے جانبر ہو سکے گا۔ میں نے اس کا عزم متزلزل ہوتے دیکھا ہے...... پھر باقی کیا بچا! کچھ بھی نہیں، سب بیکار ہے دیمک لگی لکڑی کی مانند۔

کہتے ہیں! جوانی کی بیماری پر جلد قابو پایا جا سکتا ہے مگر جو مریض عین شباب کے عالم میں جراحت کے بڑے عمل سے گزر کر قطع بُرد سے دوچار ہو چکا ہو وہ بیماری کے ہلکے جھٹکے کیونکر سہہ سکے گا جبکہ اس کی بیماری کا تعلق داخلی سے زیادہ خارجی ہے جس کے حملوں سے قبل احتیاطی تدابیر سے بھی سرمو انحراف کیا گیا ہو اور آنکھ بند کر کے عارضی دواؤں پر اعتماد کیا جاتا رہا ہو۔

جب بھی میری بات ٹیک پر آ کے ٹکتی ہے میرا اشتر کام مداخلت کرنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر کی پی اے کو اپنی جانب متوجہ پا کر میرے حلق میں کانٹے چبھنے لگے ہیں۔ کتنے کول اور مدھر سُروں میں اس نے میرا نام پکارا ہے۔ لگتا ہے میری آخری خواہش معلوم کر رہی ہے۔ کاش! میں اس وقت تنہا ہوتا تو اپنے نام سے منحرف ہو جاتا مگر اس وقت میرے سارے ہمدرد و غم گسار لپک کر میری جانب بڑھے ہیں، وہ سب کے سب میرے ہمراہ ڈاکٹر کے کمرے میں جانے پر بضد ہیں۔ نرس کی تیوری انہیں سرکشی پر آمادہ کر رہی ہے۔

"یہ کیفیت کب سے ہے آپ کی!" دل، جگر، معدہ، پھیپھڑے، ہاتھ پیر کے ناخن سے لے کر آنکھوں کی پتلیوں تک چیک کرنے کے بعد پرفارما پُر کرتے ہوئے ڈاکٹر نے پہلا سوال کیا۔

"بار ہا تلاش کرنے پر بھی میں اس کے سرے تک نہیں پہنچ پایا۔ قریب پانچ دہائی قبل ایسا ہی ایک کلینک تھا، جس میں جا بجا مختلف کمروں کے بجائے ایک بڑا ہال نما کمرہ تھا۔ سیمنٹ کے بنے فرش پر دو رویہ لکڑی کے بنچ پڑے ہوئے تھے۔ زنانہ اور مردانہ قطاروں میں غریب اور متوسط لوگ اپنی باری کے منتظر تھے۔"

"کیا تکلیف ہے جوان۔"

ہال نما کمرے کے ایک کونے میں بڑی سی میز کے ایک طرف بید سے بنی منقش لکڑی کی کرسی میں دھنسے بھوپال سنگھ نے پگڑی کا طرّہ درست کرتے ہوئے دادا جان سے پوچھا تھا۔

"جناب! اس کی بھوک مر گئی ہے" دادا جان کے ایک پر جوش دوست نے کہا تھا۔

"یہ کمزور بہت ہو گیا ہے جناب" دوسرے نے لجاجت سے بتایا تھا۔

"اس کو نیند بھی نہیں آتی، ڈاکٹر صاحب! یہ راتوں کو اکثر جاگتا ہے اور نہ جانے کیا سوچتا رہتا ہے" تیسرے دوست نے بات کو آگے بڑھایا تھا۔

"بھوک مر گئی ہے، کمزور ہو گیا ہے، راتوں کو جاگتا رہتا ہے

"کاکو" یہ بیماری نہیں، بیماری کے اثرات ہیں۔" بھوپال سنگھ نے خوشدلی سے کہا تھا۔

"تو بتا "جوان" ماجرا کیا ہے۔ عشق وشق کا چکر تو نہیں، ذرا بالکل برخوردار سچ بتا دے میں کوئی نہ کوئی حل نکال لوں گا۔"

"کس چیز کا......" دادا جان نے حیرت سے بھوپال سنگھ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"تیری بیماری کا، تیرے مسئلے کا اور کس چیز کا بُز۔"

"میرے ذہن میں پروان چڑھنے والے خدشات مٹا دیجیے۔ تعصب، تنگ نظری اور فسادات ختم کروا دیجیے...... ڈاکٹر صاحب! بے گناہ انسانوں کا بہتا خون بند کرا دیجیے۔"

"بھئی مریض کا بڑا کوئی ہے...... مجھے تو یہ انقلابی قسم کا لیڈر ویڈر لگتا ہے۔"

"کیا بات کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب! یہ تو بہت شریف آدمی ہے پتہ نہیں اسے آج کل کیا ہو گیا ہے۔ مسجدوں، مدرسوں، مزاروں حتیٰ کہ گلی کوچوں کے در و بام کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا اور چومتا ہے۔ کہتا ہے اپنے بزرگوں کی یہ نشانیاں مجھے اجنبی لگنے لگی ہیں۔ دادا جان کے ایک چہیتے دوست نے رقت آمیز انداز میں ڈاکٹر بھوپال سنگھ کو ان کی حالت کے بارے میں بتایا تو بھوپال سنگھ اسی طرح ہاتھوں میں اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا تھا جس طرح اس وقت آپ بیٹھے ہیں۔"

"او...... ہوں...... زیادہ تفصیل میں نہیں جاتے صرف اتنا بتایئے کہ بھوپال سنگھ نے آپ کے دادا جان کا کیا علاج تجویز کیا تھا اور کتنے عرصے میں وہ صحت یاب ہوئے تھے۔"

"وقت اور زمانے کی چال بالکل نہیں بدلی ڈاکٹر صاحب! ہم نے تاریخ سے سبق سیکھا ہے اور نہ تاریخ سازوں نے قدرت سے، سب کچھ اسی طرح جاری و ساری ہے۔ استحقاق سے بڑھ کر حاصل کرنے

کی خواہش ختم ہو جاتی تو شاید دادا جان بھی صحت یاب ہو جاتے اگر دادا جان صحت یاب ہو جاتے تو ڈاکٹر چیٹر جی کو پھر سے ہماری خاندانی کیس ہسٹری ڈھونڈنا پڑتی' پھر سے والد صاحب کو تختہ مشق بننا پڑتا؟"

"ڈاکٹر چیٹر جی...... کیس ہسٹری...... والد صاحب...... یہ کب کا قصہ ہے۔"

"یہ کوئی ربع صدی قبل! بہت بڑا' بہت حسین' ہرا بھرا' پرسکون' سادہ اور محبت سے لبریز گھر تھا ہمارا' چاروں اور وسیع دریا بلند و بالا پہاڑ خوبصورت جھرنے اور شفاف ندی نالے بہتے تھے۔ بستیاں اور بازار پُر رونق اور ضروریات زندگی عام تھی جن میں بسنے والے سادہ اور سچے انسان' ایک دوسرے کے ہمدرد و غم گسار' ہمیشہ ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کا عزم رکھنے والے محبت بھرے دلوں کے ساتھ ایک دوسرے کے شانہ بشانہ بہتر مستقبل کی جانب گامزن تھے۔ نہ جانے کن ہوس پرست نے ہمارے ہرے بھرے گلشن میں نفرت کا زہریلا بارود پھیلا دیا جس کے خوفناک شعلے ہمارے گھر کو خاکستر کر گئے' اس بارود کے پھٹنے سے بہت پہلے اس کی بو والد صاحب کی رگوں میں سرایت کر گئی تھی اور وہ آن کی آن میں راکھ کا ڈھیر بن گئے تھے۔ ڈاکٹر بھوپال سنگھ کی طرح ڈاکٹر چیٹر جی بھی بے بس ثابت ہوئے تھے وہ بھی والد صاحب کے بہت سے دوستوں اور محبت کرنے والوں کی دعاؤں کے باوجود انہیں بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔

آپ بھی وقت ضائع مت کیجئے ڈاکٹر صاحب...... آندھیاں بہت تیز اور اور میرا وجود بےحد ناتواں ہے؟

آرے اور چھریاں' گھر سے! تیز کی جا رہی ہیں۔ گھر سے عالمی سامراج بے گناہ انسانوں کو کاٹنے' بانٹنے اور ان کے منہ کا نوالہ چھیننے کی فکر میں ہے؟ گھر سے! مجھے میرے در و بام' نامانوس لگنے لگے ہیں؟

نہ جانے کیوں؟ مجھے اس وقت' شیکسپیئر شدت سے یاد آ رہا ہے کہا تھا دنیا ایک اسٹیج ہے' ہر کوئی باری پر اپنا کردار ادا کر کے چلا جاتا ہے میرے خیال میں آنے والے وقت کا شیکسپیئر کو ادراک نہ تھا۔ وہ حرص و ہوس کے خداؤں کے اس کھیل سے قطعی لاعلم تھا جس نے دنیا کے حسین اسٹیج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے جس کے ایک طرف خوش بختی اور خوشحالی کا دور دورہ ہے اور دوسری جانب آگ و خون کا کھیل جاری ہے اور اس کھیل کے بیشتر کردار ہمیشہ کی طرح جانے پہچانے اور شناسا ہیں؟

مقام شکر! کہ اس اسٹیج کا نام کرۂ ارض ہے جس کی گردش ابھی تھمی نہیں۔

## میں کیوں کر نظم لکھتا ہوں

**ممتاز احمد (دھمرکے)**

مجھے 'آمد' نہیں ہوتی
میری 'آورد' ہوتی ہے
اسی آورد کے بل پر
میں اکثر شعر کہتا ہوں
یا کوئی نظم لکھتا ہوں
میں جب اشعار لکھتا ہوں
طبیعت میں مسلسل
ایک بے چینی سی رہتی ہے
میں راتوں کو بھی اٹھ اٹھ کر
کتابیں کھول لیتا ہوں
کسی شاعر کا اک مصرعہ
اچھوتی سوچ کا حامل
میری روح میں اترتا ہے
کسی کاغذ کے پرزے پر
میں لکھ کر گنگناتا ہوں
میں پہروں سوچتا ہوں تب کہیں جا کر
اسی جیسا پھڑکتا کوئی اک مصرعہ
میں خود کہہ کر
مکمل شعر کرتا ہوں
کبھی تو بات بنتی ہے
مگر اکثر نہیں بنتی
میں یوں اشعار کہتا ہوں
میں ایسے نظم لکھتا ہوں

# اُجالوں سے تکرار

### ملک زادہ جاوید (نوئیڈا بھارت)

اُجالوں سے تکرار کرتے رہو  ہمیں بھی طرف دار کرتے رہو
فضا میں ہے تہمت کی چنگاریاں  محبت سے انکار کرتے رہو
کہیں اور جانے کی سوچے نہ وہ  اُسے اسقدر پیار کرتے رہو
ہوس کی دکانیں ہیں ہر موڑ پر  محلوں کو بازار کرتے رہو
کسی کی بھی تنقید سے مت ڈرو  جو دل نے کہا' یار کرتے رہو
بلندی کی دُھن ہے تو تھکنا نہیں  جنوں کو طلب گار کرتے رہو
تمہیں کوئی جاوید کچھ بھی کہے  شرافت کا اظہار کرتے رہو

### صابر عظیم آبادی (کراچی)

نگاہوں میں برابر جل رہا ہے  ترے چہرے کا منظر جل رہا ہے
لگا ہے داغ جو قرطاسِ دل پر  مرے سینے کے اندر جل رہا ہے
ہوائے مشکبو کا ہاتھ کب سے  ترے عارض کو چھو کر جل رہا ہے
لگی ہے آگ یہ کیسی چمن میں  سراپائے گُلِ تر جل رہا ہے
عجب منظر ہے اپنی بے بسی کا  بھری برسات میں گھر جل رہا ہے
وفا کی غیر معمولی تپش سے  ترا بازو مرا پر جل رہا ہے
خود اپنی آگ میں اے مہرِ تاباں  مسلسل تیرا پیکر جل رہا ہے
ہوا رکتے ہوئے بھی رہ گزر میں  دیا ہر گھر کے باہر جل رہا ہے
ہوس کی آگ میں برسوں سے صابر  مقدر کا سکندر جل رہا ہے

### شباب للت (شملہ بھارت)

خوب ہم سے چال چل گئے  ہم وہی ہیں' تم بدل گئے
ہم بجھے تو کیا بُرا ہوا  کچھ نئے چراغ جل گئے
جس گلی میں ٹھوکریں ملیں  ہم اُسی میں سر کے بل گئے
میرے ذکر پر تڑپ اٹھے  مجھ کو سوچ کر پگھل گئے
اک ہنسی فضا میں گھل گئی  سینکڑوں چراغ جل گئے
اُس نظر نے آسرا دیا  گر چلے تھے ہم سنبھل گئے
اہلِ زر کی واسنا کے روبرو  کتنے چندرماں نگل گئے
شرم سے وہ رُخ ہوا گلاب  منہ سے کیا بچن نکل گئے
جس کو چھو گئی تری نظر  اُسکے سارے پاپ جل گئے
نقطے پر نگاہ جم گئی  دائروں سے ہم نکل گئے
پیار کے گگن پہ جب اُڑی  واسنا کے پنکھ جل گئے
ہم تھے سنگ اُس نے جب چھوا  پیکرِ بشر میں ڈھل گئے
ہم تھے اے شباب اہلِ فن  دھول کھا کے پھول اُگل گئے

### رب نواز مائل (کوئٹہ)

ہے فطرت میں خطا تو ہو خطا بھی      مگر بھولیں نہ بخشش کی دعا بھی
نجانے کیا سنا اُس راگ سے یُوں      جو کب کا بج چکا میں پر بُرا بھی
وہ جس بابت کہ سب تھے خوف میں گم      دِوانہ تھا کوئی کیا فس رہا بھی
جہاں ملنا بھی تھا جوں خوابوں ہی میں      وہ کس معنی میں تھا کیا رابطا بھی
یہ چلنا اب کے ہو ایسا نہ اپنا      کہ گویا جاں گئی گر کچھ رکا بھی
جو اُٹھنا بیٹھنا تک بھی نہ تھا اِک      سو کتنے تھے بہم تُو ہم جُدا بھی

○

### خالد ندیم (بدایوں بھارت)

جواں ہیں حوصلے پاگل ہوا کے      بہت خوش ہے چراغوں کو بُجھا کے
بہت اکرام ہوں ہم پر خدا کے      اگر آداب آجائیں دُعا کے
بدل پائے نہ تم تیور وفا کے      ملا کیا راہ میں کانٹے بچھا کے
اُنھیں کو غیر ممکن ہے مٹانا      تصور میں جو بن جاتے ہیں خاکے
پیا تلخاب جب سے زندگی کا      ہم عادی ہو گئے کڑوی دوا کے
چراغوں کو ابھی روشن نہ کرنا      بڑے بے رحم ہیں جھونکے ہوا کے
کوئی مجبور دستک دے رہا ہے      ذرا دیکھو تو دروازے پہ جا کے
جنھیں برباد کہتا ہے زمانہ      اُنھیں بھی دیکھئے نزدیک لا کے
بڑے محفوظ گوشے ہیں جگر میں      تری خوشبو کو رکھا ہے چھپا کے

○

### نوید سروش (میرپورخاص)

جب کوئی دریچہ نہ پرندہ نہ شجر ہے      سوچو کہ یہاں کس طرح پھر زندہ بشر ہے
اُس سمت کشش کون سی لے جاتی ہے تم کو      یادوں کے جزیرے میں جو ویران سا گھر ہے
اندازہ یہی ہوتا ہے سنسان کھنڈر سے      یہ بھی کوئی تاریخ کا آباد نگر ہے
ہاتھوں میں صداقت کا علَم لے کے چلا ہوں      ہر گام مری منزلِ مقصد پہ نظر ہے
جو صورتِ خورشید تھا دنیائے ادب میں      اخبار میں اُس شخص کے مرنے کی خبر ہے
تم، قہقہے نہ چائے کی پیالی نہ کوئی پھول      ویران سے گھر میں بس ایک سوکھا سا شجر ہے
یہ نام یہ عزت جو مجھے دی ہے خدا نے      ماں باپ کی بے لوث دعاؤں کا اثر ہے

○

## اُفق دہلوی (دوحہ)

جیت کر دل اُن کا اُن کو پالیا
بن رہے تھے غیر انہیں اپنا لیا

وہ نہ سمجھے تھے نہ سمجھے دل کی بات
نا سمجھ تھا دل اُسے سمجھا لیا

میں نے فیض اوروں کو پہنچایا بہت
آپ اپنے کو ضرر پہنچا لیا

کر لیا یاروں کی یاری پر یقیں
دیدۂ و دانستہ دھوکا کھا لیا

یہ تو پوچھے جانے والے سے کوئی
کیا دیا تم نے کسی سے کیا لیا

راہ پر اپنے تھا رہرو کو ناز
پوچھتے منزل کو اپنی پالیا

بوند پانی کی فلک نے جب نہ دی
دیدۂ خوں بار کو برسا لیا

کوئی باقی ہو تو ڈھالے وہ ستم
ہر ستم تو نے ستمگر ڈھا لیا

ڈھونڈتے ہی رہ گئے شاعر جسے
وہ نیا مضموں اُفق نے پالیا

○

## طالب انصاری (کویت)

دل سے ہر غم نکال رکھا ہے
خود کو مشکل میں ڈال رکھا ہے

ورنہ میں کب کا گر گیا ہوتا
حادثوں نے سنبھال رکھا ہے

میرے اندر کی وحشتوں نے مجھے
گھر سے باہر نکال رکھا ہے

گرچہ بے نام سا سہی پھر بھی
تجھ سے رشتہ بحال رکھا ہے

انتہائے کمال سے آگے
کچھ نہیں ہے زوال رکھا ہے

قہقہوں کے دروں میں بھی جھانک
دیکھ کتنا ملال رکھا ہے

ضبطِ گریہ کا شکریہ جس نے
میرے دُکھ کا خیال رکھا ہے

شدتِ انتظار نے مجھ کو
ایک پتھر میں ڈھال رکھا ہے

رزق بر حق سہی مگر طالبؔ
رزق کے ساتھ جال رکھا ہے

○

## جاوید شیخ (میرپور خاص)

جب سمندر ہی اپنا گھر ٹھہرا
اپنا ہر راستہ بھنور ٹھہرا

جب اندھیروں نے رُخ کیا دل کا
داغِ دل صورتِ قمر ٹھہرا

ذہن کو وسوسوں نے گھیر لیا
وہ نہ جب مجھکو دیکھ کر ٹھہرا

جس کو کرتے تھے کل نظر انداز
آج وہ مرکزِ نظر ٹھہرا

مدتوں بعد جو ملا مجھ کو
وہ مرے پاس لمحہ بھر ٹھہرا

○

### حمیرا راحت (کراچی)

کبھی کمرہ کبھی در بولتا ہے
عجب سی بولیاں گھر بولتا ہے

مرے نزدیک آ کر دھیان سے سن
مرے اندر سمندر بولتا ہے

اِک آنسو ہے جو کچھ کہتا نہیں ہے
مگر اِک درد اکثر بولتا ہے

تحیر عشق کا کم ہو نہ جائے
مری آنکھوں میں یہ ڈر بولتا ہے

بدلتی جا رہی ہے اب روایت
لہو خاموش ، خنجر بولتا ہے

نہیں دیکھا جو آنکھوں نے ابھی تک
وہی نادیدہ منظر بولتا ہے

مسلسل بولتا رہتا ہے کوئی
کوئی خاموش رہ کر بولتا ہے

کبھی اک گونجتا سناٹا راحت
ہمارے بیچ آ کر بولتا ہے

### تصور اقبال (پنڈی گھیب)

لمبی تان کے اب سو جا
پتھر کی صورت ہو جا

تن کی چادر میلی ہے
پہلے تُو اس کو دھو جا

نفرت سے دل کالے ہیں
بیج محبت کے بو جا

میرے بعد نہ رونا تُو
جتنا رونا ہے رو جا

تیرے حق میں بہتر ہے
شام ہوئی ہے گھر کو جا

میرے ہونے میں ہونا
مجھ میں تُو ایسے کھو جا

پہلے تُو کچھ کم تھی کیا؟
اور قیامت سی ہو جا

یا اس عشق کو رہنے دے
یا سچا عاشق ہو جا

بستی والے سوئے ہیں
یار تصور اب سو جا

### عرش صہبائی (جموں کشمیر)

جل سکوں خود سے یہ ارادہ ہے
وقت کم ہے سفر زیادہ ہے

مجھ کو لاتا نہیں یہ خاطر میں
دل بھی کوئی رئیس زادہ ہے

کس قدر خوش لباس ہے دنیا
ایسے لگتا ہے بے لبادہ ہے

وہ ہے تحلیل میری رگ رگ میں
پھر بھی اُس کی کمی زیادہ ہے

بھول جاتا ہے ہر وفا میری
وہ طبیعت کا کتنا سادہ ہے

میں کہ ہوں بے نیاز ہر غم سے
میرا جو غم ہے وہی بادہ ہے

اُس کی ہلکی سی مسکراہٹ میں
لطف کم ہے ستم زیادہ ہے

ہونٹ اس کے بہار کا موسم
اُس کی آنکھیں کہ رقص بادہ ہے

ہر ستم سے نوازتا ہے مجھے
دل کا وہ کس قدر کشادہ ہے

دل میں اس کے لیے کشش ہے عرشؔ
یہ میرا جرم ہے بے ارادہ ہے

# غزل حقی کی حقیقی پہچان

ڈاکٹر سید تقی عابدی

(کناڈا)

کسی نے کیا خوب کہا ہے "شان الحق حقی اب صرف ایک نام نہیں ہے علم و ادب، تحقیق و تنقید، لغات و لسانیات، تخلیق و ترجمہ کے زندہ حوالوں سے چلتی پھرتی نصف صدی کی شب و روز کاوش و ریاضت کا استعارہ ہے"

شان الحق حقی جیسی شخصیت کے تخلیقی تجربات کے مطالعے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی بنیادی ادبی حیثیت کون سی ہے۔ چار سے زیادہ شعری مجموعے اور صدہا آبدار اشعار دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ کیا یہ صرف فطری اچھے شاعر ہیں؟ آٹھ سے زیادہ منظوم و نثری معرکۃ الآرا تراجم دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ بنیادی تخلیقی مترجم ہیں اور فنِ ترجمہ کے عظیم نباض؟

نقد و نگارش، مقدمۂ انتخاب ظفر، مقالات ممتاز، آئینۂ افکار غالب اور مضامین کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ ایک ممتاز منفرد ماہر نقاد ہیں اور تنقید انھیں ورثے میں ملی ہے۔ اس کے علاوہ فرہنگ تلفظ اور آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری نے انھیں ماہر لسانیات کی فہرست میں سرفہرست کیا۔ لسانی مسائل اور لطائف اور "آوارہ لفظ" نے ان کو عالم لسانیات اور مزاح نگار کا رنگ دیا۔ اسی طرح "شاخسانے" نے ان کو افسانہ نگار، "افسانہ در افسانہ" نے ان کو سوانح نگار، مہ پیتنگس نے انھیں جدید مصور قرار دیا۔ چنانچہ ان تمام تخلیقی مسائل اور ان گنت تجربات کو دیکھتے ہوئے ہماری زبان پر خود بخود یہ شعر وارد ہوتا ہے

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

لیکن پھر بھی سوال یہ باقی رہ جاتا ہے اور اس کا شاید جواب یہ ہو کہ ایک عظیم فطری تخلیق کار کے فن میں کئی زاویے ہوتے ہیں اور جس نقطۂ زاویہ پر وہ اپنی تخلیقی فکر کے پرکار کو گھماتا ہے ایک نیا دائرہ بنتا ہے جس کو نئے رنگوں سے سجاتا ہے۔ اس نظریے کے تحت شان الحق حقی ایک ایسی کثیر الجہات ادبی شخصیت ہیں جس کی ہر جہت کامل اور ہر زاویہ مکمل حاصل ہے اور ایسی دوسری شخصیت اردو ادب میں نظر نہیں آتی اور اسی لئے حقی صاحب کے ادبی کارناموں کو دیکھ کر دل کی زبان سے یہ صدا نکلتی ہے

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے!

خود حقی صاحب نے اپنے بارے میں انصاف سے کام لیا ہے

ہے وہ اک شخص کے ہر طرزِ سخن میں جس کی
فکر ایسی ہے کہ شائستہ نظر ایسی کہ نہیں

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کہتے ہیں کہ حقی صاحب کو "ہرفن مولا" کہا جائے تو غلط نہیں اور یہ امتیاز امیر خسرو کے بعد دو چار افراد ہی کو دیا جا سکتا ہے۔ حقی نے نظم و نثر کے تمام اسالیب کو برتا ہے بلکہ ان میں اپنے ذوقِ اجتہاد سے نئے رنگ بھر دیے ہیں۔ شاعرانہ سلیقہ اور فن کارانہ چابک دستی ان کی شاعری میں ایسی رچی بسی ہے۔ اس میں تجربہ بھی ہے، روایت بھی، حسنِ ادا بھی ہے، ندرتِ خیال بھی، شوخی بھی، متانت بھی۔ یہ آواز دل کے نہاں خانوں تک پہنچتی ہے۔ حقی غزل میں نئی جہات اور نئے آفاق تلاش کرنے والے ایک ایسے شاعر ہیں جنھیں ادبی تاریخ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی شاعری کو نظم، غزل، قطعہ اور ثنائیہ، گیت اور پہیلی میں منقسم کرنے کے بعد تجزیہ کر کے بھی دیکھا ہو گا۔ حقی صاحب نے شاعری کی طرف زیادہ توجہ کی ہے۔ ان میں سے غزل کی طرف ان کا میلان بہت واضح ہے۔ اگرچہ حقی صاحب کی شعری تصنیفات میں "تار پیراہن"، "حرف دل رس" اور "دل کی زبان" کے زیر عنوان غزلیں، نظمیں، قطعات، امیر خسرو کے زیر عنوان پہیلیاں، کہہ مکرنیاں اور منتخب اشعار درج ہیں۔ "پھول کھلے ہیں رنگ برنگ" میں بچوں کی دل پسند نظمیں اور "قطعاتِ تاریخ" میں حقی صاحب کی نکھری مادۂ تاریخ کے نمونے بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ تراجم میں "ہیر عشق" شیکسپیر کے ڈرامے "انٹنی اینڈ کلیوپیٹرا کا منظوم ترجمہ"، "درپن درپن" میں عالمی ادب کی (125) منتخب نظموں کے منظوم ترجمے اور "بھگوت گیتا" کا شاہکار ترجمہ بھی شامل ہے لیکن یہاں ہم مضمون کے اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے تمام شعری کارناموں پر اظہار نظر نہیں کر سکتے۔ چنانچہ تمام ادبی اصناف میں صرف شاعری اور پھر شاعری کی اصناف میں غزل کو چن کر اسے اپنی تحریر کا حاصل قرار دیتے ہیں تاکہ اس کثیر الجہات ادبی نابغۂ روزگار کی ایک جہت کے صرف ایک زاویے پر کچھ روشنی پڑ سکے اگرچہ حق تو یہ ہے کہ اس عظیم ادبی شخصیت کے فن پر ایک سیر حاصل تحریر ایک ضخیم کتاب کی شکل میں تیار کی جائے لیکن بہر حال قاری کے شعر "اگر دریا پورا نہ سمجھا سکو تو کم از کم اتنا تو پانی کھینچا جائے کہ پیاس بجھ جائے" کے مصداق ہو کر ہم شان الحق حقی کی غزل کی سیر کرتے ہیں۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ حقی صاحب کی فطرت میں ایجاد پسندی اور طبیعت میں غضب کی تخلیقی سرشت ہے جو انھیں ہر نئے دن، نئے نئے شگوفے کھلائے بغیر چین لینے نہیں دیتی چونکہ شاعری اور خاص کر غزل گوئی ان کے اظہار کا خاص وسیلہ بنی رہی، اسی لیے تو ان کے قلم نے نکھری شاعری کے راستوں کو معطر اور سفر زندگی کو خوشگوار کیا۔ خود کہتے ہیں۔

بہ لطفِ غزالاں بہ فیضِ غزل
گوارا ہے کچھ زندگی آج کل
خیالوں کے گوہر صدف در صدف
محبت کی باتیں غزل در غزل

شی صاحب کا پہلا شعری مجموعہ "تا پیرہن" جب 1958ء میں منظر عام پر آیا تو اسے ادیبوں نے نوازا گیا اور کئی نامور ادیبوں، تنقید نگاروں اور شاعروں نے اس پر تبصرے بھی کیے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں "شی کی غزل میں جو غیر معمولی بات نظر آتی ہے کہ اس کو میں فی الحال "تازگی" ہی سے تعبیر کر سکتا ہوں۔ ان کی غزل میں ایک نیا ذائقہ پایا جاتا ہے۔ یہ نیا پن کیا چیز ہے یہ نیا پن ہیئت کا نہیں۔ قلب انسانی کی کسی نئی کیفیت کے انکشاف یا کائنات کے متعلق کسی نئی بصیرت کا بھی نہیں اس کا تعلق زیادہ تر انداز غزل گوئی سے ہے جس میں غزل معنوی لحاظ سے کچھ بھی ہو اس میں بیان کی لطافت اور زبان کی حلاوت ضرور ہونی چاہیے۔ غزل میں لطافت بیان کو بحال کرنے اور اس میں شیرینی اور گھلاوٹ پیدا کر کے اس میں ایک نیا ذائقہ پیدا کرنا شی ہی کا کارنامہ ہے۔ یہاں غزل برائے شاعری اور بے ضرورت فرہادی اور قیسی نہیں بلکہ سچائی اور فکر و قص کی روح بھی حل ہو گئی ہے تو اس کی غزل کی فضا اور بھی حسین و جمیل ہو گئی۔ شی صاحب کی غزل میں نیا ذائقہ اور بالکل نیا ذائقہ کیا ہے اس کو سمجھنے کے لیے ان کی مختصر غزل یا دو تین غزلوں پر چند گھنٹے بھی لوازمات کو سمجھنا پڑے گا۔ ہم اس مضمون کی نوعیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف شی صاحب کی غزل کے چند نکات پر گفتگو کریں گے۔

دوسرے اچھے شاعروں کی طرح شی صاحب صرف اپنی خاص زمینوں میں غزل کہتے ہیں۔ انہیں دوسری طرحوں اور طرحی غزل کہنے سے رغبت نہیں کیونکہ ان کی شریعت شاعری میں تقلید جائز نہیں اور مقلد ہونا کفر کے مماثل ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ حتی الامکان اپنی بنائی ہوئی ترکیبوں سے استفادہ کرتے ہیں اور پرانی گھسی پٹی ترکیبوں کی بیساکھی سے اجتناب کرتے ہیں۔ اکثر اشعار میں نئی نئی فارسی عربی ترکیبیں غالب، انیس اور دبیر کی یاد دلاتی ہیں۔ کچھ نمونے ثبوت کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔ قفسِ شعلہ کار، حریفِ جفائے دہر، شحنۂ صد عقدۂ مشکل، رمزِ پیہاں، حسرتِ فصل نمو، وعدۂ محشر، فتنۂ رفتار وغیرہ۔

ماتم یہ ہے کہ ذوق فغاں بھی نہیں نصیب
بے سوز ہو گیا قفسِ شعلہ کار تک
رکھے کو تیرے وعدۂ محشر کی لاج
جھیلی ہے دل نے زحمتِ صبر و قرار تک

☆

ہاتھ میں رمزِ صد عقدۂ مشکل رکھیے
ہاں کسی سروِ خوش اندام کا دامن بھی رہے

☆

ہے تری فتنۂ رفتار کا شہرہ کیا کیا
گرچہ دیکھا نہ کسی نے سرِ راہِ جاتے

علمائے علمِ عروض و بیان و قافیہ نے کچھ بیجا اور کچھ بے جا پابندیاں عائد کیں۔ متروکات کی فہرست بنائی جو خود بخود متروک ہو گئی۔ تمام عظیم اور فطری شاعروں نے وہ پابندیاں جو ذوقِ شعری کے پیر میں بیڑیاں بن رہی تھیں کاٹ کر پھینک دیں۔ کہتے ہیں مصرعہ میں تین سے زیادہ اضافات مصرعہ کو ثقیل اور بوجھل کر دیتے ہیں اور اسلئے تین سے زیادہ اضافتیں ادب میں مکروہ ہیں اور ان سے بچنا چاہیے۔ لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ اگر شاعر قادر الکلام ہو تو وہ ان اضافتوں کو اس خوش سلیقگی سے استعمال کرتا ہے کہ شعر کی روانی اور شگفتگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ میرے اس بیان کو صحیح ثابت کرنے کے لیے شی صاحب کا صرف ایک ہی شعر کافی ہے جس کے مصرعہ ثانی میں چار اضافات استعمال ہوئے ہیں۔

کر نہیں منبر و محراب و مصلیٰ سے ہمیں
طاقِ تصویرِ رخِ یارِ شکیل دامن بھی رہے

جو کیفیت زبان کے برتنے میں شی صاحب کے پاس ملتی ہے وہ ان کی انفرادی صورت حال ہے۔ ایک ہی غزل میں خوبصورت، نرم ہندی الفاظ کو اردو کے رس میں گھول کر شربت دیدار بناتے ہیں تو دوسرے شعر میں عربی فارسی کے پرشان و شوکت الفاظ سے وہ عظیم شعری مرقع تعمیر کرتے ہیں۔ جس سے غالب اور حافظ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ پھر حسرت موہانی کی طرح سیدھے سادے اردو الفاظ میں محبت کے ہار کو پرو کر عربی کے گلے میں سجا دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اردو ادب میں اس قسم کا ذائقہ سوائے شی صاحب کے خوان تکلم کے سوا اور کہیں ملتا ہے۔ نمونے کے طور پر صرف دو غزل کے اشعار میرے معاکسہ کی تحریر سے زیادہ واضح کر دیں گے۔

دا گئی سوگ میں ہے روپ نہ رس
جیسے ل کر بکھر گئے بالم
دیکھا ہوں کہ سب گل چمن میں
کوئی گل ہے کہ شعلۂ برہم
ایک ہی شب میں وقت کا دھارا
اک طرف جیز اک طرف مدھم
خوں شدہ حسرتوں کا ماتم کیا
اے بہا آرزو کری دلوم

سر سے شجر سے تو پھر نہ لئے پائے
اے سکھی سائے؟! اے سکھی ساجن
کر دیا میری سوزشِ دل نے
تختۂ گل کو آتشِ گل تن
تھا نشانِ بہار میں شامل
اک ہمارا بھی تارِ پیراہن
اور کیا ہوگی نذرِ دل اے دوست!
اک غزل، اک نوائے سازشکن

''ردیف'' فارسی غزل کی ایجاد ہے۔ عربی غزل میں قافیہ ہی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شفیع دکنی کتاب فارسی ''موسیقی شعر'' میں صفحہ نمبر 111 پر لکھتے ہیں'' بہ طور قطع کی توان ادعا کرد کہ حدود ہشتاد درصد غزلیات خوب زبان فارسی ہمہ داری ردیف ہستند و اصولاً غزل بی ردیف بہ دشواری موفق می شود'' چونکہ اردو شاعری فارسی شاعری کے زیر اثر پلی بڑھی اس لئے ردیف اردو شاعری کا اہم جزو بن کر رہ گئی ہے۔ ''ردیف'' شعر میں مسلسل تکرار کی وجہ سے شعر کی غنائیت میں اضافہ کرتی ہے اور قاری کو ایک خاص ''لے'' کیلئے آمادہ کرتی ہے لیکن صرف ردیف برائے ردیف استعمال کرنے سے شعر کی کیفیت میں چنداں اضافہ نہیں ہوتا۔ بڑا شاعر قافیہ کی چولوں کو ردیف کی چولوں کے ساتھ کچھ اس طرح بٹھا دیتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہوئے بھی ایک معلوم ہوتے ہیں اور جدا ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے مجبور لگتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق شمی صاحب کی ستر فیصد غزلیں مردف ہیں اس طرح سے تقریباً تیس فیصد غزلیں صرف قوافی پر ختم ہوتی ہیں۔ جن ردیفوں کو ہم ان کے کلام میں دیکھتے ہیں وہ عجیب ڈھنگ اور نئے رنگ و ڈھنگ سے نئی ہیں جس کی وجہ سے حسین ردیف کے ساتھ حسین قافیہ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ شمی صاحب کے پاس گھسی پٹی قدیم طرز کی ردیفیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ چونکہ غزل کی آزمائش فن کا آئینہ ہے اور کامیاب غزل میں ایک اہم حسن، حسین ردیف بھی ہے اس لئے ہم اس گفتگو کے ذیل میں مشتے از خروارے ایک غزل کے چند اشعار جو مختلف ردیف میں شمی صاحب کے موئے قلم سے نقش ہوئے ہیں پیش کرتے ہیں۔ جس کا فیصلہ آپ خود کریں گے کہ شاعر نے اس مشکل ردیف میں کیا کیا گل کھلائے اور نئی زمین میں ایک ایسے لفظ کو جو جامد تھا تغیر کی حرکت سے ایسا متحرک کیا کہ پڑھنے والے کو بھی یہ آوازیں سنائی دینے لگیں۔

یوں تو ہر سمت سے اٹھتی ہیں بڑی آوازیں
نہ کوئی جوت نہ جھنکار نئی آوازیں
گونج اٹھیں تو ہر بزم قیامت کر دیں
یہ گلوگیر شکنجوں میں کسی آوازیں
پھوٹ نکلیں گی کسی دن گل و گلشن کی طرح
ہیں بہت خاک کے تودوں میں دبی آوازیں
کبھی سنتے ہیں تہہ تیغ تڑپتے ہوئے بول
کبھی دیکھی ہیں صلیبوں پہ چڑھی آوازیں
کہیں دامن میں لگی آگ کہیں دل سلگے
ساز کے لب پہ تھمیں وہ سوز بھری آوازیں
ہم نوا میرا نہ تھا کوئی بھی پہلے اور اب
میری آواز سے ملتی ہیں کئی آوازیں
تم اٹھتے ہو وہاں اپنی الاپیں شمی
نہ سنی جائیں جہاں کان پڑی آوازیں

اسی طرح دوسری غزل میں جو عشقیہ شاعری کے معیار پر پوری اترتی ہے لیکن ایما اور اشاروں کی راہ پر گامزن ہے اور حقیقت سے لبریز ہوتی ہوئی بھی چوما چاٹی کی زبان سے پاک ہے جو شاعری کی زبان ہونے کا کمال ہے یہاں بھی قافیہ کو ردیف میں گھول دیا گیا ہے اور اگر چہ تجزیے میں قافیہ اور ردیف کی حدوں کو متعین کیا جا سکتا ہے لیکن تجزیہ تحلیل اور تحلیل میں یہ ممکن نہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

مہکی ہے، معطر ہے فضا اس کے لبوں سے
حسنِ سخن اور نام خدا اس کے لبوں سے
ہر بات شگفتہ ہی لگی اس کے لبوں سے
ہر آن شگوفہ سا کھلا، اس کے لبوں سے
ہوگا کہیں سینے میں چھپا حرفِ وفا بھی
آتی تو ہے خوشبوئے وفا اس کے لبوں سے
کچھ اور بھڑک اٹھے گی لو شمعِ وفا کی
ہرگز نہ بجھے گا یہ دیا اس کے لبوں سے
گو بعد تو کتنا ہے مگر اس پہ بھی کیا ذکر
سن لے جو کوئی نام مرا اس کے لبوں سے
دشنام بھی پائے ہوئے خوش کام بھی شمی
ہم نے بہت انعام لیا اس کے لبوں سے

ایک اور مقام دیکھئے۔

ڈر جاؤ گے جبر کا جو چہرا دکھائی دے
اچھا اسی کو جانو جو اچھا دکھائی دے
وہ جلوہ گر ہے لاکھ کرشموں کے درمیاں

لیکن نظر کو ضد ہے کہ تنہا دکھائی دے
سو رفعتیں ترے سرِ عالی سے پست ہیں
خم ہو ذرا تو اور بھی اونچا دکھائی دے
کلی یہ جانے کہ بس اب آ گئی بہار
جب چشمِ گل سے خون اُبلتا دکھائی دے

ذیل کی غزل میں ردیف کے معمولی لفظ "ہاں" کو وہ وسعت بیانی دی کہ ہر شعر میں اس کے معنی مختلف ہو گئے اور پھر قافیے سے مل کر نئے مطالب اُبلنے لگے اور لہجے میں چھپے ہوئے معنی ظاہر ہونے لگے

بات کیسی؟ بس اس قدر ہے کہ ہاں
مجرمانہ سی اک نظر ہے کہ ہاں
اس طرف بھی نگاہ خوش گزرے
عرض تم سے بس اس قدر ہے کہ ہاں
ان کا پیغام مُحصّل ہے کہ دیکھ
دل کا ایجاب معتبر ہے کہ ہاں
ڈال دوزخ میں نامۂ اعمال
میرا اقرار مختصر ہے کہ ہاں
ساغرِ مے بھی چشمِ تَر سے آج
دیکھتا مجھ کو گھور کر ہے کہ ہاں

میکالے کہتا ہے "انسانی جذبات کی گہرائیوں سے دو چشمے اُبلتے ہیں ایک کا نام شاعری اور دوسرے کا نام موسیقی ہے یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتے یعنی شاعری بغیر موسیقی کے بے مزا ہوتی ہے اور موسیقی بغیر شاعری کے بے اثر ہوتی ہے" اس رو سے ہم جانتے ہیں کہ جس شعر میں نغمگی اور غنایت بھری ہوتی ہے اس کا اثر دو آتشہ اور سحر انگیز ہوتا ہے غنی صاحب اس راز سے بخوبی واقف ہیں اور وہ معنی اور آہنگ کے ملاپ سے شہپارے اپنے مجموعہ کلام میں بکھیرتے ہیں۔

کس طرح جن کے کسی لب پہ فغاں آتی ہے
مجھ سے پوچھو مجھے پھولوں کی زباں آتی ہے
زہرِ غم پیجئے تو الفاظ میں رس آتا ہے
دل کو خوں کیجئے تو افکار میں جاں آتی ہے
بات وہ ہے جو لبِ لعل نگاراں سے چلے
خوں بھی ہو دل تو یہ تاثیر کہاں آتی ہے
خوش ادائی کے سخن ایک ہیں سارے غنی
ان کو یورپ میں بھی دلی کی زباں آتی ہے

دوسری غزل کے چند اشعار دیکھئے اور سر دھنئے۔

انداز ہیں موسم میں مرے رنگِ غزل کے
آتی ہے تری یاد بڑے بھیس بدل کے
ہاں دورِ زمانہ کوئی پیمانہ بدل کے
اب تک ترے پہلو میں وہی درد ہیں کل کے
پائے نہیں اب ساز وہ نغمے جو دمِ رقص
گونجے تھے فضا میں ترے قدموں سے نکل کے
یاد آنے لگا پھر وہ سکوں تیری گلی کا
پھر دل کا تقاضا ہے کہ بیٹھیں کہیں چل کے
کچھ اب بھی غنیمت ہیں خیالوں کے اجالے
بڑھتے چلے جاتے ہیں نگاہوں کے دھندلکے
خائف نہ ہوں اربابِ خرد اہلِ جنوں سے
وحشت میں بھی پڑتے ہیں بہت پاؤں سنبھل کے

محمد قلی قطب شاہ اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی غزلوں میں گیتوں کا رس بھرا ہوا ہے ہمیں غنی صاحب کی غزلوں میں بھی گیتوں کا ترنم سنائی دیتا ہے ہر لفظ ہر مصرع میں ساز کا ایک جادو سا ہو نظر آتا ہے لفظوں میں پوشیدہ ذاتی ترنم ORGANIC RHYTHM جب آس پاس کے لفظوں کے زیر و بم سے ٹکراتا ہے تو شعر میں نغمگی بکھر جاتی ہے اور غزل ساز اور آواز کے پیکر میں ڈھل کر ظاہر ہوتی ہے۔

بڑے دکھ میں خسارے ہیں یارو
مگر کیا کریں دل کے مارے ہیں یارو
شبِ ماہ میں مہ پارے ہیں یارو
قیامت کے سامان سارے ہیں یارو
جو اترے چلے آ رہے ہیں زمیں پر
یہ کس آسماں کے ستارے ہیں یارو
کہاں تک یہ اپنے پرائے کا قصہ
سبھی غم ہمارے تمہارے ہیں یارو
کہاں چھوٹ سکے ہیں غمِ زندگی سے
یہ غم زندگی سے بھی پیارے ہیں یارو
میسر کے دل کے تاروں کو چھیڑا
بہت غور کر اس میں ہارے ہیں یارو

دوسری غزل کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

محبت کے بندھن یہ کچے سے دھاگے
ہر دم ہر زور رکھتے تھے آگے

بہت ہم کو پیچھے زمانے نے چھوڑا
چلے تھے بہت ہم زمانے سے آگے
رواں ہیں سبھی ایک منزل کی جانب
تا تیری دنیا سے کیا لے کے بھاگے

آج سے تقریباً پچاس (50) سال قبل مشفق خواجہ نے قومی زبان کراچی میں شمّی کی غزل پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا "شمّی صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بہترین اظہار غزل ہی کے پیرائے میں ہوا ہے۔ وہ اس صنف کے فنی لوازمات سے پوری طرح واقف ہیں اور انھیں یہ بھی احساس ہے کہ یہ ذریعہ اظہار خیالات کے بے ربطی کا آئینہ دار نہیں ہوتا بلکہ ایک مربوط اور مسلسل نظامِ فکر کی عکاسی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل زندگی اور اس کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ یہ شمّی صاحب کا کمال ہے کہ انہوں نے زبان کے سلسلے میں احتیاط برتنے کے باوجود روایتی مضمون میں زبان دانی کا کہیں ثبوت نہیں دیا اور یہی وجہ ہے کہ ان کی ایسی غزلیں جو انتہائی مشکل زمینوں میں لکھی گئی ہیں پڑھتے ہوئے کہیں بھی آورد اور تصنّع کا احساس نہیں ہوتا۔"

وہی اک فریبِ حسرت تھا کہ گلشنِ نگاراں
سو قدم قدم پہ کھایا بطریقِ پختہ کاراں
مرے آشیاں کا کیا ہے مرا آسماں سلامت
ہیں مرے چمن کی رونق یہی برق و باد و باراں
مرے ایک دل کی خاطر یہ کشاکشِ حوادث
ترے ایک غم کے بدلے یہ ہجومِ غم گساراں
وہ نگاہِ ناز پرور کہ عطائے دلبراں ہے
نہ نصیبِ ہر نگاراں نہ برائے خواستگاراں
مری وحشتوں نے جس کو نہ بنا کے راز رکھا
وہی راز ہے کہ اب تک ہے بیانِ رازداراں
کسی منچلے نے رکھا ہے مئے سخن سے بھر کر
کہ یہ ساغرِ دل افزا ہے بہ بزمِ دل فگاراں

☆

سونی کالی رات ہے جی پر بھاری سی
آؤ تم سے بات کریں اک پیاری سی
لوٹ رہا ہے جیسے بچھڑا میت کوئی
دیکھو ہوا کیا پھرتی ہے مت ماری سی
دامن پر ہیں گیت کے بکھرے بکھرے پھول
آئی کہاں سے رنگ کی پچکاری سی

محاسنِ شعر میں صنائع بدائع کے علاوہ علم بیان کے امور یعنی تشبیہات، استعارات، مجاز مرسل اور کنایات کو بھی بڑا دخل ہے۔ آج کل نوجوان شعرا قدیم استعارات اور تشبیہات کو لکیر کے فقیر بن کے پیٹ رہے ہیں اور چونکہ قارئین کا مطالعہ کمزور ہو چکا ہے وہ انھیں جدید سمجھ کر سر دھن رہے ہیں۔ تشبیہ شعر کی جان نہ سہی اس کی آن بان اور شان ضرور ہوتی ہے۔ معمولی شعراء تشبیہ سے خیال کو قابل رنگین اور بیان کو دلکش بناتے ہیں لیکن عظیم شعراء اپنے فکر و خیال اور احساس کی عظمت اور فضیلت کو روشن کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں تا کہ ہر شخص اپنی فکری استطاعت اور ذہنی قدرت کے مطابق کسی منزل تک پہنچ سکے اور یہی تشبیہات کی گہرائی اور گیرائی شمّی صاحب کے کلام میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔

بزمِ ہستی ہے صنم خانۂ ویراں کی طرح
آدمی دہر میں نایاب ہے یزداں کی طرح

☆

یوں ہیں آسودہ شانوں پہ گیسو تیرے
جیسے آشفتہ حالوں کو نیند آ گئی

☆

ہم تو کہتے ہیں صبا قطرۂ شبنم اس کو
جو کسی نرگسِ بیمار کے کام آ جائے

☆

وہ سنبھلے سے لہجے میں کچھ کچھ ہنسی
کہ جیسے چھلکا ہو گگری سے جل

شمّی کا تغزل روایتی ہونے کے ساتھ ساتھ جدید اور ایجادی ہے۔
بعض اکابرین کہتے ہیں کہ ان کے روایتی رجحان پر داغؔ اور حسرتؔ کی شاعری کا اثر ہے لیکن یہ اثر شاید اتنا کم اثر ہے کہ یہ رنگ کہیں نظر نہیں آتا۔ شمّی کی شاعری میں سراپا نگاری، معاملہ نگاری، ادابندی، رعایت لفظی اور دوسری لغویات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہاں لہجے میں متانت لفظوں میں شگفتگی زبان برتنے میں مہارت داغؔ کو بھی اور دوسرے دہلی کے دبستان سے ورثے میں ملی تھی۔
شمّی سادہ نرم شستہ اور شگفتہ الفاظ میں بڑی موثر اور دلکش بات کہہ دیتے ہیں۔ جامد اور بے حس لفظوں میں متحرک پیکر تراشتے ہیں۔ خیالات کی خوشبو دیر تک قاری کے دماغ میں مہکتی رہتی ہے۔ ان تمام کرشموں کے باوجود عجز و انکساری تو دیکھئے

بن گئی یوں ہی سخن میں ذرا نوک پلک
میرے لہجے میں کہاں ہے میرے سینے کی کسک

اور پھر اپنے دل کو یہ کہہ کر منا لیتے ہیں۔

میسر کے دل کے تاروں کو چھوا
بہت نغمہ گر اس میں ہارے ہیں یارو

شیؔ کی غزل میں ان کی زبان و بیان پر قدرت اور احساسات کی ندرت، اور نئے خیالات کی کثرت اور خوش آئند زندگی کی حسرت صاف دکھائی دیتی ہے۔ غزل کے چند اشعار دیکھئے وہ غزل کو معتبر نہیں مرقع بنانے کے خواہاں ہیں اگرچہ ان کا عقیدہ بھی ہے۔

انتہا ہی نہیں ہے کہ تیرے بن نہ رہا جائے
وہ جاں پہ بنی ہے کہ جئے بن نہ رہا جائے
غم بڑھ سکی تجھے افسردہ سکی دل
اور پھر کوئی تدبیر کئے بن نہ رہا جائے
ہے دل ہی وہ مادوں کہ ہو تدبیر سے نومید
اور پھر کوئی تدبیر کئے بن نہ رہا جائے
ہر چند کہ فرصت میں تری زہر ہے جینا
کچھ قہر ہے ایسا کہ جئے بن نہ رہا جائے

☆

اک مہلک سی دم تحریر کہاں سے آئی
نام میں تیرے یہ تاثیر کہاں سے آئی
پہلوئے ساز سے اک سوچ ہوا گزری تھی
یہ چھنکتی ہوئی زنجیر کہاں سے آئی
کو ترستا ہے ابھی تک تری تحریر کو دل
پھر بھی جانے تری تصویر کہاں سے آئی
یونہی ہو جاتا ہے قسمت سے کوئی غم پرور
عشق کے ہاتھ میں تدبیر کہاں سے آئی

شیؔ صاحب کی غزلوں میں خارجیت کے مقابلے میں داخلیت کو بڑا دخل ہے اگرچہ ان کی اولین غزلوں میں خارجیت کی طرف بھی میلان رہا ہے۔ شیؔ صاحب کی غزلیں حسرتؔ کی غزلوں کی طرح سراپا طرب و نشاط یا فانیؔ کی غزلوں کی طرح غم انگیز و یاس کا مرقع نہیں بلکہ ان دونوں حدوں کے درمیان ایک وادی احساس ہے جو تلخی سے دور اور سچائی سے قریب ہے جس میں ایک خوش آئند فردا کی جھلک نظر آتی ہے اور یہی کیفیت بے قراری میں قرار فراہم کرتی ہے۔ ذیل کی غزل کا ہر شعر حلقۂ زنجیر طرب کی زبان بن کر اپنے تخلیق کار کی سحر بیانی اور زبان دانی کا اعتراف کر رہا ہے۔

ایمائے غزل کرتی ہے موسم کی ادائیں
اک موج ترنم کی ہوں میں ہیں فضائیں
آ ہم تجھے محراب تمنا میں سجائیں
اے شمع وفا دور تیرے سر کی بلائیں
ہر گام پہ کہتی ہیں وہ بدمست ادائیں
جب ہاتھ میں خنجر ہو تو کیوں ہوش میں آئیں
آئینے سے ہوتی ہیں ملاقیں کہ کسی کو
جب خوب ملا ہو تو کس طرح منائیں
ٹھہرا ہوں اسی بات پہ میں لائق تعزیر
جس بات پہ بخشی گئیں اوروں کی خطائیں
اے مسکین خوبان زماں، شہر عزیزاں
ہم بھی کبھی بکتے ترے بازار میں آئیں

ہم اپنی گفتگو کو مولانا نیاز فتح پوری اور جوش ملیح آبادی کے جملوں پر تمام کریں گے تو شیؔ صاحب کی شعر و ادب کی خدمت پر تمغۂ ستارۂ امتیاز سے کچھ کم نہیں۔ مولانا نیاز فتح پوری نے شیؔ صاحب کو اس عہد کے خوش فکر اور خوش گو شاعروں میں سب سے زیادہ صحیح اور بے عیب شعر کہنے والا بتایا ہے وہ مزید کہتے ہیں جو چیز مجھے پسند آئی وہ ان کی ادبی احتیاط اور ان کا فنی رکھ رکھاؤ ہے وہ بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔

جوش ملیح آبادی کہتے ہیں " شیؔ صاحب اردو کی نوک پلک سے اس قدر واقف ہیں کہ ان کی اس لیاقت کا کوئی دوسرا آدمی آسانی کے ساتھ نہیں مل سکے گا" لیکن ان تمام عظمتوں کی حامل شخصیت اپنی عجز و انکساری اور منکسر المزاجی کی وجہ سے ہمیشہ شہرت سے کتراتی رہی جس کا خود اعتراف بھی کرتے ہیں۔

شیؔ مزاج دل نے نہ دی فرصت نگاہ
شہرت ہزار نام مرا پوچھتی رہی

جب تک اردو شاعری کے افق پر غزل کا پرچم لہراتا رہے گا، شیؔ کا نام بھی بلندیوں پر پرواز کرتا رہے گا۔ اگر شیؔ صاحب تیس (30) سال سے زیادہ عرصہ لسانیات اور لغات کے جنگلوں کو دریافت کرنے میں صرف نہ کرتے اور اپنی پوری توجہ غزل پر صرف کر دیتے تو ان کی غزل کا معیار کیا ہوتا خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اگرچہ اس طولانی ادبی سفر میں انہوں نے ہمیں دوسری نعمتوں سے لبریز اور سرشار کر دیا جس کے لیے ہم شیؔ صاحب کے تہہ دل سے مشکور اور ممنون ہیں۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

☆

# جمیل الدین عالی کی کالم نگاری

امین راحت چغتائی (راولپنڈی)

جمیل الدین عالی کی کالم نگاری و سفر نامہ نگاری کم و بیش چوالیس سال کا قصہ ہے۔ اُن کے کالموں کی مطبوعہ کتابوں کی ضخامت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے کراماً کاتبین سے بھی کوئی دو چار صفحے کم لکھے ہوں گے وہ بھی اس خوف سے کہ آخر حشر کے روز انھیں کے لکھے سے واسطہ پڑے گا۔ ان کالموں میں اپنا غم، تیرا غم، جہاں کا غم، سبھی کچھ ہے۔ بلکہ کالم کیا ہیں پنساری کی دکان ہے۔ مفرد و مرکب سبھی ادویات دستیاب ہیں۔ بس اس فرق کے ساتھ کہ پنساری کی دکان پر مرض یا نسخہ بتا کر دوا خریدنی پڑتی ہے۔ یہاں کالم پڑھتے جایئے اور اپنے اپنے مرض کے اسباب و علل تلاش کرتے جایئے۔ بیرونی ممالک کی سیر پر مشتمل کالموں کو "معجون فلک سیر" سمجھ لیجیے۔

اسے تمہید نہ سمجھئے، قصہ ہی طولانی ہے۔ میرے سامنے تو "کارگاہِ وطن" اور "بارگاہِ وطن" کے صرف ایک ہزار چار سو سولہ صفحات چھپے ہوئے ہیں جبکہ "کارگاہِ وطن" کے دیباچہ نگار ادیب جمیل صاحب نے ان کے مطبوعہ کالموں کے صفحات کی مجموعی تعداد چار ہزار ایک سو تیرہ بتائی ہے۔ ظاہر ہے کوئی جائزہ ہو سکا تو اتنے صفحات پڑھے گا۔

بہر حال میں عالی صاحب کے کالموں سے اپنی بساط کے مطابق جو کچھ اخذ کر سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ان کی تحریر میں ایک معروضی انداز فکر ہے۔ لب و لہجہ دھیما ہے۔ عالمِ اسلام کے مسائل پر تحمل و بردباری سے بات کرتے ہیں۔ موضوعات متنوع ہیں۔ سیاسیات، اقتصادیات، مالیات، عمرانیات بلکہ وہ تمام موضوعات جن کے ساتھ "یات" لگتا ہے ان کے حیطۂ تحریر میں موجود ہیں۔ اور خوبی یہ کہ ہر موضوع پر پوری تحقیق، تجزیے اور گہرے مشاہدے کے ساتھ رائے دیتے ہیں۔ اچھی بات یہ بھی ہے کہ فتویٰ صادر نہیں کرتے۔ وہ مختلف موضوعات پر اتنی وسیع معلومات رکھتے ہیں اور اسلوب بیان ایسا شائستہ، شستہ اور شگفتہ کہ انھیں "علّامی" کا خطاب دینے کو جی چاہتا ہے۔ واضح رہے کہ برصغیر کی پوری مغلیہ تاریخ میں صرف تین علّامی گزرے ہیں۔ ایک ابوالفضل، دوسرے افضل خاں اور تیسرے سعد اللہ خاں۔ افضل خاں شاہجہان کے دیوانِ کل (وزیر اعظم) تھے۔ آگرہ میں "چینی کا روضہ" انہی کا خالی مقبرہ ہے کیونکہ علّامی افضل خاں کا انتقال لاہور میں ہوا تھا اور ایک روایت کے مطابق وہیں دفنا دیے گئے تھے۔ سعد اللہ خاں، شاہجہان کے معتمدِ خاص، منصرمِ اعلیٰ تھے۔ نیز علم و فضل اور فہم و تدبر میں بے مثال تھے۔

یوں تو عالی صاحب کے کالموں میں علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کا بھی بڑے اہتمام سے ذکر ملتا ہے اور اس سلسلے میں بھی ان کا تنقیدی و تجزیاتی مکالمہ قابلِ صد ستائش ہوتا ہے لیکن اقتصادی مسائل اور سائنسی میلانات کے فروغ پر وہ بہت محنت کے ساتھ بطورِ خاص لکھتے ہیں۔ اور مستقبلیات پر توجہ وقت زور دیتے رہتے ہیں۔ یہ اُن کا بے حد پسندیدہ موضوع ہے۔ بین الاقوامی سیاسیات پر بھی اُن کی نظر گہری ہے اور بڑے مدبرانہ انداز میں عصری مسائل کا تجزیہ کرتے ہیں۔

عالی صاحب کے کالموں کا ایک حصہ سیر و سیاحت پر مشتمل ہے۔ وہ دنیا کے بیشتر معروف ممالک میں گھوم آئے۔ شاعر کے کا پکا انھیں بے چین رکھتا ہے۔ گردے میں پتھری ہو، بخار ایک سو چار درجے کا ہو۔ علاج کے لیے جیب میں ڈالر نہ ہوں مگر سات سمندر پار مشاعرہ پڑھنا لابدی۔ نقاہت سے چلنا دشوار مگر کیا پروا، مثل بچے ہیں۔ ابو لہو نے گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھ کر اپنی ٹانگیں تیز بھی کر لیں تو یہ بخار میں ایئرپورٹ پر چند قدم چل کر ٹانگیں تیز بھی نہیں کروا سکے۔ عالی صاحب اپنے کالم کو "اظہاریہ" کہتے ہیں۔ یہ اظہاریے بیرونی دنیا کی سیر و سیاحت میں خاصے دلچسپ اور معلومات افزا ہوتے ہیں کہ ان میں بیشتر بھی اپنا اعجاز دکھاتے ہیں۔ بلکہ جادو کی طرح سر چڑھ کر بولتے ہیں۔ اور جب تک دم ہوا نہ جائے بولتے رہتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ "تکبیر" سیاحت میں اتنا کام بھی نہیں دیتا جتنا بیئر وسٹر۔

سیر و سیاحت پر مبنی زیادہ تر کالم "کارگاہِ وطن" میں پائے جاتے ہیں۔ مشاہدہ گہرا اور اسلوبِ تحریر دلچسپ۔ عالی صاحب سفر ناموں پر اس لیے بھی زیادہ توجہ دیتے ہیں کہ ان میں "نمک" کی نمود آسان ہوتی ہے۔ نیاگرا دیکھنے جاتے ہیں تو جس گھر میں ٹھہرتے ہیں وہاں ان کے لیے ٹیلی فون کالوں کا تانتا بندھ جاتا ہے جسے نمونہ از خروارے کے طور پر "ٹیلیفون کا عذاب" (کارگاہِ وطن) بھی پیش کیا جا سکتا ہے لیکن اس اقتباس کے ساتھ کہ یہ کینیڈا اور امریکہ کے نو شہروں میں سے ایک کا سفرنامہ ہے۔ بقول عالی صاحب بہانہ مشاعروں کا ہی ہوتا ہے لیکن حسبِ معمول معلومات کو دوستانے میں بیشتر خوب کام دیتے ہیں۔ اور وہ "ٹیلیفون" کے تعلق سے لے کر درجۂ حرارت، آبادی، تیل کے ذخائر اور سڑکوں سے برف پگھلانے کے لیے نمک کے استعمال تک قارئین کو مرعوب کرتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں بیشتر ختم ہو جاتا ہے وہاں عالی صاحب قارئین کو مبہوت کرنے کے لیے کوئی اور حربہ استعمال کرتے ہیں۔ ٹی وی پر اب بھی آنجہانی ہنری فورڈ کی زندگی کے کچھ واقعات بیان ہو رہے ہیں اور فورڈ کے نوادر دکھائے جا رہے ہیں۔ ان میں ایڈیسن کی "آخری سانس کی شیشی" بھی ہے۔ فورڈ کے وارثوں نے ڈاکٹروں کو خطیر رقم دے کر ایڈیسن کی بوقتِ مرگ آخری سانس ایک ٹکی میں اور ٹکی شیشی میں بند کروالی تھی۔ مشاہدے کا مشاہدہ، کہانی کی کہانی اور نیا زاویہ عبرت بھی۔ امریکہ والے اپنے سائنس دانوں کو کس قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہم ـــــ نوک جھونک سے قطع نظر، عالی صاحب نے اس کالم سے اپنی قوم کو تین پیغامات دیے ہیں۔ "ریجنسن" سات سو افراد کی بستی سے ایک مضبوط منصوبہ بندی سے چھ لاکھ افراد کا شہر بن گیا اور اب کینیڈا میں تیل کا سب سے بڑا مرکز۔ سات مہینے سخت جاڑوں کے مگر بڑی بڑی فصلیں پھر بھی اُگتی ہیں۔ اور اپنے مشاہیر کی قدر و منزلت۔ مکالمے کا خلاصہ فکر و عمل کی ہم آہنگی سے کہتے ہیں وہ کہ مدد دیے مگر ہاتھ سے جت

رہ گئی۔

اور شاعر سے کینیڈا کے ہوں یا امریکہ کے، دتی کے ہوں یا دلی و لکھنؤ کے، حالی صاحب سوزشِ گلو کی ہو تو (حق جو کے احترام میں) کشاں کشاں چلے جاتے ہیں۔ (کارگاہِ وطن، صفحہ ۲۵۹) اور مشاعرہ پڑھ کر مردِ گلو گی ہو تو لوٹ آتے ہیں (ایضاً صفحہ ۳۰۲) یعنی آگے چلیں گے دم لے کر۔

اُن کے سیاحتی کالم کا ایک وصف یہ ہے کہ اُس سے کچھ معروضی سوچ ابھرتی رہتی ہے۔ مثلاً اردو کو ہی لے لیجیے۔ حالی صاحب کا ایک پرانا کالم دیکھ رہا تھا، ۱۹۸۵ء کا۔ وہ دلی کے افسانہ سیمینار کے حوالے سے اپنی یادداشتیں تازہ کر رہے تھے۔ اور بتا رہے تھے کہ بھارت میں "مقبوضہ کشمیر کو چھوڑ کر بہار کے سوا کسی ریاست کی قانونی زبان بھی اردو نہیں مگر وہاں ہر جگہ مشاعروں، مذاکروں اور کتابوں کا زور ہے۔" پھر انھیں امریکہ یاد آ گیا جہاں کی جامعات میں اردو تحقیق و تدریس کے شعبے قائم ہو چکے ہیں۔ انھوں نے کینیڈا کا بھی ذکر کیا اور بتایا کہ "ٹورنٹو تو لندن کے بعد پوری مغربی دنیا کا سب سے بڑا اردو مرکز بن چکا ہے۔"

حالی صاحب ایک بار ناروے (ایضاً صفحہ ۵۰۹) بھی گئے تو انھیں پتا چلا کہ وہاں برف پر پھسلنا ضروری ہے حتیٰ کہ وہاں کا بادشاہ جو اُن دنوں (۱۹۸۷ء) چوراسی برس کا ہو چکا تھا، برف پر پھسلنے کا بہت ماہر تھا مگر اب عمرِ ضعیفی کے ارتکاب کے باعث کچھ ادھم ادھم سا رہنے لگا تھا۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ ناروے میں سینما قومی ملکیت میں ہیں اور سینماؤں کی آمدنی سرکاری خزانے میں نہیں جاتی بلکہ ثقافت کے تحفظ پر خرچ ہوتی ہے۔ دیکھا آپ نے، وہ دور دور سے بھی کوئی نہ کوئی اچھی بات نکال کر ہمیں بالواسطہ سوچنے پر اکساتے رہتے ہیں۔

حالی صاحب کا ایک وصف اور بھی ہے۔ وہ اپنے اوپر خود بھی ہنسنا جانتے ہیں۔ دلی کے مذکورہ صدر افسانہ سیمینار میں جب ہندوستانی نقادوں نے بار بار منشا یاد اور رشید امجد کے افسانوں کا ذکر کیا تو روٹھے روٹھے واپس آ گئے۔ "اُن کی چند کتابیں جلدی جلدی دوبارہ پڑھیں تو محسوس ہوا کہ یہ واقعی اُن کا حق تھا۔" (کارگاہِ وطن، صفحہ ۱۰۳)

اب اُن کی کالم نویسی کا ایک اور پہلو دیکھیے۔ انھوں نے عرصہ ہوا، راولپنڈی میں اوجڑی کیمپ کے حادثے اور خواجہ اجمیر نگری کراچی کے سانحے پر کالم لکھا تھا (کارگاہِ وطن، صفحہ ۱۲۱) اور ساتھ ہی بتایا تھا کہ ان سانحوں کے باوجود لوگ حسبِ سابق عید کارڈ بھیجتے رہے یعنی ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تاہم انھوں نے لوگوں کے اس رویے پر بھی احتیاط برتی۔ پاکستانی قوم کو بے شرم نہیں، "بے غم" کہا اور ساتھ ہی اینگلز اور مارکس کے اس نظریے کو دہرایا کہ بیگانگی کسی بھی قوم، کسی بھی ملک کی سب سے بڑی اور سب سے خطرناک بیماری ہوتی ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ حالی صاحب بعض اوقات کاٹ دار کالم بھی لکھ جاتے ہیں۔

میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ "منتخبات" حالی صاحب کا بہت پسندیدہ موضوع ہے اور انھیں جب بھی موقع ملتا ہے اس پر ضرور لکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں کارگاہِ وطن (صفحہ ۱۸۳) کا ایک کالم دیکھیے جس میں انھوں نے پاکستانی قومیت کے حوالے سے کچھ اشارے کیے ہیں۔ مثلاً صوبوں اور زبان کے معاملات میں "حق، اہلیت اور انصاف" سے کام لینا چاہیے تھا۔ ساتھ ہی وہ یہ کہتے ہیں کہ محض لسانی تشخص اور صوبائی حدود تقسیمِ معاش کے لیے بنائے انصاف نہیں ہے کہ پاکستان کی تشکیل میں مقامی ہی نہیں، پورے جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کا حصہ ہے مگر اس نظریے کو پرورش ابھی تک نہیں ملی۔ مشترک قومیت کی تعمیر ہو تو کیسے؟ طبقاتی استحصال پر قدغن کم پڑتی ہے۔ غور کیجیے، بہ سبیلِ تذکرہ کیسی فکر انگیز باتیں کتنی سادگی اور روانی سے قلمبند ہوتی ہیں۔

حالی صاحب نے ایک مرتبہ (۲ اگست ۱۹۸۹ء) جب بے نظیر وزیرِ اعظم تھیں، اپنے کالم میں قومی یک جہتی کے حوالے سے انھیں بھی مشورہ دیا تھا کہ "اپنے پسندیدہ دانشوروں کو ہی جمع کیجیے اور انھیں صرف خطاب کرنے کی بجائے اُن کی بھی سنیے۔" (بارگاہِ وطن: صفحہ ۱۲) ظاہر ہے کہ یہ مشورہ کسی ایک عہد کے حکمرانوں کے لیے ہی نہیں ہے۔ حالی کے کالموں کو کہیں سے پڑھ جائیے ان میں اجتماعی سوچ اور اجتماعی اصلاح کا کوئی نہ کوئی حوالہ ضرور ملے گا۔ سچ میں وہ تبصرہ بھی پڑھتے جائیے جو ان کالموں پر یار لوگ کرتے رہتے ہیں اور انھیں "جاہلی" کے طعنے دیتے رہتے ہیں۔

زیرِ نظر مضمون لکھتے وقت (۸ نومبر ۲۰۰۸ء) حالی صاحب کا ایک ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۹ء کا تحریر شدہ کالم (بارگاہِ وطن: صفحہ ۱۰۳) نظر نواز ہوا۔ مضمون "عدل" کا ہے جس میں ایک یونانی سیاست کا تھراسی میکس اپنے گروہ مقابل کو سمجھا رہا ہے "میرا دعویٰ ہے کہ عدل طاقت ور کے مفاد کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔" اس پر حالی صاحب اپنا حاشیہ چڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "عہدِ جدید نے اس میں اقتدار کے ساتھ ساتھ دولت کو بھی شامل کر دیا ہے۔" اور پھر افلاطون کا یہ جملہ دہراتے ہیں کہ "عدل انسانوں کا اجتماعی بندھن یا عہد نامہ ہے عدل کے نفاذ کے لیے۔ ایک عزم ہے انصاف کے لیے جو ایک سیاسی معاشرے کا قانونی اصول ہے۔" اور پھر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ "وہ فرسودہ بڑھا نہ دولت کو اہمیت دیتا ہے نہ اقتدار کو بلکہ کچھ آئیڈیل قسم کی باتیں کرتا ہے۔" جب اس پر بھی تسلی نہیں ہوتی تو حسرت موہانی کا مصرع "جنوں کا نام خرد رکھ دیا، خرد کا جنوں" ٹانک کر ٹھنڈا سانس لیتے ہیں۔

اب ان سطور کو جو آج سے اٹھارہ سال پہلے لکھی گئی تھیں، جس عہد کے سیاق و سباق میں چاہیں پڑھ لیں۔ سچائی کی یہی خوبی ہے کہ وہ کبھی پرانی نہیں ہوتی۔

بہر حال، آدمی پھر آدمی ہے اپنی اچھائیوں اور برائیوں سمیت اور حالی صاحب بھی آدمی ہیں۔ انھیں ایک تو "تکبیر کا کمپلیکس" نے مار رکھا ہے۔ مشہور کالموں میں اس لفظ کے استعمال سے مجاہدت کا اظہار کرتے ہیں اور بے مزہ کرتے ہیں مگر پاکستانیت کی ڈفلی بھی بجاتے ہیں۔ میں "کارگاہِ وطن" اور "بارگاہِ وطن" کے متعلقہ صفحات کے نمبر عمداً نہیں لکھ رہا ورنہ کہیں تکبیر، کہیں

کیری کہیں شہر کیری اور کہیں کیران پاکستان کی ''اصطلاحات'' عجز اظہار کی غماز محسوس ہوتی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ پاکستان کے ابتدائی عہد میں ایسا ہو مگر اب تو یہ لفظ کب کا متروک ہو چکا۔ کالم مرتب کرتے وقت ایسے الفاظ کے حامل جملوں پر نظرثانی کر لی جاتی تو بھی زور بیان میں ضعف نہ آتا۔

علاوہ ازیں کچھ سرسری سے لکھے ہوئے کالم بھی ہیں۔ مثلاً کارگاہ وطن کے صفحات ۸۲،۸۶،۱۰۱،۱۰۷،۱۱۳،۲۲۱،۲۵۸ اور ۲۶۳۔ یہاں کالموں کی تفصیل بے جا طوالت کا باعث بنے گی تاہم ان میں سے کچھ تو ایسے کالم ہیں جو برائے کالم لکھے گئے ہیں۔ کچھ کالم بہ مشرز بونی ہیں اور کچھ بے ربط۔ ان کالموں پر بھی نظرثانی کی جا سکتی تھی۔ ضخامت قدرے کم ہو جاتی تاثر قدرے بڑھ جاتا۔ لیکن ضخیم کتابوں میں ایسا ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ایڈٹ کرنے والا بہت سخت گیر ہونا چاہیے یا لکھنے والے کو قدرے رجوع کرنا چاہیے۔

☆

افسانہ

# پگلو مار

کوثر صدیقی (بھوپال، بھارت)

لوگ اُسے پگلی ماں کہتے تھے لیکن میں اُسے پگلی نہیں مانتا تھا وہ کہاں سے آئی تھی اور کس کی ماں تھی کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ ہر شخص نے اُسے اسی حالت میں دیکھا تھا۔ ادھیڑ عمر کی دلکش خدوخال کی یہ عورت سب کے لیے پہیلی تھی۔ اس کے کھچڑی بال کاندھوں پر پڑے رہتے تھے۔ سفید رُخسار مرجھائے ہوئے پھول کی طرح سکڑے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں دریا کی گہرائی اور متلاطم موجوں کی طرح بے چینی تھی۔ ہر وقت کسی گہری فکر میں غرق شہر کے گلی کوچوں میں سر جھکائے زیر لب کچھ بولتی ہوئی نظریں جھکائے زمین پر کچھ تلاش و تجسس کی انداز میں گھومتی پھرتی رہتی تھی۔ کوئی کہتا تھا اس کا شوہر دنگوں میں مارا گیا کوئی کہتا تھا اس کے سب بچے جنگ میں شہید ہو گئے۔ وہ ہمیشہ اپنے ہاتھ میں کچھ کاغذ لیے گھومتی رہتی تھی۔ چلتے چلتے ٹھٹک کر آسمان کی طرف دیکھتی اور کہتی وہ دیکھو آسمان میری دعا سے رکا ہوا ہے۔ میں نے ستاروں کو بجھنے سے روک رکھا ہے۔ وہ کاغذ دکھا کر لوگوں سے کہتی اگر تم آسمان کو گرنے سے روکنا چاہتے ہو تو کرو اس کاغذ پر دستخط۔ کبھی کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر اس کے سائے کے قصیدے گنگناتی۔ پیڑ کتنا مہربان ہے۔ محبت اور فراخ دلی کا نشان ہے۔ قدرت کی عظمت کا علم بردار، شجاعت کا پیکر، گرمی دھوپ سے بے پر بیگانہ، مسافروں کا میزبان، منت کا سائبان، اپنے پیروں پر کھڑا کسی سے کھانا مانگے نا پانی۔ قطب کی طرح اپنی جگہ پر اٹل۔ زمین میرا آنگن آسمان میری چھت ہے۔ پوری دُنیا میرا کنبہ ہے۔ اس کنبے کی میں ماں ہوں۔

اکثر وہ ملٹری کینٹ کی طرف دوڑی ہوئی جاتی اور دروازہ بند پا کر باہر زمین پر بیٹھ جاتی۔ وہ گیٹ کے پہریداروں سے چیخ چیخ کر کہتی تم مجھے پہچانتے نہیں میں تیری ماں ہوں۔ مجھے اندر جانے دے۔ مجھے معلوم ہے دروازے کے اندر آسمان سے چھپا کر بڑے بڑے بموں کی چھت کے نیچے کیا ہوتا ہے۔ وہاں آسمان کو گرا کر چاند ستاروں کو لوٹنے کی سازش کی جا رہی ہے۔ ارے بے وقوفو! چاند ستارے نوچ لو گے تو اندھیرا نہیں ہو جائے گا۔ آسمان گر سکے گا تو کیا تم سب دب کر مرنے سے بچ جاؤ گے؟ کبھی کہتی تم نے اسرافیل کو صور پھونکنے کے لیے آنکھیں بند کر رکھا ہے۔ صور خدا کے حکم سے پھونکا جائے گا تمہارے کہنے سے نہیں۔ مجھے اندر جانے دو میں اسرافیل سے کہوں گی میں پاگل نہیں ہوں۔ پاگل وہ لوگ ہیں جو دروازے کے اندر مجھ سے ڈر کے بیٹھے ہیں۔ انہیں نے تمہیں یہاں بند کر رکھا ہے۔ وہ سب بے مذہب ہیں۔ اُن کے دھرم گرنتھ اُلٹے ہیں۔ اُن میں انسانوں کو اُن کے خون سے اپنی موٹریں چلانے کا طریقہ لکھا ہے۔ لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو جلا کر اُن میں چھرے چاقو اُگا کر معصوموں کے گلے کاٹنے کی ترکیبیں لکھی ہیں۔ کبھی کہتی میرے بیٹوں کو آزاد کرو۔ انہیں قتل کرنا مت سکھاؤ۔ مجھے دونوں بیٹے پیارے ہیں۔ قاتل سے کہو پاگل کو کیوں مارتا ہے۔ کبھی کہتی ہے اسرافیل کو صور نہیں پھونکنے دوں گی۔ میں زندگی ہوں۔ مجھے جینا ہے۔ میرے بیٹوں کو باپ کے کام مت سکھاؤ۔ انہیں پاگل بناؤ قاتل مت بناؤ۔

ایک دن سرحد پر جنگ چھڑ گئی۔ چھاؤنی کے فوجیوں اور توپ خانے کو کوچ کا حکم ملا۔ ایسا لگا جیسے پگلی ماں کو اس کوچ کا الہام ہو گیا ہو۔ وہ بدحواسی کے عالم میں چھاؤنی کی طرف دوڑی۔ چھاؤنی کا گیٹ کھلا تھا اور توپ بردار ٹینک باہر نکل رہے تھے۔ وہ گیٹ کے سامنے دوڑ کر لیٹ گئی اور چیخنے لگی میں ان توپوں کو اپنے بیٹوں پر نہیں چلنے دوں گی۔ مجھے پہچانو میں تمہاری ماں ہوں پگلی ماں جو تمہارے غم میں پاگل ہو گئی ہے۔ اگر تم ٹینک آگے بڑھاؤ گے تو میں خدا سے کہہ دوں گی کہ پہاڑوں کے ٹکڑے کر کے ان نافرمان بد دماغ بیٹوں کے سر پر دے مارنا کہ یہ پھر کبھی نہ اُٹھ پائیں۔ سورج کو سوا نیزے پر کر دے تا کہ ان کے بھیجے پگھل کر باہر آ جائیں اور اگر خدا کو یہ منظور نہ ہو تو طوفان نوح پھر بپا کر دے اور ان ظالموں کو غرق کر دے۔ میں نے دیکھا ایک فوجی نے بڑھ کر پگلی ماں کو گھسیٹ کر راستے سے جیسے ہی ایک طرف کیا وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔

میں نے سوچا پگلی ماں کو شاید یہ پتہ نہیں کہ پاگل کو تو قاتل نے پہلے ہی قتل کر دیا تھا اب تو دنیا میں سب قاتل کے ہی بیٹے ہیں۔

# اے شہرِ تمنا

## بغداد

شبنم رومانی (کراچی)

اے شہرِ تمنا! میں ترے نام کے صدقے
دنیا کا ضمیر اب تری جانب نگراں ہے

رزمِ حق و باطل میں ہے فولاد کی مانند
اور کفر کی یلغار پہ اک ضربِ گراں ہے

دشمن کے لئے جنگ مسلماں کے لیے عزم
جو جنگ سے لڑ جائے وہ عزم جواں ہے

ہر عہد میں تاریخ بناتا ہے مسلمان
ہر توپ کی آواز مورّخ کی زباں ہے

ہر سمت ہے کھیتوں میں شجاعت کی نئی فصل
ہر بازوئے ہمت میں نیا خون رواں ہے

ہر پھول ہے دشمن کے لیے آتشِ دوزخ
ہر خار عدو کے لیے اک نوکِ سناں ہے

مومن کے لیے موت بھی ہے زانوئے محبوب
کافر کے لیے زیست بھی اندیشۂ جاں ہے!

مومن کا جہاں وحدتِ افکار و عزائم
کافر کا جہاں کشمکشِ قوتِ اضداد

کافر کو بھروسا فقط اسبابِ جہاں پر
مومن کا سہارا فقط اللہ کی امداد

کافر کی سیاست میں ہے تخریب کا جوہر
مومن کی صداقت پہ ہے تہذیب کی بنیاد

کافر کا خدا ڈھال، مسلماں کی خودی تیغ
کافر کا ہے منہ زرد، مسلماں کا ہے دل شاد

اے شہرِ وفا! اہلِ جفا ہیں تری زد پر
اے صیدِ بلا! اب پہنچ ترے دام میں صیاد

اے ملک! وہ جوہر ترے بیٹوں نے دکھائے
سب چیخ اٹھے قوتِ ایماں ہے خداداد

اے کارگہِ اہلِ جنوں! ضرب اک ایسی
صدیوں ترا دلِ جہاں جس کو رکھے یاد

## ''ناگہاں'' اور ''بے نہایت''

ستیہ پال آنند (یو۔ایس۔اے)

''ناگہاں'' اور ''بے نہایت'' سے اگر پیچھے ہٹو گی تو تمہیں معلوم ہوگا
''ناگہاں'' تو میں ہوں، لیکن کون تھا وہ ''بے نہایت''؟
کوئی پچھلا جس نے تجھ کو مجھ سے پہلے
تیری کچی عمر میں
یوں چیر کر زخمی کیا تھا۔۔۔ تو تڑپتی رہ گئی تھی، اور یہ کڑوا کسیلا زہر
سوتے جاگتے خوابوں میں امرت جان کر پیتی رہی ہے
کیوں بھلا؟ کیوں ''نور''، ''نغمے'' یا کسی ''حرفِ تسلی'' سے
ترا ''نارس خلا'' خالی رہا اتنے دنوں تک؟
اور اب پھر تو آج اگر اک ناگہانی حادثے میں
''ناگہاں'' سے آملی ہے اپنی پکی عمر میں تو یوں سمجھ
جیسے کہ کچی اور پکی، دونوں عمروں میں کوئی نسبت نہیں ہے
پوچھ خود سے
ایک چوتھائی صدی کے بعد پھر کیوں
جستجو ہے تجھ کو اس ظالم درندہ صفت کی، جس کو یہ کہہ کر
چھوڑ آئی تھی جھٹک کر، ''ایک وحشی جانور ہو بے نہایت!
تم سے نفرت ہے مجھے!''
''ناگہاں'' کیا ''بے نہایت'' کی طرح وحشی نہیں تھا؟
ہاں، مگر وہ جانور شاید نہیں تھا
(جانور، تم جانتی ہو، چیرتے ہیں، پھاڑتے ہیں!)
اس لیے اب تجربہ ہو اپنی پکی عمر میں دہرا کے خود
''حرفِ تسلی'' کا سہارا چاہتی ہو؟
خود سے پوچھو، کیا یہ سچائی نہیں ہے؟

## خواب ٹوٹ گیا

شہریار
(علی گڑھ، بھارت)

میں کہیں کھو گیا ہوں
رو رو کر
نیند میں جاگتے میں
مجھ کو یہ خوف کیوں ستاتا ہے
اس تصور سے ہول آتا ہے

رات پھر ایک شخص نے مجھ کو
بھیڑ کی نذر کر دیا اور میں
دیر تک دور تک بھٹکتا رہا
یہ تو کہیے کہ خواب ٹوٹ گیا

○

## غالبؔ سے فیض و فرازؔ تک

یونس صابر (پشاور)

ا احمد شاہ فرازؔ غزل کا مہکتا نام
ح حرفِ ہنر کی سوچتی موہنی سی دیوی
م من مندر میں اُس کی مالا جپتی ہے
د درد کا دارو پی کے پرائے غم سہتا
ف فارغؔ، خاطرؔ، محسنؔ کا ہمعصر کہ وہ
ر روپ روپ چہروں کا تھا جانِ جاناں
ا اُردو دُنیا نے LEGEND اُسے مانا
ز زرّیں عہد تھا اُس کا جواب ختم ہوا!!!

○

## ڈاکٹر عبدالقدیر خان

غالبؔ عرفانؔ (کراچی)

خوابِ مسلم کی نئی تعبیر کے سائنس داں
قوتِ اسلام کی توقیر کے روشن ضمیر
تا ابد جو زندہ رہتے ہیں انہیں کے رہنما
پاک ایٹم بم کے خالق ڈاکٹر عبدالقدیر

○

## بیادِ احمد فرازؔ..........نقاش کاظمی (کراچی)

مرے فرازؔ
مرے محترم۔مرے بھائی

اُداس کر گئے تم
میکدوں کی شاموں کو
ہمیں پلائے گا اب کون
وہ شرابِ سخن
کہ جس میں عدل کی میزان ہو
قلم کی طرح کہ جس کے نشے میں
انصاف کی ترازو ہو
مرے فرازؔ۔مرے محترم۔مرے بھائی۔
مرِی کتاب کسی تازہ گلبدن
کی طرح
مجھے یقین ہے
کہ خوابوں میں آ ملو گے کبھی
کہ اب تو خوابوں کی
تعبیر کا زمانہ ہے
کہ اب حصار ختم ہے
تمام دروازے
کہ آج سطوتِ شمشیر کے
تمام گھمنڈ
شکوہِ عزمِ قلم سے ہیں
لرزہ براندم۔
مرے فرازؔ۔مرے محترم۔مرے بھائی
کوئی کہے نہ کہے
اک زمانہ کہتا ہے
کہ تم نے جو بھی لکھا
وہ تپاکِ جاں سے لکھا
کہ جس میں لوح کماں کی
زبان تیر کی تھی۔
مرے فرازؔ
مرے محترم
مرے بھائی

# یادوں کے سائے

سرُور انبالوی (راولپنڈی)

آوارہ بگولے اُٹھے ہیں فریاد کی سانسیں رُکتی ہیں
یہ میٹھی میٹھی ویرانی اور یاد تمہاری یُوں آئی
پلکوں پہ سجائے بیٹھا ہوں مدھم سے دیئے کچھ اشکوں کے
دل جن کے سہارے زندہ ہے وہ صرف تمہاری یادیں ہیں
تُم آئے خانۂ ویراں میں یا اُترا ہے مہتاب کوئی
تم میرے دل کی آشا ہو، تُم میرے دل کی آبادی
جو آگ دبی تھی سینے میں اب اُس کو جلانے آئے ہو
صدیوں کے سُلگتے صحرا میں برفاب کی دیوی اُتری ہے
اُتری ہے فلک سے "حُور" کوئی اوڑھے ہوئے نُور کا دوشالا
اس سُندر سُندر مکھڑے پہ مہتاب کی قاشیں رکھی ہیں
آنکھوں میں حدیثِ بادہ ہے پلکوں پہ ہزاروں افسانے
پندار ہے سر پہ ہالہ کئے رعنائی جلو میں چلتی ہے
معصوم ادا کے جلووں سے ضوپا کے ستارے بکھرے ہیں
آکاش سے پریاں آ آ کر یُوں مانگ میں موتی جڑتی ہیں
بیداری خواب کے لاشے کو پہلو میں لئے سَر دُھنتی ہے
یوں "تیری" چاہت کے سپنے آنکھوں میں سمٹ کر روتے ہیں
قلاش زمانہ سے مانگے جو بھیک وہ پگلا کہلائے
کیا تم نے کبھی برساتوں میں نمناک نگاہیں دیکھی ہیں
ہستی کی فضائیں ٹوٹی ہیں، فطرت کی طبیعت ٹھیک نہیں

کونین کی نبضیں ساکت ہیں فطرت کی رگیں کچھ دُکھتی ہیں
آکاش کے منڈل میں جیسے باجے ہے درد کی شہنائی
آجاؤ کہ تم ہی باسی ہو اِن اُجڑے اُجڑے محلوں کے
کچھ غم کے سلگتے نالے ہیں دم توڑتی کچھ فریادیں ہیں
یہ سُندر سُندر دھوکہ ہے یا بیداری کا خواب کوئی
یا جیسے ویراں محلوں میں ہے قید کوئی شہزادی
یا مجھ کو میرے سپنوں کی تعبیر بتانے آئے ہو
پارے کے سمندر میں گویا مہتاب کی دیوی اُتری ہے
ماتھے پہ چاند کا ٹُکڑا ہے تاروں کی گلے میں ہے مالا
جذبات سے عاری ہونٹوں پہ فریاد کی لاشیں رکھی ہیں
تُم پاس کی بستی کے دیپک، تم اجنبی جانے پہچانے
زلفوں میں ہے چشمۂ آبِ بقا آنچل میں قیامت پلتی ہے
یا جانِ حیا کے دامن پہ تقدیس کے موتی بکھرے ہیں
جس طرح شکستہ آئینے پہ خورشید کی کرنیں پڑتی ہیں
نیند اپنے پاؤں کے تلووں سے بیٹھی ہوئی کانٹے چنتی ہے
جس طرح سے بیوہ کے ارماں مرقد سے لپٹ کر روتے ہیں
تنگ آ گئیں اونچے محلوں سے اور سر کو پکڑ کر رہ جائے
دم توڑتے ارماں دیکھے ہیں، ہنستی ہوئی آنکھیں دیکھی ہیں
اِن اونچے اونچے ایوانوں میں ہمدردی کی بھیک نہیں

ڈاکٹر یوگیندر بکل تشنہ

## کینیڈا کی زندگی

گھر سے باہر، دور تک کچھ بھی نہ تھا
کوئی ہمدم، کوئی محرم ہمنوا
کہنے، سننے، دیکھنے کو بھی خوب تر
خود سے جدا، ہر شخص ٹھہرا لگا
کر سکے اپنی بیاں نہ داستاں
جھانکنے کو دل میں میرے کون تھا!
شکوہ کیسا! دل کے کہنے میں آئے
شانِ مغرب، تنہا رہنا اچھا تھا
برف باری کے دنوں میں آدمی
اور بھی یاں تنہا و جامد دکھا
ہاں مگر، ترقی تھیں یاں زندگی
آدمی ہر صورت یہاں چلتا رہا
رشتۂ جسم و جاں قائم رہے
کام کرنا مجبوری و لازم رہا
خطۂ ہندو پاک سے پرے دوست،
دوستی کو ہر شخص ہے ترسا کیا

○

(امریکہ سے رخصت کے وقت بیٹے کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر)

تیری آنکھوں سے چھلکتے ہیں یہ آنسو کیسے!
تم اگر چاہتے، حالات نہ ہوتے ایسے!
شاید تم بھول گئے، یا کہ یوں سوچا نہ تھا،
ورنہ ممکن تھا کہاں، لوٹنا میرا ایسے
درد کی گرد لپیٹے ہوں میں پھرتا در در
تجھکو اندازا نہ تھا؟ بھٹکے گا تنہا ایسے
کٹتا ہے میرا سفر اسطرح شرقاً غرباً
مجھکو احباب نے ہے لوٹ کے چاہا ایسے
بھول چکا ہوں، جو بھی شکوے گلے تھے تجھکو
قسمت میں کاتبِ تقدیر نے لکھا ایسے
زندگی اب تجھے مڑ کے بھی دیکھوں کیونکر
لوٹ کر آتا نہیں یہ وقت گذشتہ ایسے
خوش رہو، زندگی اپنی جیو، میرا کیا!
زندگانی کا نشہ ٹوٹا تھا تشنہ ایسے
تیری آنکھوں سے چھلکتے ہیں یہ آنسو کیسے
تم اگر چاہتے، حالات نہ ہوتے ایسے

## دعا

امین راحت چغتائی (راولپنڈی)

یہ کیسی فضائیں ہیں
جن کے گل ولالہ سے اپنی ہی مہک آئے،
ہر سانس کی سوں سوں میں اپنی ہی صدا گونجے
رنگوں کے بھی منظر اپنے ہی نظر آئیں،
پھولوں کے تبسم میں اپنی ہی جھلک پائیں
اظہارِ محبت کے اطوار نرالے ہیں
وہ مجھ میں نظر آئے، میں اُس میں نظر آؤں

جب پیڑ ہواؤں سے سرگوشیاں کرتے ہیں
اور شاخ سے گدرائے پھل ٹوٹ کے گرتے ہیں
زرتا ور نکھرتی ہے دل ور پنپتے ہیں

جب صبح کے آنگن میں چنچل پرندوں کی
تہذیبِ سماعت سے روحوں میں اترتی ہے
تکبیر اذاں بن کر کتنی ہی جبینوں کو
توفیقِ اطاعت سے ضوریز بناتی ہے
کرتی ہے گلی کوچے معمور درودوں سے
محسوس یہ ہوتا ہے پھر کوئی دعا پہنچی
اور عرش کے پائے کو بھیگی ہوئی پلکوں سے
یوں چوم کے کہتی ہے:
اقرار ازل کا ہے، تسلیم ابد تک ہے
تو خالق و مالک ہے، سب ارض و سما تیرے
سب رنگوں سے افضل ہیں وہ رنگ جو تیرے ہیں
یہ میرے گل ولالہ خوش رنگ ترے دم سے
ان رنگوں کو قائم رکھ، ان رنگوں کو دائم رکھ
یہ رنگ سلامت ہیں تو میں بھی سلامت ہوں

## فرار تعاقب واپسی!

میں بھاگ آیا ہوں پیچھے چھوڑ کر
ایک شورِ محشر!
یہ ایک خاموش منظر، یہ بہتا سا سمندر!
میرے پیچھے اب بھی
ایک صدائے بے صدا اُن قرض خواہوں کی
یہاں کوئی نہیں ہے
مگر مجھ کو یقیں ہے
کہ میرے ساحلِ دریا پہ آنے سے
صدائیں کم نہیں ہونگی!
مگر پھر بھی میں بھاگ آیا ہوں
اپنے اُس مکاں سے
کرایہ جس کا پچھلے چھ مہینوں سے
پسینہ بہا تا رہا ہے جبینوں سے
میری بیوی کی اُس روشن جبیں سے،
ستارے توڑ لوں عرشِ بریں سے
پسینہ دودھ بن کر قطرہ ـــــ قطرہ ـــــ
وہ آیا دودھ والا! ایک خطرہ ـــــ
وہ ان خطرات کو ٹالے گی کب تک؟
اُس ایک معصوم بچے کو،
پلا کر خونِ دل، پالے گی کب تک؟
نا جانے کیوں مجھے لگتا ہے ایسا،
کہ جیسے پھر کرے گا تعاقب میرا،
یہاں بھی آن پہنچا ہے،
کرایہ مانگنے والا، کوئی بنیا
نظر دوڑا کے ہر سو،
جو دیکھا میں نے نیچے،
ریت پر میرے ہی قدموں کے نشاں تھے
بے گماں تھا!
جو مجھ سے کہہ رہے تھے
"چلو واپس چلو حامد،
وہی بنیا، کرایہ مانگنے والا
وہی منظر، وہی دفتر،
وہی محشر،
ایک ماتم اژدہا بن کر،
تمہارے منتظر ہیں!

حامد لطیف
(ممبئی بھارت)

## درد کو دباؤ

پرویز مظفر (برمنگھم)

چیخ نکلی
تو پکڑے جاؤ گے
آہ نکلی تو لوگ
شک کی نگاہ سے دیکھیں گے
ہمدردی بھری آنکھوں سے
نہ دیکھنا
دنیا کبھی کمزور ہے
اُسے جینے کا ہنر نہیں آتا
اب زخم کسے دکھائیں
دل کی بات کس کو بتائیں
اس لیے بس
درد کو چھپائے
کیکٹس پر پھول سجائے
چاہے دنیا
کتنا ہی بلائے
مت جانا اُدھر کو
بس درد کو دبائے
جیے جانا۔

O

## دوہے

### کاوش پرتاپگڑھی (دہلی بھارت)

چینٹی نے گجراج کو کیسے دیا پچھاڑ
اک ذرے کے سامنے چت ہو گیا پہاڑ

چمکار ہی کو جگت کہتا ہے پرنام
ہم کو تم کو کس لیے کوئی کرے سلام

آنکھوں میں طاقت کہاں دیکھیں اس کا روپ
اس کے اک اک روم سے پھوٹی ایسی دھوپ

ہاتھی گینڈے شیر کو لگا بہت آگھات
چینٹی کے گھر آ گئے بھولے شنکر رات

چندن بن کو کھا گئی دھو دھو کرتی آگ
ہرنی بھابھی کا ہوا جل کر راکھ سہاگ

اکثر وہ لٹتا رہا دن میں بار مبار
آخر دیہاتی رہا میرا شہری یار

گھر آئے مہمان کو کہتے ہیں بھگوان
اپنے اپنے بھاگ کا کریں سبھی جلپان

خوش فہمی تھی کس قدر اس سے ہیں انجان
ہم نکلے اس کی وقت چار سو بیس

مولا تک نے قدر کی ہم ہیں وہ انسان
اس کے گھر جب تک رہے رہے خاص مہمان

کاوش لکھ دن رات کو لکھ تو دن کو رات
وشے بنے کچھ بحث کا کہہ کچھ ایسی بات

## اگر تم بیچنا چاہو

### کرامت بخاری

(لاہور)

اگر بیچنا چاہو
ادائیں بھی وفائیں بھی
حسیں خوابوں کے رنگوں کی ردائیں بھی
یہ دنیا ہے یہاں آواز بکتی ہے
یہاں تصویر بکتی ہے
یہاں ہر حرف کی حرمت یہاں تحریر بکتی ہے
یہ بازار جہاں اک بیکراں گہرا سمندر ہے
یہاں پر کشتیاں ساحل پہ آ کر ڈوب جاتی ہیں
مسافر مر بھی جاتے ہیں مگر رونق نہیں جاتی
یہ انسانوں کا جنگل ہے
اور اس جنگل میں مقتل کا سماں ہر وقت رہتا ہے
اگر تم بیچنا چاہو ادائیں بھی وفائیں بھی
حسیں خوابوں کے رنگوں کی ردائیں بھی
مرے دل میں بھی اک بازار سجتا ہے
جہاں پر شام ہوتے ہی ہجوم یاس ہوتا ہے
غموں کی بھیڑ لگتی ہے
کئی یوسف سر بازار بکتے ہیں
اگر تم بیچنا چاہو۔

## ہائیکو

سیما پیروز (وہور)

دیپک سا جوتی ہے
جو آنکھ سے ٹپکا تھا
آنسو ہے کہ موتی ہے

چاندی کا کٹورا ہے
کیوں مان کرے اتنا
بس رنگ ہی گورا ہے

جگنو کہ شرارے ہیں
جو تم نے چرائے تھے
وہ خواب ہمارے ہیں

من چاہے گگن چھولوں
اب تم ہی کہو سجناں
میں کیسے تمہیں بھولوں

ٹہنی سے بکھری کلیاں
کیوں چھوڑ چلے ساجن
تم پیار کی یہ گلیاں

ہر بات نرالی ہے
چاہت بھری دنیا میں
میری جھولی خالی ہے

آکاش پہ تارے ہیں
اک عمر لڑے لیکن
پر زیست سے ہارے ہیں

راوی کا کنارا ہے
دل پیار کی دنیا میں
جیتا کبھی ہارا ہے

○

## اجنبی ہوائیں

(امریکا میں قیام کے دوران کہی گئی ایک نظم)

مہندر پرتاپ چاند (تلہار شہر بھارت)

دیارِ غیر ہے اور اجنبی ہوائیں ہیں
فضا میں گہری اداسی کا دل گداز دھواں
یہ کس مقام پہ لائی مری حیات مجھے
جہاں ہیں یوں تو ہزاروں نشاط کے ساماں
بپا ہیں پھر بھی مرے دل میں کرب کے طوفاں!

یہ روشنی کا سمندر' یہ ریل پیل' یہ شور
بہت ہی تیز ہے رفتار ہر بشر کی یہاں
رواں دواں ہیں یہاں لوگ جو اِدھر سے اُدھر
خبر نہیں یہ ہیں، کس کی تلاش میں گرداں
خدا ہی جانتا ہے اِن کی منزلیں ہیں کہاں!

یہاں کے لوگ یقیناً بہت مہذّب ہیں
اک ایک شخص یہاں ہے بہت سلیقہ شعار
بہت ہی خوب ہے اِن کی ادائے عجز و نیاز
بہت ہی نیک ہیں لوگوں کے اِس جگہ اطوار
بہت کمال یہاں ہر بشر کی ہے گفتار!

بجا یہ اِن کا سلیقہ' بجا یہ اِن کا شعار
مگر دلوں میں کہیں بھی یہاں وہ بات نہیں
نہ وہ خلوص' نہ وہ دوستی' نہ اپنا پن
یہ دن وہ دن نہیں' یہ رات بھی وہ رات نہیں
مرے وطن کی طرح کی یہ کائنات نہیں

پرائے دیس کی اِن اجنبی ہواؤں میں
عجب طرح کی مجھے ہو رہی ہے آج گھٹن
دیارِ غیر میں اے چاندؔ! جی نہیں لگتا
کوئی بھی رنگ ہو' اپنا وطن ہے اپنا وطن
کوئی بھی ڈھنگ ہو' اپنا وطن ہے اپنا وطن

○

## شہنشاہ

فیصل عظیم
(کناڈا)

ورق پلٹو اگر تاریخ کے تو
وہی اک داستاں صدیوں پرانی
نئے چہروں، نئے ناموں میں ڈھل کر
نئے جسموں، نئے کپڑوں میں لپٹی
نئی وحشت لہو کے رنگ و بارود کی بو
رقم کرتی ہوئی دیکھو گے شاید
عبارت میں نئی تاریخ ہو گی
جگہ بدلے گی اور کردار بھی بدلے سے ہوں گے
مگر غارت گری کا نام بدلو
تو بھی غارت گری، غارت گری ہے
کسی مغرور وحشی حکمراں سے وہ جڑی ہے
کسی طاقت کے زعم کے نشے میں چور آنکھوں سے
چھلکتی خواہشوں کے رقص میں پھر سے پڑی ہے
ہوس کے تنگ ہوتے دائروں میں پھر کھڑی ہے
مگر تاریخ لکھی جا رہی ہے
نئی ہے روشنائی اور قلم بھی
نئے کردار بھی، نقشِ قدم بھی
اور اُن کی زد پہ تم بھی اور ہم بھی
وہی ہے داستاں لیکن یہاں بھی
جو کل تاریخ کا حصہ بھی ہو گی
اسی تاریخ کا سایہ بھی ہو گی

○

## رباعیات

تحسین نوری
(کراچی)

تصویر مری، دل میں بنائے رکھنا
اس راز کو سینے میں چھپائے رکھنا
تعبیر کی امید لئے آنکھوں میں
خوابوں کے دریچوں کو سجائے رکھنا

کیا دل پہ گذرتی ہے سناؤں کیسے
دنیا کو تری بات بتاؤں کیسے
ہر سمت اندھیروں کی ہے یورش گھر میں
میں دیپ سرِ شام جلاؤں کیسے

اب قیس کی پاکیزہ روایت ہے کہاں
فرہاد جفاکش کی حکایت ہے کہاں
نیرنگیِ عالم ہے بس حرص و ہوس
اس دور میں معیارِ محبت ہے کہاں

رکھتے نہیں جو دل میں ادارت بچے
وہ ماں کی نہیں کرتے اطاعت بچے
کیا حشر ہو، اسکا یہ خدا ہی جانے
جو ماں کی نہیں کرتے ہیں عزت بچے

○

## کس کا چہرہ؟

بہرام طارق
(اسلام آباد)

کِس کا چہرا نور کی قندیل تھا؟
اک طرف زندہ اجالوں کی کوئی تصویر تھی
چاندی آنکھیں بھی جس کو دیکھ کر نم ہو گئیں
میٹھے خوابوں کی کئی بوندیں زمیں پر گر پڑیں
فکر کے ویران جنگل چاندنی میں سو گئے
سو گئی پھر قرب کی انمول ساعت
چاندنی کی گود میں

دور لیکن پھر کسی زنجیر کی جھنکار تھی
درد کے صحرا کی اُڑتی ریت تھی
دور وادی میں بچھا تھا
کاغذی چہروں کا شہر
اور اکیلے پن کا زہر
سوچ کی اندھی بھکارن رات بھر روتی رہی
کِس کا چہرہ نور کی قندیل تھا؟

O

## ''دسمبر!''

شگفتہ نازلی
(لاہور)

کہیں کیا تم کو ----
تم تو اجنبی بن کے ----
ہوئے جاتے ہو اب رخصت ----
کہا بھی کچھ تو کیا ہو گا ----
کہ وہ وقتِ وداع ہو گا ----
کہی بھی اَن کہی ہو گی ---- سُنی بھی اَن سُنی ہو گی ----
فقط بیتے لمحوں کے دھاگے میں پروئی یادوں کی جھلمل ----
عجب نمناک سی مُسکاں ہو جیسے ----
کہیں پیچھے کی جانب لے چلے گی ----
مگر کوئی سرا پائیں تو کیسے ----
تو پھر اگلے برس آؤ تو ڈھونڈیں ----
کوئی تو سلسلہ ہم پھر سے کھوجیں ----!

O

# تخلیقِ عصر

ماہرِ تصانیف کا تعارف
عطیہ سکندر علی (سکھر)

مسافت رائیگاں تھی

محترمہ شبنم شکیل اردو شاعری کا معتبر حوالہ اور طاقت ور شناخت کی حامل ایسی شاعرہ ہیں جنہیں ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے اردو شاعری کی آبرو اور نگہبانی کا فریضہ انجام دینا ہے۔ شبنم شکیل کا شعری شعور شیر خوارگی سے شروع ہو کر ایک ایسے پختہ مقام کو آن پہنچا ہے جہاں ان کی زبان اور قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ خوبصورت شعری پیرائن اختیار کر لیتا ہے۔ حال ہی میں سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور نے شبنم شکیل صاحبہ کی غزلوں کا مجموعہ ''مسافت رائیگاں تھی'' اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے جو ایک سو بارہ صفحات، اٹھاون غزلیں اور خالدہ حسین کے اکیس صفحات پر مشتمل پیش لفظ سے مزین ہے جس میں خالدہ حسین فرماتی ہیں۔ ''مسافت رائیگاں تھی'' شبنم کے ذہنی ارتقا میں ایک اہم سنگِ میل ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس میں گزشتہ دونوں مجموعوں کے خیالات اور تجربات کو دہرایا نہیں گیا۔ شبنم جو ایک پاکستانی عورت کی زندگی اور اس کے مسائل لے کر اپنے شعری سفر پر روانہ ہوئی تھیں کا زاویہ اِن مجموعہ میں صنفی سے آزاد نظر آ رہی ہے۔ اس کے ہاں ایک پختہ شعری شعور مرکزی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ وہ اپنے منفرد دھیمے لہجے میں آج کی دنیا میں کھیلے جانے والے منافقانہ تماشے کو بڑی دردمندی اور تعجب سے بیان کر رہی ہے۔

ہم تو گواہ ہیں کہ غلط تھا لکھا گیا
کیا فیصلہ ہوا تھا مگر کیا لکھا گیا

یہ کیسی منصفی تھی کہ منصف کے روبرو
جھوٹی شہادتوں کو بھی سچا لکھا گیا

مکتوبِ غم ہمارا پڑھا ہی نہیں گیا
ورنہ تو اس میں حال تھا سارا لکھا گیا

ملزم کو بھی تو ملتا ہے کچھ بولنے کا حق
پھر کیوں نہیں بیان ہمارا لکھا گیا

ہم چپ رہے کہ فیصلہ سارا تھا طے شدہ
یعنی جو مدعی نے لکھایا، لکھا گیا

یہاں اگر ہم اپنے عصر کی نہایت محترم شاعرہ پروین شاکر مرحومہ کی

شبنم صاحبہ کے بارے رائے کوٹ نہیں کریں گے تو ناانصافی کے مرتکب ہوں گے۔ ''شبنم کی شاعری کا سفر ایک خوشگوار سفر ہے۔ اس راستے میں جتنے شہر آئے ہیں ان کی آب و ہوا مختلف ہے۔ اس دنیا سے بھی جو ہم نے شبنم کی آنکھوں سے پہلے پہل دیکھی اور اس دنیا سے بھی جو کہیں اس عہد کے دوسرے حرف سازوں کے یہاں نظر آتی ہے۔ اب سورج کی کرن شبنم سے گلے مل رہی ہے اور شبنم کے قاری جانتے ہیں کہ اس کی شاعری میں روشنی کہاں سے آ رہی ہے۔ یہ شبنم کے اندر کی روشنی ہے۔ یہ شاعری کی وہ منزل ہے جب تخلیق کار کے ہاتھ میں اُن کی کلائی آ جاتا ہے۔''

سنگِ میل لاہور کی دیگر کتب کی مانند شبنم شکیل کی تازہ کتاب ''مسافت رائیگاں تھی'' بھی دیدہ زیب اور دلکش پیراہن سے ملبوس ہے اور قیمت فقط ایک سو پچھتر روپے مقرر کی گئی ہے۔

دامنِ گل

وقت کی تیز رفتاری نے صاحبِ دل اور صاحبِ ذوق حضرات کو جس قدر زک پہنچائی ہے شاید ہی اور طرح کے لوگوں کو اس کا سامنا ہوا ہو۔ جو لوگ جسم و جاں کی برقراری کے ساتھ دل، دماغ اور روح کی آبیاری کے آرزومند ہونے کے ساتھ وقت کے منہ زور گھوڑے سے نبرد آزما بھی ان کی مجبوری ہوا کرتی ہے باوجود کوشش اور خواہش کے علمی اور ادبی تڑپ کو اسی طور پورا نہیں کر سکتے جس طور ان کی خواہش ہوا کرتی ہے۔ ایسے علم دوست خواتین و حضرات کے لئے ہمارے عصر کے نہایت اہم اور منفرد اسلوب کے حامل شاعر جناب قاسم کاظمی نے سہولت کا اہتمام اس طرح کر دیا ہے کہ وہ کم از کم قاسم کاظمی صاحب کی نسبت کم وقت اور کم محنت سے زیادہ لطف اور زیادہ بالیدگی حاصل کر سکتے ہیں۔ قاسم کاظمی صاحب نے اپنے تین مطبوعہ شعری مجموعوں کی منتخب غزلیں دامنِ گل کے عنوان سے ترتیب دے کر زیورِ طبع سے آراستہ کر دی ہیں۔ قاسم کاظمی صاحب نے کفایت اور نفاست سے کام لیتے ہوئے صرف اکیاون منتخب غزلوں کو اس مجموعے میں شامل کیا ہے جن میں سے چند ایک کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا ضروری ہے۔

ٹوٹا ہے آج ہر جو اِس آن بان سے
ہے کا گِل لہو بھی ترے آسمان سے

جو سانحے ہیں دل کے انہیں آشکار کر دو
کبھی شرمسار ہو تو کبھی شرمسار کر دو

قربت جاں سے کبھی آہ وفغاں سے گزرا
آدمی وہ ہے کہ جو برق تپاں سے گزرا

ملا کر لاؤ خواب لئے گھر نہیں گیا
لیکن ترے خیال سے باہر نہیں گیا

اپنی بخشش وہ جو ما زور ادا چاہتا ہے
اور سرکار سے بس میری سزا چاہتا ہے

اُٹھا ہے جب تم آگ اُچھالنے کے لئے
ہمارے خوں سے گھروں کو اُجالنے کے لئے

یہ کیسا اُس نے عذاب آشنا اُتارا دن
گزر گیا شبِ ہجراں کی طرح سارا دن

میر، غالب اور فیض کے کلام سے مزین یہ خوبصورت مجموعہ ایک سو بارہ مجلد صفحات پر مشتمل ہے اور فقط ایک سو پچاس روپے کے عوض ویلکم بک اردو بازار کراچی پر دستیاب ہے۔

**ایک تھی ملکہ**

''نیلم احمد بشیر اپنے کام میں خوب منجھ گئی ہیں۔ رواں لکھتی ہیں اور خوب لکھتی ہیں۔ زبان و بیان ان سے دغا نہیں کر پاتے۔ یہ امر وہ بخوبی جانتی ہیں کہ کہانی کو بہرحال کہانی ہونا چاہیے۔ سکّے کہانی میں جو بھی درپیش ہوں مگر ریڑھ کی ہڈی تو کہانی ہے اور نیلم کی کہانیوں میں ریڑھ کی ہڈی بہت مضبوط ہے''۔۔۔۔انتظار حسین

ہم جس ماحول اور معاشرے میں بستے ہیں وہاں صنفِ نازک کا اپنی حیثیت اور مقام منوانا اور منوانا جس قدر دشوار ہے اس سے ہم اور آپ بخوبی آگاہ و باخبر ہیں۔ چہ جائیکہ عورت ہو اور کہانی کار بھی تو جان لیجیے اس کا مستقل آشیانہ و آستانہ کھیں کا تھا ہی ہو سکتا ہے لیکی مکھیوں کا تھا جن کے کاٹے کا علاج حکیم لقمان کے پاس ہو تو ہو کم از کم آج کے کسی حبیب و طبیب کے پاس تو دستیاب ہرگز نہیں۔ اس تمہید کے بیان کا مطلب اور مقصد فقط یہ ہے کہ ہم جب بھی صنفِ نازک کی کوئی تخلیق دیکھیں اور پڑھیں تو اُسے صرف جز کے طور پر ہی جانچیں اور پرکھیں۔ یہ امر ہمارے پیشِ نظر ضرور ہونا چاہیے کیا ہم ذہنی طور پر اس قدر بالغ ہو چکے ہیں کہ اپنی ہم صنف کو اُس قدر آزادی دے سکیں جس قدر ایک تخلیق کار کا حق بنتا ہے۔ شاید ہمیں بطور انسان بھی اُسے اُس کا صحیح، درست اور واجب حق دینے میں بھی ابھی وقت پیش ہے اور یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم اس رویے اور سوچ کی قید سے کب رہائی حاصل کر پائیں گے کبھی کر سکیں گے کہ نہیں۔

''ایک تھی ملکہ'' نیلم احمد بشیر کی چوبیس تازہ کہانیوں کا ایسا مجموعہ ہے جس میں مصنفہ نے اپنی بساط سے بڑھ کر ہم سے اپنا حق چھیننے کی کوشش کی ہے۔ ہم میں اگر ہمت ہے، حوصلہ ہے، برداشت ہے تو ہمیں ان کہانیوں کے مطالعے کے بعد یہ ضرور سوچنا اور غور کرنا چاہیے کہ ایک تن تنہا کمزور و ناتواں عورت اگر اس قدر گھٹن اور حبس کے عالم میں نعرۂ حق بلند کر سکتی ہے تو آزاد ہوا اور فضا میں اُس کے قلم کی اُٹھان اور اُڑان کیا ہوگی۔ ''ایک تھی ملکہ'' دو سو چالیس صفحات مجلد اور چوبیس رنگا رنگ کہانیوں کی امین ہے جس کی قیمت تین سو پچاس روپے اور دستیابی سنگِ میل لاہور سے ممکن ہے۔

**ترانہ**

''ترانہ'' علمی اور فکری اعتبار سے باقاعدہ صنف کی حیثیت رکھتا ہے لیکن جس طرح رباعی کی تخلیق بہ اعتبار ارکان و آہنگ وقت طلب ہے اسی طرح ترانہ بھی رباعی کے اوزان سے مکمل آگہی کے بغیر خلق کیا جانا ممکن نہیں ہے اس کے باوجود بعض رواں دواں اوزانِ رباعی میں قادر الکلام شعرا بآسانی اس کی تخلیق کر سکتے ہیں۔ کوثر صدیقی صاحب نے بڑے عزم سے اسے صنفِ سخن کہا ہے

تسلیم کریں یا نہ کریں اہلِ فن
اوزانِ رباعی میں ''ترانہ'' کوثر
ہیں تین مصارع میں اک صنفِ سخن

مجھے پورا یقین ہے کہ اردو شاعری میں ترانہ ایک اہم اضافے کی صورت میں قبول کیا جائے گا اور اس نئی صنف پر مشتمل کوثر صدیقی کے مجموعے ''پہچان'' کو ہر ادبی حلقے میں عزت و قار کی نظر سے دیکھا جائے گا''۔۔۔ڈاکٹر اسلم حنیف

لیجیے صاحب! آپ نے جناب کوثر صدیقی کی ایجاد و طبع کی بابت ڈاکٹر اسلم حنیف صاحب کی قیمتی رائے اور خوش اُمیدی تو ملاحظہ فرمالی اب ذرا کوثر صدیقی صاحب کی جدت طرازی کے چند نمونہ جات بھی ملاحظہ فرمالیجیے تاکہ اردو ادب کی اس نئی صنفِ سخن ''ترانہ'' کی بابت صحت مند رائے قائم کرنے میں آسانی ہو سکے

ہے باعثِ تسکین دل و جاں ترا نام
روشن ہے ترے ذکر سے دل کی قندیل
کرتا ہوں تیرے نام میں اپنی ہر شام

ظلمت سے نبرد آزما ہونے کے لیے
آ نقش نگاریں کریں پاسے اپنے
رکھ جا مری دہلیز پہ کچھ جلتے دیے

جلتے کہ اُجالوں کا نیا باب لکھیں
وہ تیل نہ ملے جس سے اُجالوں کو جلا
بجھتے ہوئے معصوم دیوں میں بھر دیں

اردو ادب کی نئی صنفِ سخن ''ترانہ'' ایک سو اٹھائیس صفحات مجلد اور دیدہ زیب سرورق سے مزین فقط ایک صد روپے ہندوستانی کے عوض زیب ملا ''79-A'' گوری بھوپال، بھارت سے دستیاب ہے۔

**خواب، ہوا اور خوشبو**

خواب سے منظر تک کی دنیا کو دریافت کرنے کا عمل جمیل الرحمٰن کے شعری مزاج کی کلید ہے۔۔۔۔۔منزہ مریم سید

جمیل الرحمٰن نظم میں غزل کا سا لطفِ سخن پیدا کرنے کی استطاعت رکھتا ہے ــــــ بہار احمد

جمیل الرحمٰن کی ہر نظم اپنے فکر و احساس کا جہان لئے ہوئے ہے وہ فکر آشنا ہے اور سچی کی ایک دنیا ہمارے سامنے لاتی ہے ــــــ ندیم ہاشمی

جمیل الرحمٰن نے اپنی شاعری کے توسط سے وہ سب کچھ دکھا دیا ہے جو بیشتر شاعر جیتے جی نہیں دیکھ سکتے ــــــ احمد بخش

جمیل الرحمٰن کی نظموں میں احساس اور شعور کی رو کے ساتھ فکری حوالے بھی آمیز ہو گئے ہیں ــــــ محمد حمید شاہد

جمیل الرحمٰن عصرِ حاضر کے ایک بالغ نظر اور لفظ و بیان کو خوب صورت لڑی میں پرونے والے شاعر ہیں ــــــ سید معراج جامی

جمیل الرحمٰن اپنے موضوعات اور اسلوب کی مدد سے قاری اور نقاد کو چونکانے کی صلاحیت رکھتا ہے ــــــ احمد جاوید

جمیل الرحمٰن کا مشاہدۂ فطرت بڑا گہرا ہے اور وہ اس کے اظہار پر مکمل قدرت رکھتے ہیں ــــــ رومانہ رومی

جمیل الرحمٰن کی نظمیں ہمیں ایک تخلیقی بہاؤ کی کیفیت سے ہم کنار کرتی ہیں ــــــ سیمیں کرن

جمیل الرحمٰن کے ہاں خوابوں کے رنگ زندگی کے اتنے قریب ہیں کہ ان پر حقیقت بھی رشک کرنے لگتی ہے ــــــ ڈاکٹر نثار ترابی

جمیل الرحمٰن نے اپنے تجربات مروجہ اسلوب میں بیان کئے ہیں مگر ان کی نظموں میں افسردگی کا شائبہ تک نہیں ــــــ احمد صغیر صدیقی

قارئین کرام آپ نے جدید اردو نظم کی معتبر آواز جمیل الرحمٰن کی بابت کس قدر معتبر اور بھرپور آرا ملاحظہ فرمائیں کیوں نہ آپ کو ان سے ہمکلام کرایا جائے۔

اک شخص آتا رہا:

جب زخم خبر دیں موسم کی
جب پھول کھلیں
جب برف گرے
جب درد ہوا کے ساتھ چلے
اک خاک نشیں درویش مگر
اوقات صدائیں دینے لگے
بے طلب دعائیں دینے لگے
لرزاں ہاتھوں کی دستک پر
اک شخص آتا رہا
تم اپنے دریچے سے باہر
خالی گلدان گرا دینا

آدھے سچ کی پوری بات:

سب خوابوں کے بہلاوے تھے
اک خواہش کے پچھتاوے تھے
کس نے بلایا کون گیا تھا
عشق میں کس نے سچ بولا تھا
وقت پہ اس کا فیصلہ چھوڑو
کس نے دو دن اپنی کی
کس نے دل کی مانی تھی
دونوں اپنے اپنے گھر خوش
ساری بات کہانی تھی

بلاوے:

شامِ گناہ سے لے کر
صبحِ عبادت تک
میرے شہر کی دیواروں سے
خوشبوئیں اٹھتی ہیں
سارے رستے
اک ان جانے گھر کی دوری سے
بھر جاتے ہیں
یادوں کی دلآویز پتنگ بکھر جاتے ہیں
بوجھل سانسیں تنگ فضائیں
اندر کھلتی ہیں
خالی گھر کی سونی چھت سے
تیری صدائیں آتی ہیں

ادا جب قافی سے واجب پیپرز کرتے ہوئے کتاب اور صاحب کتاب سے آپ کا تعارف آپ کے شوق کا امتحان ہے جس میں صدقِ صد نمبر حاصل کرنے کے لیے اکادمی بازیافت، کمرہ 17، گلی نمبر 3 کتاب مارکیٹ اردو بازار کراچی سے رابطہ کیجئے جہاں جدید اردو نظم کا یہ تروتازہ گلدستہ فقط تین صد روپوں کے عوض آپ کی توجہ کا طالب ہے

مستند ورا مسترد ہے گا:

نہ اہلِ دل کو سزا اور نہ اہلِ کفر کو دار
عجب طرح کے لوگوں کے درمیاں ہوں میں

اور بھی قرض ہیں تحریر کے اے صاحبِ علم
ایک فقط تذکرۂ عشق نہ تحریر میں رکھ

تو بے قرار تجھے حق ہے تصرف پہ مرے

میں کہ تیغ آزری تو مجھ کو بھی جاگیر میں رکھ

ڈبویا اتنا کہ بیراک کر دیا مجھ کو
یہ دشمنی تو مجھے خوب سازگار ہوئی

"آدمی کو ہمی کی ذہین اور حساس نسیم سید کی شاعری پوری کوشش کا مطالعہ کرتی ہیں۔ میں اُن کے گہرے مشاہدے، دل چھو لینے والا زیباں اور ان کی جرأت پر بارہا اور پھر پور داد دینے کے باوجود وہ حق ادا نہ کر سکا جو میرا فرض تھا"۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر شان الحق حقی

رشتۂ ضرورت:

تم سے میرا رشتہ کیا
بس یہ بات ہے جاناں
میں تمہاری عادت ہوں
رشتۂ ضرورت ہوں
کس قدر سلیقے سے
میرے گہرے کش لے کے
راکھ اپنی چٹکی سے
میری جھاڑ دیتے ہو
کس طریقے سے
چھوٹے چھوٹے مرغولے
کر کے میری سانسوں کے
مجھ کو پھونک دیتے ہو
کس قدر محبت سے
مجھ کو آخری کش تک
پی کے ۔۔۔۔۔۔ پھینک دیتے ہو

"نسیم سید کے مزاج اور تخلیقی خود پذیری نے نظم کے معاملے میں اس کی دسترس کو قابل رشک حد تک منفرد بنا دیا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے نسیم سید کی نظموں کی طرح میں بھی نظمیں لکھوں مگر یہ سب ایسا آسان کب ہے۔ میری نارسائی اور نسیم سید کی دسترس نے ہی اُسے نظم لکھنے والوں میں ایک نمایاں مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں وہ گزرتے وقت کے ساتھ حسین سے حسین تر نظر آتی ہے"۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم

قطعہ:

لہجے میں وقتوں کی شائل مجبوری ہو جائے گی
دھیمی دھیمی سی رشتوں کی کستوری ہو جائے گی
آتے جاتے رہا کرو ورنہ رستے کھو جائیں گے
ملتے جلتے رہا کرو ورنہ دوری ہو جائے گی

"نسیم سید جدید دنیا میں سانس لینے کے باوجود اپنی مٹی کی مہک اور اس کی فضاؤں کے لمس کے لیے بیتاب رہتی ہیں۔ کینیڈا "سمبل" کا ملک ہے جس کی بہاروں میں بھی دیوالی ہوتی ہے لیکن نسیم سید کو اپنے دیس کا "نیم" بہت یاد آتا ہے۔ نسیم سید دو دنیاؤں کی شہری ہیں۔ یہ دنیا ئیں آپس میں گھل مل جاتی ہیں اور اگر ملتی ہیں تو ایسی شاعری میں جیسی نسیم سید نے کی ہے"۔۔۔۔۔۔ پروفیسر سحر انصاری
دستیابی: اکادمی بازیافت، کمرہ نمبر 17، گلی نمبر 3، کتاب مارکیٹ اردو بازار کراچی۔ قیمت: پاکستانی تین سو روپے، بیرون ملک پچیس ڈالر۔

بام اندیشہ:

"امین راحت چغتائی کی غزل کے دو دھارے ہیں۔ ایک حیاتی اور دوسرا کائناتی۔ پہلے دھارے کا مشاہدہ "بہتے بھنور" میں ہو چکا۔ "بام اندیشہ" محو غور و فکر ہے۔ اس کی غزل غم کائنات سے مملو ہے جو آنکھیں کھول کر گرد و پیش کو دیکھنے پر اکساتی ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ امین راحت چغتائی کا رنگ جدا گانہ قدرانہ ہے۔ سادگی و پرکاری، ایمائیت و اجمال اور جذبے کی سچائی، اس کی غزل کی چند خصوصیات ہیں۔ وطب و لہجے کے اعتبار سے "بادہ زن باعرفی ہنگامہ خیز" کا تمنائی ہے۔ اس کی شاعری فعال اور رجائی ہے۔ وہ حالیات کا بھی ایک معروضی نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ غم کائنات دراصل شعورِ زندگی کا دوسرا نام ہے اور چغتائی کی غزل اس لحاظ سے محبت ماضی، حال کے اضطراب اور مستقبل کے امکانات کی امین ہے۔ شاعر زندگی کو ایک متحرک حقیقت سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں حسن و عشق کا تذکرہ بھی ایک وسیع اخلاقی قوت کے طور پر آیا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے شعری بصیرت بھی کہہ سکتے ہیں"۔۔۔۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری

اردو ادب میں باقدریں جس قدر کاوشیں نقش کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں اس کے پس منظر میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کے مندرجہ بالا رشحات قلم جناب امین راحت چغتائی کی شخصیت و فن کو چار چاند لگا سکتے ہیں مگر اردو ادب کے طالب علم کے لیے کسی نئی جہت یا زاویے کو اجاگر نہیں کرتے کیونکہ جناب امین راحت چغتائی اردو ادب میں اس مقام کے حامل اور حقدار ہیں جو صیقوں والوں کو ملا کرتا ہے جس کا اظہار کس قدر خوبصورتی سے جناب امین راحت چغتائی خود فرما رہے ہیں۔

راحتؔ اپنی بات ہی کچھ اور تھی
گو ہمارے بعد بھی آئے بہت

مختصر مگر جامع الفاظ میں جناب راحت امین چغتائی کی تازہ ترین کاوش "بام اندیشہ" سے آپ کا تعارف اس بات کا متقاضی ہے کہ آپ جس قدر جلد ممکن ہو اپنے عصر کے پختہ کار اور نادر احساسات و خیالات کے حامل شاعر سے روبرو ہو جائیے۔ "بام اندیشہ" تین سو اڑسٹھ صفحات روشن طباعت اور دیدہ زیب مجلد سرورق کے ساتھ فقط چار سو روپے میں گورنمنٹ پبلی کیشنز، ۲۵۸، اسٹریٹ ۱، علامہ اقبال ٹاؤن، گلریز فیز ۵، راولپنڈی سے دستیاب ہے۔

# رس و رابطے

جناب گلزار جاوید صاحب، تسلیمات

چہارسو کا ستمبر اکتوبر کا شمارہ مل گیا تھا، جس میں آپ نے میرے بارے میں خصوصی گوشہ شامل کیا ہے آپ نے جس طریقے سے میری عزت افزائی کی ہے اس کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ راولپنڈی میری جنم بھومی ہے اس لئے اس شہر سے چھپنے والے مجلّے کا میرے بارے میں لکھنا مجھے بہت اچھا لگا۔ یوں بھی چہارسو اپنے بلند معیار کے سبب اردو مجلّوں میں ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ خاص شمارے کی تیاری کے سلسلے میں ہمارے درمیان جو ای میل کا سلسلہ قائم ہوا، اس سے مجھے آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوا۔ میں آپ کو افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اب پتا چلا کہ آپ بلند پایہ مدیر بھی ہیں۔

منیر الدین احمد (جرمنی)

جناب گلزار جاوید! تسلیمات۔

پہلی بار آپ کا مؤقر جریدہ کھنگالنے کا موقع مل رہا تھا سو اشتیاق سے پڑھا۔ اس شمارے کی سب سے اچھی بات تو جناب منیر الدین احمد کا گوشہ ہے منیر صاحب بڑا ابھرتے رفتار کے ادیب ہیں۔ شہرت یافتہ سکالر ہیں۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اکادمی ادبیات نے ایک بین الاقوامی ادبی کانفرنس برپا کی تھی میں بھی اس میں شریک تھا۔ یہیں میری ملاقات منیر سے ہوئی تھی۔ میرے واقف کار اور دوست بہت کم تعداد میں ہیں اور پہلی ملاقات میں تو دوستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن یہاں قسمت بازی لے گئی کانفرنس کے دوران ہی یعنی دو تین دنوں ہی میں میری اور منیر کی گاڑھی چھننے لگی۔ پھر خط و کتابت بھی خاصی رہی۔ اب تقریباً دو تین سال سے اس میں تعطل ہے لیکن اُن کی ادبی سرگرمیوں کی اطلاع مسلسل ملتی رہتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں اُن کی خود نوشت کے چند حصے سویرا میں پڑھنے کو ملے تھے۔ اُن کی اب تک کی ادبی کاوش کا تو کیا جتنی ہے میں نے فن کے فن کے بارے میں کسی قدر جو اظہار کیا تھا وہ آپ نے اس خاص شمارے میں شامل کر دیا ہے اس کے لیے مزید کیا کہوں۔ بہر حال وہ بطور لکھاری مجھے پسند ہیں اور فن کا شخصی حوالہ بھی خاصہ محبت بھرا ہے۔ آپ نے اُن کا جو انٹرویو کیا ہے وہ خاصہ غیر روایتی اور منفرد ہے۔ مجھے بہت اچھا لگا۔ ایک مقام پر انہوں نے مجھے بھی quote کیا ہے۔ یہ ان کی کرپا ہے۔ چہارسو مجھے جنگلی پھولوں کا ایسا گلدستہ لگا کہ جس کی اپنی خوشبو اور اپنی مہک ہے۔

محمود احمد قاضی (گوجرانوالہ)

برادرِ محترم گلزار جاوید صاحب! سلام مسنون

تازہ شمارہ حسبِ سابق عمدہ اور خیال انگیز مندرجات سے مزین ہے آپ نے منیر الدین احمد صاحب کے لیے قرطاسِ اعزاز مختص کر کے اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ منیر الدین احمد نے ترجمے اور تخلیقی ادب میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں جس کا اعتراف خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔ گزشتہ شمارے میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی شخصیت اور فن کا احاطہ بھی بھرپور انداز

وقار جاوید (راولپنڈی)

میں کیا گیا تھا غرض اب تک آپ نے جتنے بھی خاص شمارے شائع کیے ہیں وہ سب اس قابل ہیں کہ انہیں محفوظ کیا جائے۔ مستقبل کے محققین کے لیے ان میں مستند اور مفید مواد موجود ہے۔ خاص کر آپ کے انٹرویو خاصے کی چیز ہوتے ہیں۔ جناب منیر الدین احمد کا انٹرویو ان کی شخصیت، فن، دلچسپیوں اور مشاغل کا تفصیلی تعارف کروا رہا ہے بلکہ عالمی اور اردو ادب سے متعلق ان کے فاضلانہ خیالات سے بھی کما حقہٗ آگاہی ہوتی ہے۔ منیر الدین احمد کا مضمون "فوزیہ" تو کمال کا ہے۔

ناصر عباس نیّر (لاہور)

گلزار بھائی! سلام و رحمت!

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ ملا۔ اس سے پہلے کہ آپ کا شکریہ ادا کروں یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ میری غزل کا مقطع درست یوں ہے

ذرا ملنا تو پھر تم پر کھلے گا ۔۔۔ بڑے گُنی ہیں یہ بیں خیائیں

مرا ادوالدِ مرحوم مقتا جالندھری ادبی پرچوں کی بھی ہو اس کی ترتیب و تہذیب مدیر کی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہوتی ہے ''چہارسو'' ماہنامہ ''نگار'' سے لے کر آج کے تازہ ترین رسالوں تک ہر اعتبار سے الگ نظر آتا ہے حالانکہ نظمیں، غزلیں، مضامین اور افسانوں کے ساتھ قارئین کے خطوط پر مشتمل یہ ایک ادبی دستاویز ہے مگر بات وہی ہے اس کے مدیر کی صلاحیتوں اور سطر سطر کی جس میں مدیر کا ذہنی حسن نمایاں ہے۔ موجودہ ''چہارسو'' کے مندرجات پسندیدہ ہیں۔ مجھے ان شعرا حضرات پر حیرت ہوتی ہے کہ جو ایک دوسرے کے ایک آدھ شعر کی تعریف کر کے مدیر کی صلاحیتوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ آپ بھی اس قسم کے خطوط کی ان سطور کو قلم زد کر دیا کریں۔ کیونکہ کسی بھی شاعر کی تعریف یا تذلیل رسالہ مرتب کرنے والے کے کھاتے میں جاتی ہے میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ گزشتہ پچاس برس سے کہیں ''نقوش و رسالے'' یہ کام کا انداز دیکھتا آ رہا ہوں جو کہ مدیر کی سرپرستی و تذلیل کے مترادف ہے۔

سید ضیا شبنمی (ملتان)

میرے گلزار! خوش رہو

چہارسو کا شمارہ جو میرے دوست ڈاکٹر خلیق انجم سے منسوب ہے میرے کینیڈا سے امریکہ پہنچنے کے بعد پہنچا۔ ویسے تو میں خلیق انجم صاحب کو پہلے سے بخوبی جانتا اور پہچانتا ہوں مگر ان کا مضمون (خاکہ) ''استاد رسا دہلوی'' پڑھ کر جی خوش ہو گیا۔ اپنی طوالت کے باوجود آخری سطر تک دلچسپ اور کہن سوہ لینے والی دلّی کی یاد گار باتیں پڑھ کر لطف آ گیا۔ خاص طور سے اُن کا مکرر استاد کے پاس جانا ''انہیں ملنا اور استاد کا یہ کہنا 'میرے بھتیجے نے قسم کھا کر کہا ہے کہ اس نے میری تعریف کی ہے وہ میرے سر کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا''۔ اور استاد کا یہ شعر

میں نے جو چھیڑیں ہوں زلفیں آپ کی
آپ کے سر کی قسم، دستِ صبا بھی میں نہ تھا

ماننا پڑتا ہے کہ پہلے وقتوں کے لوگ کتنے معصوم طبع، سچے، صاف گو اور سادہ ہوا کرتے تھے۔ اب تو ایسے لوگ عنقا ہو گئے ہیں۔ اس خاص شمارے کے تمام مضامین اور ڈاکٹر صاحب سے آپ کا کیا ہوا انٹرویو پڑھ کر لطف اندوز بھی ہوتا رہا اور بار بار یہی سوچتا رہا کہ آپ نے ڈاکٹر خلیق انجم جیسے مشکل آدمی کو کس طرح منایا اور پکڑا ہوگا۔ وہ آسانی سے قابو آنے والوں میں نہیں ہیں۔ مگر یہ بعد ضروری گل تھا جو آج اپنے آپ میں انجمن ہیں۔ اس کارنیک کے لیے میری جانب سے ڈھیروں مبارکباد۔

یوگیندر بہل تشنہ (امریکہ)

برادرم محترم گلزار جاوید صاحب، مزاج گرامی

یوں تو ڈاکٹر منیر الدین احمد سے منسوب شمارہ اپنے اندر بے پناہ علمی ادبی خزانے لیے ہوئے ہے جسے پڑھ کر لطف بھی لے رہا ہوں اور بہت سی نئی باتوں سے باخبر ہو رہا ہوں مگر شمارہ جولائی اگست کا ذکر بھی لازمی ہے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بعد بھارت میں جن احباب نے اردو کو زندہ رکھا اور اس کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی ان میں سرِفہرست ڈاکٹر خلیق انجم کا نام آتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے نام قرطاسِ اعزاز منسوب کر کے آپ نے "حق دار را بحق رسید" کے مصداق بڑا کارنامہ سر انجام دیا ہے یہ ان کا حق بنتا تھا۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی کہنا یہی پڑتا ہے کہ "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"۔ اللہ ان کو عمرِ طویل عطا فرمائے اور وہ اسی طرح اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت سر انجام دیتے رہیں۔

سرور انبالوی (راولپنڈی)

برادرم گلزار صاحب، السلام علیکم

چہار سو ادبی معلومات کا شاہکار ہے۔ اس میں آپ کی محنت کو بڑا دخل حاصل ہے۔ اتنا دلکش اور دیدہ زیب ادبی پرچہ اشتہارات کا محتاج نہیں ہونا چاہیے لیکن چہار سو اشتہارات سے خالی ہے۔ بڑے بڑے لوگ چہار سو کے قارئین اور لکھاریوں کی صف میں نظر آتے ہیں۔ ان کی توجہ اس جانب کیوں نہیں جاتی کیا وہ لوگ نہیں جانتے کہ بغیر مالی تعاون کے ادبی پرچہ نکالنا کس قدر دشوار ہے۔ خدا معلوم آپ کس کینڈے کے آدمی ہیں جو ادب اور ادیب کی محبت میں اتنا بوجھ اٹھائے چلے جا رہے ہیں۔ آپ کی یہ محنت ہرگز رائیگاں نہ جائے گی۔ آنے والے وقتوں میں چہار سو اپنے وقت کے نمائندہ شعر و ادب اور شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا کہلائے گا۔

اُفق دہلوی (لاہور)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم

"چہار سو" کا تازہ شمارہ ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۹ء نظر نواز ہوا۔ اس بار قرطاسِ اعزاز معروف افسانہ نگار اور دانشور منیر الدین احمد کے نام ہے۔ جناب سرور انبالوی نے ڈاکٹر منیر الدین احمد کے حوالے سے خوب نظم کہی ہے۔

"رُوبرو راست" میں آپ کے جرأت مندانہ سوالات اور منیر الدین احمد کے تفصیلی اور غیر جانب داری سے بولڈ جوابات پڑھ کر مزا آ گیا۔ ادب کی ایک باغی صنف "نثری نظم" کے متعلق پہلی بار پڑھا۔ اس صنف (اگر اسے صنف کہا جائے تو) کو مستعمل اصطلاح میں ضرب المثل، قول زریں یا مقولہ کہا جاتا ہے یہی سنا اور پڑھا ہے۔ بہر حال ایک ایک جملے میں پتے کی باتیں ملتی ہیں۔ سچی سے بڑی ایک ایک جملے میں زندگی کے تجربہ کا نچوڑ ہے۔ جرمن نظموں کے تراجم منیر الدین احمد نے خوب کیے ہیں۔ خصوصاً "شعور"، "مستقبل" اور "پرواز" وغیرہ نظمیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام خطوط نے متاثر کن ہیں۔ خطوط نے کالم آتے ہی محسن بھوپالی صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ پروفیسر سمیع اللہ قریشی صاحب کی تحریر "مولوی یحییٰ فضلی عرف ڈاکٹر منیر الدین احمد" یاد نگاری کی عمدہ مثال ہے بہت سلیقے سے اپنی یادوں کو تازہ کیا ہے۔ "انسانی نفسیات کی تفہیم" میں پروفیسر فتح محمد ملک نے منیر الدین احمد صاحب کے افسانوں کا مجموعی تاثر پیش کیا ہے اور انہیں انسانی نفسیات اور انسانی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والا افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے ان کے ایک پرانے افسانے "سوشلسٹس ایک فتح" سے لے کر "مستعدی کی موت" تک کو نفسیات اور تاریخ کی تفہیم کے افسانے قرار دیا ہے۔ انتظار حسین صاحب کی تحریر "ایک باغی کی داستان" بھی متاثر کن ہے۔ تحریر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محترم انتظار حسین کو ان کی خودنوشت "ڈھلتے سائے" پسند نہیں آئی۔ انتظار حسین صاحب نے منیر الدین احمد پر کتاب کے حوالے سے ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ "انہیں ان کی مذہبی ترجیحات کو جاننے میں کچھ ایسی دلچسپی نہیں ہوتی یہ چیز عام طور پر محققوں اور نقادوں پر چھوڑ دی جاتی ہے۔"

یہ اعتراض بے جا ہے۔ خودنوشت میں پڑھنے والے خودنوشت نگار کی زندگی کے پوشیدہ خانوں اور رازوں کو جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ پھر محققین اور نقادانِ ادب کو لوازمہ کہاں سے ملے گا۔ "مالک رام مرحوم کا مذہب" منیر الدین احمد صاحب کا مضمون تحقیقی نوعیت کا ہے۔ مضمون سے مالک رام کی مذہب کی تبدیلی کے حوالے سے شکوک تو دور ہو جاتے ہیں مگر اس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں کہ مالک رام کی شخصیت میں حوصلے اور استقامت کی کمی تھی۔ اس لیے اعلان نہیں کیا۔ قادیانی مسلک اختیار کرنے کی وجہ ذاتی مفاد بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی مصلحت پسندی ظاہر ہے قادیانی پاکستان میں غیر مسلم ہیں اب اس بحث کا کچھ حاصل نہیں۔

نعیم احمد بشیر کا ڈرامہ "قصہ کہانی کا" متاثر کن ہے مگر اختتام تک ڈرامہ نہیں آیا کچھ ادھورا ادھورا سا محسوس ہوا۔ "تجدیدِ ہنر" میں شامل غزلوں میں سہیل غازی پوری، بہرام طارق، سخی سرمستی، اطہر عزیز، صابر عظیم آبادی اور حنیف ساجد اور عرش صہبائی اور کرامت بخاری کی چھوٹی بحور کی غزلوں نے خوب مزا دیا۔ "نقشِ کفِ پا" میں شبنم رومانی، شہریار، محمود شام اور مامون ایمن

کی غزلیں متاثر کن ہیں۔ نظموں میں محمود شام کی "لاؤس میں آخری پہر" انور سدید کی "درد" اور مشکور حسین یاد کی نظم "کب تک ہم" منفرد ہیں۔ قیصر تمکین کی "تو" اور علی محمد فرشی کی "نیند میں چلتی موت" مختلف ذائقے کی ہیں۔ "گرداب" منصور الٰہی شیخ کا افسانہ کم مختصر اور طویل زیادہ محسوس ہوا۔ کہانی میں بے جا جزئیات نے حسن متاثر کیا ہے۔ سنجیدہ ٹکڑوں کو اگر پورا اتار دیا جائے تو پھر بھی کہانی پر کوئی فرق نہیں پڑے گا اختتام بھی واضح ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم کا افسانہ "نقش بر سنگ" ایک اچھا افسانہ بنتے بنتے رہ گیا۔ وقار بن الٰہی کا افسانہ "قربانی" کیا یہ افسانہ ہے؟ یہ تحریر ذرا اکتا دینے والی لگی، کم درجے کا رپورتاژ محسوس ہوتی ہے۔ نند کشور وکرم کی کہانی "قاعدہ" اثر انگیز ہے۔ مختصر کہانی میں کس خوبی سے مشرق و مغرب کے ایک جرم کی جھلک دکھائی ہے اور ہندوستان کے ڈاکوؤں کی اصول پرستی، مجبوری اور پولیس کی ڈیلنگ کو مہارت سے پیش کیا ہے۔ آپ کا افسانہ "جبری مشقت" کی تعریف "چہار سو" میں مناسب نہیں۔ میں نے پہلے بھی ایک بار لکھا تھا کہ آپ مختصر افسانے میں جس مہارت اور سلیقے سے جزئیات پیش کرتے ہیں وہ کسی اور افسانہ نگار میں نظر نہیں آتی۔ "تخلیق عصر" میں عطیہ سکندر علی نے کتابوں کا تعارف بہتر انداز میں کروایا ہے۔ اب انہیں تنقیدی مضامین لکھنا چاہیے۔

**نوید سروش (میر پور خاص)**

محترمی و مکرمی گلزار جاوید صاحب! سلام و رحمت!

چہار سو کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ ڈاکٹر منیر الدین احمد کے نام قرطاس اعزاز چہار سو کی قائم کردہ خوش کن روایات کا تسلسل ہے۔ ان کے حوالے سے مشمولہ تحریریں اور ان کی اپنی نگارشات بالخصوص براہ راست کے تحت ان کا انٹرویو نہایت معلومات افزا ہے۔ افسانوں کے حصے میں جوگندر پال "اکل کھرا"، ڈاکٹر فیروز عالم، نند کشور وکرم اور گلزار جاوید کی تخلیقات ایک نئے جہان دانش کے دریچے وا کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ بیشتر غزلیات اور منظومات قابل مطالعہ ہیں تاہم چند تخلیقات قابل اصلاح ہیں۔ تھوڑی سی توجہ سے فنی کوتاہیوں سے اجتناب کیا جا سکتا تھا۔ بحیثیت مجموعی یہ شمارہ بھی آپ کی کامیاب ادارت کا عمدہ نمونہ ہے۔

**پروفیسر غفور شاہ قاسم (لاہور)**

گرامی قدر گلزار جاوید صاحب! سلام و دعا۔

"چہار سو" ملا تو جیسے ایک روشنی اور مہک چہار سو پھیل گئی جو کئی دن تک اپنا احساس دلاتی رہی۔ اس خلعت خاص پر میں آپ کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔ "چہار سو" پڑھنے کا اشتیاق اس قدر بڑھا کہ میں نے اپنے ادارے سے دو یوم کی رخصت لی اور دیگر معمول کی سرگرمیوں کو ترک کر کے اس خوبصورت اور مکمل ادبی جریدے کو پڑھا۔ برصغیر پاک و ہند کے معروف لکھاریوں اور دیگر ممالک میں مقیم "آشنائے اردو" کی تخلیقات سے سجا یہ ادبی پرچہ ایک ایسے گلدستے کی طرح جس کے ہر پھول سے ایک مختلف قسم کی خوشبو اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ "براہ راست" کے عنوان تلے ڈاکٹر منیر الدین احمد صاحب سے انٹرویو آپ کے اعلیٰ ادارتی اور صحافتی اوصاف کا آئینہ دار ہے۔ یہ طویل انٹرویو ہم ایسے ادبی طالبعلموں کے لیے بے حد مفید اور معلوماتی ہے۔ یہ سلسلہ بہت پسند آیا۔ نثری تحریروں میں مضامین اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں جن میں علم و ادب کی چاشنی اور مٹھاس ہے۔ افسانے آپ کے حسن انتخاب کا شاہکار اور افسانہ نگاروں کی شبانہ روز محنت کا نچوڑ ثمر دار ہیں۔ کلاسک ڈرامہ قصہ کہانی کا واقعی ڈرامہ ہے اور خوب ہے۔ غزلوں اور نظموں کا حصہ بھی خاصا جاندار اور بڑے نام اور بڑی تخلیقات سے مزین ہے۔

**تصور اقبال (پنڈی گھیب)**

محترم گلزار جاوید صاحب آداب و نیاز۔

آپ نے چہار سو کے تازہ شمارے سے نوازا جس کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔ چہار سو میں بڑے نام ہی نہیں بلکہ بڑی تخلیقات بھی شامل ہیں جن میں مدیر کے حسن ترتیب نے مزید کشش پیدا کر دی ہے جس سے چہار سو کے انوکھے پن کا احساس اجاگر ہو گیا ہے۔ چہار سو ہر اعتبار سے اردو ادب کا صحت مند آئینہ دار ہے۔

**عرش صہبائی (جموں کشمیر)**

محترم گلزار جاوید صاحب آداب و سلام

اس بار کے پرچے میں ڈاکٹر منیر الدین احمد کا "زخمی سر لا" اور "لافانی عشق" پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ "لافانی عشق" افسانہ ہو یا واقعی آپ بیتی ہو، دونوں صورتوں میں خوب ہے اور شاید اس لئے بھی کہ یہ آپ بیتی سی معلوم ہوتا ہے۔ بعض اوقات لوگ ایسی تحریروں پر اعتراض کرتے اور انہیں افسانہ ماننے سے انکار کرتے ہیں، صرف اس لئے کہ انہیں اس کے اہم کرداروں کے حقیقی اور کہانی کے کسی حد تک سچ ہونے کا پتا دیا جاتا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں کیونکہ آپ کسی کردار کا نام ہے بھی جانتے ہوں تو بھی کیا؟ افسانہ تو افسانہ ہے۔ یہ پچاس سال بعد کے قاری کے لیے ہرگز آپ بیتی یا رپورتاژ وغیرہ نہیں ہوگا جب تک مصنف خود یہ دعویٰ نہ کرے سو یہ آپ بیتی کر کے چھپائیں لئے افسانہ پڑھ کر مزہ آیا۔ منصور الٰہی شیخ کے افسانے "گرداب" کی کہانی مختلف لگی۔ حمیر نوری کی غزل کے بعض اشعار عہد حاضر کی تصویر ہیں۔ ستیہ پال آنند صاحب کی "لندن کا پل کب گرتا ہے" بروقت ہے اور ساری دنیا کی نظریں اس پل پر لگی ہوئی ہیں۔ صبا اکرام کی "بنیاد" اور قیصر تمکین کی "تو" اچھی نظمیں ہیں جبکہ جگموہن داس اعجاز کے دوہے موضوع سے ہٹ کر اس لئے بھی مزہ دیتے ہیں کہ خالص دوہے کی بحر میں ہوتے ہیں اور دوہے کا صحیح مزہ تو اسی میں ہوتا ہے۔

**فیصل عظیم (کینیڈا)**